ماہنامہ "اُردو ڈائجسٹ"، "حکایت"، "سیارہ": تقابلی مطالعہ
(ادبِ عالیہ، مقبول عام افسانوی ادب، پلپ فکشن کے حوالے سے)

مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)

مقالہ نگار:

نادیہ حفیظ

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

ستمبر ۲۰۲۲ء

ماہنامہ "اُردو ڈائجسٹ"، "حکایت"، "سیارہ": تقابلی مطالعہ
(ادبِ عالیہ، مقبولِ عام افسانوی ادب، پلپ فکشن کے حوالے سے)

مقالہ نگار:

نادیہ حفیظ

یہ مقالہ

پی ایچ ڈی (اُردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا۔

فیکلٹی آف لینگویجز

(اُردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

ستمبر ۲۰۲۲ء

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے مذکورہ مقالہ پڑھنے کے بعد مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان : **ماہنامہ "اُردو ڈائجسٹ"، "حکایت"، "سیارہ": تقابلی مطالعہ (ادبِ عالیہ، مقبول عام افسانوی ادب، پلپ فکشن کے حوالے سے)**

مقالہ نگار : نادیہ حفیظ

رجسٹریشن نمبر : 760/PhD/URD-F18

ڈاکٹر آف فلاسفی

شعبہ اُردو زبان و ادب

ڈاکٹر بشریٰ پروین : _____

نگران مقالہ

ڈاکٹر جمیل اصغر جامی : _____

(ڈین فیکلٹی آف لینگویجز)

میجر جنرل شاہد محمود کیانی، : _____

ہلال امتیاز ملٹری (ر)

(ریکٹر)

تاریخ : _____

اقرارنامہ

میں، نادیہ حفیظ حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کے پی ایچ ڈی سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر بشریٰ پروین کی نگرانی میں کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گی۔

_____

نادیہ حفیظ

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

فہرست ابواب

عنوان		صفحہ نمبر
مقالہ اور دفاع کی منظوری کا فارم		i
اقرار نامہ		ii
فہرست ابواب		iii
Abstract		vi
اظہار تشکر		vii
باب اوّل:	**موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث**	**۱**
الف۔	**تمہید**	**۱**
i	موضوع کا تعارف	۱
ii	بیان مسئلہ	۲
iii	مقاصد تحقیق	۲
iv	تحقیقی سوالات	۳
v	نظری دائرہ کار	۳
vi	تحقیقی طریقہ کار	۴
vii	مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق	۴
viii	تحدید	۴
ix	پس منظری مطالعہ	۵
x	تحقیق کی اہمیت	۵
ب۔	**ادبِ عالیہ: بنیادی مباحث**	**۲۰**
ج۔	**مقبول عام افسانوی ادب**	**۲۴**
د۔	**پلپ فکشن**	**۳۲**

☆ حوالہ جات ۴۷

باب دوم: ماہنامہ ''اُردو ڈائجسٹ''، ''حکایت'' اور ''سیارہ ڈائجسٹ'' میں ادب عالیہ مقبول عام افسانوی ادب اور پلپ فکشن کے فکری رجحانات کا تقابل ۵۰

فکری رجحان ۵۰

تقابل ۵۱

i افسانہ ۵۲

ii ناول ۸۶

☆ حوالہ جات ۱۰۵

باب سوم: ماہنامہ ''اُردو ڈائجسٹ''، ''حکایت'' اور ''سیارہ ڈائجسٹ'' میں ادب عالیہ، مقبول عام افسانوی ادب اور پلپ فکشن کے فنی رجحانات کا تقابل ۱۰۸

فنی رجحان ۱۰۸

i افسانہ ۱۱۲

ii ناول ۱۵۳

☆ حوالہ جات ۱۹۴

باب چہارم: ماہنامہ ''اُردو ڈائجسٹ''، ''حکایت'' اور ''سیارہ ڈائجسٹ'' میں شائع ہونے والی دیگر تحریروں کا تقابلی مطالعہ ۱۹۷

i آپ بیتی ۱۹۷

ii شاعری ۲۱۰

iii جگ بیتی ۲۱۵

iv انٹرویوز ۲۲۶

v ناقابل فراموش واقعات ۲۳۵

☆ حوالہ جات ۲۴۶

باب پنجم: مجموعی جائزہ، نتائج وسفارشات ۲۵۰

الف۔ مجموعی جائزہ ۲۵۰

ب۔ نتائج ۲۵۵

ج۔ سفارشات ۲۶۰

☆ کتابیات ۲۶۱

☆ ضمیمہ جات ۲۶۷

ABSTRACT

Monthly "Urdu Digest", "Hikayat", "Siyara": Comparative study (with regard to literature, popular fiction, pulp fiction).

The paper under review is about a comparative study of the monthly Urdu Digest, Hakkait, Sayara. This is an important topic in which literature, popular general fiction, and pulp fiction are elaborated because digests are the focus of attention for new writers and digests publish texts according to the mood of the readership in society. An attempt has been made to bring the fictions and novels published in these literary digests to the public in a better way. The researcher has tried to compare the writings included in the current digests by intellectually analyzing them. These digests are also important and have the status of literary digests because the writings included in them are of famous writers of Urdu literature. The researcher read them carefully and expressed concern about them. The stories included in them are influential and the digests have added a little to their quality by including them. These digests are paving the way for new writers. He embellished his digests with the writings of many famous writers related to literature, including Ashfaq Ahmed, Ahmed Nadeem Qasmi, Khadija Mastoor, Intizar Hussain, Hijab Imtiaz Ali Taj, etc. The stories of Razia Butt, Neelam Ahmed Bashir were also given space by these digests, many more names are included besides them. The researcher realizes how hard these literary digests have worked to improve the quality of their digests. An analytical study has also been done in this paper after intellectual review. The researcher also made a comparison after making intellectual and technical evaluation and tried to check which digests have better maintained their quality with the aim of inculcating literary taste in the reader through their writings. The researcher has also studied and compared other different genres included in these digests, including poetry, unforgettable events, Jag Beti, Aap Beti, interviews. The researcher has tried to find similarities and differences between these digests by doing a comparative analysis of the texts included in them. After studying all these writings, their process in obtaining these digests helped the researcher to highlight the importance of digests. Digests and literary magazines represent the people of the society, just as literary works lead to change in the thinking of the readers, so the digest is undoubtedly the best effort. The researcher has tried to bring out many new aspects on this subject.

اظہارِ تشکر

سب سے پہلے میں اللہ تعالیٰ کی شکر گزار ہوں کہ جس نے اپنی خاص عنایتوں سے مجھے یہ توفیق بخشی کہ میں اپنا پی ایچ ڈی اردو کا مقالہ حصولِ سند کے لیے نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کے شعبہ اُردو میں پیش کر سکی۔

اس کی تکمیل میں آنے والی تمام مشکلات کو یکسر بھول کر اظہارِ تشکر اور مسرت کے لمحات میں ایک روحانی سکون محسوس کر رہی ہوں۔ اگر کوئی مجھ سے یہ سوال کرے کہ ایسا کیوں ہے؟ تو اس کا مختصر جواب صرف یہ ہے کہ ایک غیر معمولی کام اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور توفیق سے ممکن ہو کر مکمل ہو گیا ہے۔

اس کی مختصر روداد کچھ یوں ہے کہ اب تک ایم فل یا پی ایچ ڈی کی سطح پر رسائل کے حوالے سے کیے گئے کام کو مقالوں کی صورت میں دیکھا جائے تو وہ صرف کسی ایک رسالہ پر کام کر کے اس کی خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے، لیکن مجھے جو کام تفویض کیا گیا، اس میں تین ڈائجسٹ، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ، ماہنامہ حکایت اور ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ: تقابلی مطالعہ (ادب عالیہ، مقبول عام، افسانوی ادب، پلپ فکشن) کے حوالے سے فکری و فنی جائزہ پیش کرنے کا کام سونپا گیا۔ دوسرے یہ کہ اس کام کا دورانیہ ۲۰۱۷ء تا ۲۰۱۹ء تین سال کے شماروں پر محیط تھا۔ جب میں نے اس کام کے آغاز کا ارادہ کیا تو کچھ کٹھن مرحلے آئے لیکن کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہیں۔ اُس نے میرے لیے اسباب پیدا فرمائے اور مجھے وہ فہم عطا کی کہ میں نے ماہرین اساتذہ اور دوست احباب کے مشورے سے اللہ تعالیٰ کا نام لے کر کام کا آغاز کر دیا۔

اس مقالے کی تکمیل یقیناً میرے لیے مشکل تھی۔ مگر اس کے مکمل ہونے میں جن پس پردہ برگزیدہ ہستیوں کی دعائیں ہیں، نہ تو میں ان کا اس طرح سے شکریہ ادا کر سکتی ہوں، جیسا کہ ان کا حق ہے اور نہ ان کی وفاؤں کا میرے پاس کوئی ایسا صلہ ہے، جو میں ان کو پیش کر سکوں۔ بس ان کے لیے خلوصِ دل سے دعا گزار ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس کا اجرِ عظیم عطا فرمائے، انہیں صحت مند و سلامت رکھے اور دنیا میں کسی کا محتاج نہ کرے اور غیب سے ہمیشہ ان کی حاجت روائی فرمائے۔ آمین

اس کے علاوہ چند نام جو میرے دل و دماغ پر نقش ہیں، ان کا تذکرہ نہایت ضروری سمجھتی ہوں۔ ان میں سب سے پہلے میرے پیارے دادا ابوّ، والدین جو دن رات میری کامیابی کے لیے ہمیشہ دعا گو اور کوشاں رہتے ہیں۔ پھر میرے اہلِ خانہ جن میں میری بڑی بہن سعدیہ حفیظ، ناصر بھائی، چھوٹی بہن عائشہ حفیظ، بھائی

حسیب حفیظ، بلال حفیظ، میرے اساتذہ کرام جن میں میری نگران مقالہ ڈاکٹر بشریٰ پروین، پروفیسر ڈاکٹر فوزیہ اسلم، صدر شعبہ اردو، ڈاکٹر نعیم مظہر، ڈاکٹر شفیق انجم، ڈاکٹر نادیہ اشرف اور اپنی تمام کلاس فیلوز جن میں خاص طور پر میری دوست، ندا عباسی، زینت امان، فوزیہ انار اور دیگر تمام اُن ساتھیوں کی شکر گزار ہوں جن کے نام اس تحریر میں شامل ہونے سے رہ گئے ہیں، جنھوں نے مجھے مقالہ تحریر کرنے کی ترغیب اور تحریک دی، مشورے دیے اور میرا حوصلہ بلند کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام خواتین و حضرات کا حامی و ناصر ہو۔ آمین

نادیہ حفیظ

اسکالر پی ایچ ڈی (اُردو)

باب اوّل:

موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف۔ تمہید

ا۔ موضوع کا تعارف

ڈائجسٹ کے لغوی معنی ایک سے زیادہ کے ہیں لیکن جن معنوں میں یہ تحریر کے ساتھ جڑا ہوا ہے اس کا مطلب انفارمیشن آف کمپائلیشن یا تحریری مواد کی تلخیص ہے۔ ڈائجسٹ کا رواج سب سے پہلے یورپ میں بیسویں صدی کی اولین دہائیوں میں پڑا تھا۔ سب سے اہم "The English and Empire Digest" تھا جو ۱۹۱۹ء میں چھپنا شروع ہوا تھا۔ اس کے بعد ریڈرز ڈائجسٹ پہلا ڈائجسٹ ہے جو شاید ادب سے براہ راست یا بلاواسطہ جڑا ہوا پہلا ڈائجسٹ تھا۔ یہ ۱۹۲۳ء میں امریکہ کے شہر نیویارک سے پہلی بار شائع کیا گیا تھا یہ ڈائجسٹ اکیسویں صدی کی پہلی دہائی تک امریکہ میں Best Selling Consumer Magzine کے طور پر جانا جاتا رہا۔

قیام پاکستان کے بعد سب سے پہلا ڈائجسٹ "پاکستان ڈائجسٹ" کے نام سے نکلا جو مالی مشکلات اور پذیرائی نہ ہونے کے باعث نہ چل سکا اور ۱۹۴۸ء کے آغاز میں ہی بند ہو گیا۔ لگ بھگ دس سال کے وقفے کے بعد ۱۹۵۷ء میں ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ کے نام سے لاہور سے یہ ڈائجسٹ نکلنا شروع ہوا لیکن یہ ڈائجسٹ اپنی اشاعت کے تین سال بعد ۱۹۶۰ء میں لوگوں کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکا اور پاکستان کے پہلے کامیاب اور واحد ڈائجسٹ کی شکل اختیار کی۔ اس کے بعد دیگر ڈائجسٹ بھی سامنے آئے جس میں "سیارہ"، ادبی رسالہ "انشا"، "حکایت"، "سب رنگ"، "خواتین ڈائجسٹ" وغیرہ شامل ہیں اور پاکستان میں ڈائجسٹوں کی تعداد ۲۰۰ تک جا پہنچی۔ اکیسویں صدی کے شروع میں ان کی تعداد میں کمی آنا شروع ہو گئی اور وہی ڈائجسٹ اپنی پہچان بنانے میں کامیاب رہ سکے جن کے پیچھے مضبوط ہاتھ تھے۔ ان کا مرکزی ٹارگٹ پاکستان کی خواتین تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ خواتین کے لیے نکلنے والے ڈائجسٹ سب سے زیادہ پاپولر ہیں۔ ۲۰۱۰ء کے بعد ڈائجسٹوں کے چھاپنے کے رجحان میں تیزی سے اضافہ ہوا جن میں ماہنامہ "کرن"،

"شعاع"،"پاکیزہ"،"سلام عرض"،"جواب عرض"اور"حنا"وغیرہ شامل ہیں۔ اس پس منظر میں "اُردوڈائجسٹ"، "حکایت"اور"سیارہ"میں چھپنے والی تحریریں جن میں ادبِ عالیہ(ہائر لٹریچر)، مقبول عام افسانوی ادب(پاپولر فکشن)،پلپ فکشن کو شامل کیا جاتا ہے۔ مقبول عام ادب کا اسلوب ہمیشہ عوام کی مانگ کی طرف ہوتا ہے اور اس کی پیش کش کا انداز ادب عالیہ سے منفرد ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ادب عالیہ کی حقیقت پسندی جداگانہ ہو سکتی ہے۔ ان دونوں کا مقصد سچائی کی تلاش کا عمل ہوتا ہے۔ پلپ فکشن کو غیر معیاری ادب تصور کیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے ان ڈائجسٹوں میں شامل ایسی تحریروں کا مطالعہ کر کے ان کا تقابل کرنا ایک اہم اور دلچسپ موضوع بن گیا ہے۔

مسئلہ کا بیان

اُردو صحافت اور اُردو ڈائجسٹوں کا آغاز کیسے ہوا؟ اس پس منظر میں ڈائجسٹوں کی اشاعت کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی اور وہ مقاصد جن کے حصول کے لیے ڈائجسٹوں کا اجرا کیا گیا وہ کہاں تک حاصل ہو سکے۔ ڈائجسٹوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کس طرح عوام میں مقبول ہیں۔ مجوزہ تحقیقی موضوع میں "اُردوڈائجسٹ"، "حکایت"اور"سیارہ" کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ ان کا تقابل کرنا اور ان میں ادب عالیہ، مقبول عام افسانوی ادب اور پلپ فکشن جیسی تحریروں کا مطالعہ شامل ہے۔

مقاصد تحقیق

۱۔ ادب عالیہ، مقبول عام افسانوی ادب اور پلپ فکشن کا دائرہ کار اور خصوصیات کو واضح کرنا۔

۲۔ "اُردوڈائجسٹ"، "حکایت"اور"سیارہ ڈائجسٹ "میں شائع ہونے والی تحریروں کا تقابل کرنا۔

۳۔ "اُردوڈائجسٹ"، "حکایت"اور"سیارہ ڈائجسٹ"میں شائع ہونے والی تحریروں کے مزاج و معیار کا تعین کرنا۔

تحقیقی سوالات

۱۔ ادب عالیہ، مقبول عام افسانوی ادب اور پلپ فکشن کے مباحث و امتیازات کیا ہیں؟

۲۔ "اُردو ڈائجسٹ"، "حکایت" اور "سیارہ ڈائجسٹ" میں ادب عالیہ، مقبول عام افسانوی ادب اور پلپ فکشن کے فنی فکری رجحانات کے اشتراکات و افتراکات کیا ہیں؟

۳۔ "اُردو ڈائجسٹ"، "حکایت" اور "سیارہ ڈائجسٹ" میں شائع ہونے والی تحریروں کا مزاج و معیار کیا ہے؟

نظری دائرہ کار

اردو زبان و ادب کے فروغ میں ادبی رسائل نے ہمیشہ اہم اور بنیادی کردار ادا کیا ہے ان رسائل کی اہمیت موجودہ دور میں اور بھی بڑھ گئی ہے کیونکہ نئے تخلیق کار اپنی تخلیقات کو منظر عام پر لانے اور قارئین میں متعارف کروانے کے لیے ڈائجسٹوں کا سہارا لیتے ہیں اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہ ڈائجسٹ بیک وقت اہم معلومات فراہم کرتے ہیں۔ برصغیر میں ادبی رسائل نے مختلف اصناف کے فروغ میں بھرپور کردار ادا کیا اس حوالے سے ڈاکٹر انور سدید کہتے ہیں کہ ''برصغیر میں ادبی رسائل انیسویں صدی میں شائع ہونا شروع ہو گئے تھے جن میں "دہلی اردو اخبار" "فوائد الناظرین" سرسید کا "تہذیب الاخلاق" شامل تھا ان رسائل نے نہ صرف لوگوں کو ادب کی طرف مائل کیا بلکہ قوم کی ذہنی، فکری اور ادبی رہنمائی کا فریضہ بھی سر انجام دیا''۔ پاکستان میں ڈائجسٹوں کی روایت اگرچہ زیادہ پرانی نہیں ہے لیکن جس طرح سے ان کی مقبولیت میں اضافہ ہوا وہ بھی کسی تعریف کا محتاج نہیں۔

ویسے تو بہت سارے ڈائجسٹ اپنے طور پر قارئین کی پسند کو مد نظر رکھ کر مواد شائع کر رہے ہیں لیکن ایسے ڈائجسٹ کم ہیں جن میں ایسے نامور ادیبوں کی تحریریں شائع کی جا رہی ہیں جن کی تحریریں فنی و فکری لحاظ سے معیاری ہیں ان میں "اردو ڈائجسٹ" "حکایت" "سیارہ" ایسے ڈائجسٹ ہیں جنہوں نے ایسے ادیبوں کی تحریروں کو اپنی ڈائجسٹ میں جگہ دی جو ادب کے حوالے سے اپنی پہچان آپ رکھتے ہیں۔ ادب عالیہ اور مقبول عام افسانوی ادب جیسی تحریریں شامل کرنے کے ساتھ ساتھ یہ ڈائجسٹ دیگر متفرق تحاریر بھی شائع کرتے رہے جس سے قارئین کی دلچسپی میں اضافہ ہوا۔ بھارت سے ارتضیٰ کریم اور اظہار عثمانی نے "اردو میں پاپولر لٹریچر روایت اور اہمیت" شائع کی وہ کہتے ہیں ادب عالیہ زندگی کے تمام پہلوؤں کی عکاسی کرتا ہے اور مقبول عام افسانوی ادب ایسی کوئی بات یا ایسا عمل جو عام لوگوں کے لیے کیا جائے۔

دوسرے کئی ڈائجسٹوں میں ہر طرح کا ادب شائع ہو رہا ہے جس میں پلپ فکشن ایک نئی اصطلاح کے طور پر سامنے آیا ہے اس حوالے سے ڈاکٹر کامران علی اسدر Pulp fiction Pakistani domesticity میں کہتے ہیں یہ غیر معیاری ادب ہے یہ ادب اپنے اندر ہر طرح کے موضوعات کو سمیٹتا ہے جس میں رومان 'عمومی رویے' گروہی تصادم سنسنی خیز واقعات شامل ہیں گویا ڈائجسٹوں کی اہمیت سے انکار نہیں زیر نظر مقالے میں ماہنامہ "اردو ڈائجسٹ" "حکایت" "سیارہ" تقابلی مطالعہ (ادب عالیہ، مقبول عام افسانوی ادب، پلپ فکشن) کو موضوع بنایا گیا ہے اور ان پر تحقیق کی گئی ہے۔

تحقیقی طریقہ کار

تحقیق حقائق کی جانچ پڑتال اور تلاش و جستجو کا نام ہے زیر نظر مقالے میں موضوع سے متعلق بنیادی ماخذ "اردو ڈائجسٹ" "حکایت" اور "سیارہ" میں شامل تحریروں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ حصول مواد کے لیے سرکاری نجی اور جامعاتی کتب خانوں تک رسائی کو ممکن بنایا گیا اس کے ساتھ ساتھ تحقیقی مواد کو حاصل کرنے کے لیے انٹرنیٹ کے ذریعے مختلف ویب سائٹس سے بھی استفادہ کیا گیا اس کے لیے دستاویزی طریقہ کار اختیار کیا گیا ہے۔

مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق

مجوزہ موضوع پر کوئی واضح اور ٹھوس تحقیقی کام نہیں کیا گیا۔ البتہ پاکستان سے شائع ہونے والے کئی دوسرے رسائل و جرائد پر تحقیقی کام ہوا ہے جو کہ راقمہ کی نظر سے گزرا ہے اور اس سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ماہنامہ "اُردو ڈائجسٹ"، "حکایت" اور "سیارہ" ان تینوں ڈائجسٹوں کا تقابلی مطالعہ (ادب عالیہ، مقبول عام افسانوی ادب اور پلپ فکشن کے حوالے سے) پیش کیا گیا کام، ایک منفرد تحقیق ہے۔

تحدید

ماہنامہ "اُردو ڈائجسٹ"، "حکایت" اور "سیارہ" لوگوں میں مقبول ہیں اور لوگ ان کو شوق اور دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ اور اس مقالے میں (۲۰۱۹ء-۲۰۱۷ء) کے شماروں کو شامل کیا گیا ہے اور ان تینوں ڈائجسٹوں میں شامل تحریروں کا مطالعہ کر کے ان میں ادب عالیہ (ہائر لٹریچر) مقبول عام افسانوی ادب (پاپولر فکشن) ،پلپ فکشن جیسی تحریروں کا فنی و فکری حوالے سے تقابل کر کے ان کے مزاج و معیار کا تعین کیا گیا ہے۔

پس منظری مطالعہ

ماہنامہ "اُردوڈائجسٹ"، "حکایت" اور "سیارہ ڈائجسٹ" پاکستان میں اُردو زبان میں چھپنے والے معروف ڈائجسٹ ہیں۔ ان تینوں ڈائجسٹوں میں ادب عالیہ، مقبول عام افسانوی ادب اور پلپ فکشن جیسی تحریریں شائع ہوئی ہیں۔ ان کے تناظر میں ان کا تقابل کر کے ان کے مزاج و معیار کا تعین کیا گیا ہے۔

تحقیق کی اہمیت

ماہنامہ "اُردوڈائجسٹ"، "حکایت" اور "سیارہ ڈائجسٹ" ان تینوں ڈائجسٹوں نے اپنے موضوعات اور اسلوب کی بدولت عوام میں مقبولیت حاصل کی ہے۔ ضروری سمجھا گیا ہے کہ ان ڈائجسٹوں میں چھپنے والی تحریروں کا مطالعہ کر کے ان کا تقابل کر کے پیش کیا جائے۔

ادب کسی بھی معاشرے کی پہچان ہوتا ہے اور اس معاشرے میں منفی و مثبت قدروں کے پروان چڑھنے میں عام طور پر ادب کو ذمہ دار قرار دیا جا سکتا ہے۔ جتنا کسی معاشرے کا ادب بہتر ہو گا، اتنا ہی معاشرے میں مثبت قدریں پروان چڑھیں گی۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ ادب اور ادیب کا معاشرے کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ادب کی تعریف مختلف لغات میں مختلف انداز میں کی گئی ہے۔ اُردو تھیارس میں اس کی وضاحت کچھ اس طرح سے پیش کی گئی ہے:

> "خوش خلقی، اسم: خوش خلقی، ملنساری، خوش مزاجی، خوش اطواری، ادب آداب، نمستے، نمسکار، بندگی، پاس، لحاظ، سواگت، استقبال، خوش آمدید، پذیرائی، التفات، سلام، نیاز، چوما، خلق، خوش خلقی، رکھ رکھاؤ، تسلیمات، پیار، محبت، صبح بخیر، علیک سلیک، کورنش، ڈنڈوت، رکوع، سجدہ۔
>
> خوشامد، چاپلوسی، مصافحہ، مقانقہ، بغلگیری، بوسہ، سلامی، اقرار محبت، مروت، احترام، تکریم، تعظیم، تربیت، شائستگی، شستگی، خوش بیانی، آدمیت، شیریں کلامی، انکسار، تواضع، خوش آمدید، آؤ بھگت، عرض نیاز، رکھ رکھاؤ، پذیرائی، مروت، بغل گیری، راز و نیاز و داع، تعزیت، بسم اللہ، تکلفات رسمی، تسلیمات"۔[1]

اُردو زبان کی مسند لغت فرہنگ آصفیہ میں مولوی سید احمد دہلوی نے ادب کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

"مقبول۔ قبول کیا گیا۔ مانا گیا۔ منظور کیا گیا۔ پسند کیا گیا۔ مرغوب۔ پسندیدہ، من بھاتا۔ برگزیدہ۔ پیارا۔ بھگت۔ محبوب"۔[۲]

مقتدرہ قومی زبان کی جدید طرز پر تیار کی گئی مستند لغت میں ادب کی وضاحت مؤلف اشرف ندیم کچھ اس طرح سے پیش کرتے ہیں:

"ادب۔ تعظیم۔ عزت کرنا۔ تہذیب۔ شائستگی۔ ہمیں اپنے بزرگوں کا ادب کرنا چاہیے۔

لٹریچر۔ ادبیات۔ اقبال کا کلام اُردو ادب میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے"۔[۳]

ماہر لسانیات، نقاد، محقق، اُستاد اور بہت سی لغات کے مصنف ڈاکٹر رؤف پاریکھ نے بین الاقومی اہمیت کی حامل اوکسفرڈ اُردو انگریزی لغت میں ادب اور اس کی مقبولیت کی تشریح کرتے ہوئے جو تفصیل بیان کی ہے وہ یہ ہے:

"Adab. I decorum, civility, etiquette. 2. respectادب, regard, reverence. 3 literatureادب آداب.proper etiquette, good manners ادب برائے ادب .literature for literature's sakeادب برائے زندگی.literature for life's sake; literature as a true chronicle of life ادب پارہ .literary piece ادب عالیہ . classics; belles-lettersادب کرنا .show regard or respect, respect, behave politelyادب لحاظ.respect, regard[۴]".

(ب) ادب عالیہ: بنیادی مباحث

ادب عربی زبان کا لفظ ہے۔ انگریزی میں ادب کو لٹریچر کہا جاتا ہے۔ عربی زبان میں ادب کا مفہوم وہی نظر آتا ہے جو کہ انسان کے شریفانہ خصائل کو بیان کرتا دکھائی دیتا ہے۔ ادب چونکہ ایک مفرد لفظ ہے اور اس کی جمع آداب ہے۔ عام طور پر تنقیدی گفتگو میں یہ بتایا جاتا ہے ادب کی ترکیب اصل میں دو عناصر سے ہوتی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ادب کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"ادب ایک فنِ لطیف ہے جس کا موضوع زندگی ہے، اس کا مقصد اظہار و ترجمانی و تنقید ہے۔ اس کا سرچشمہ تحریک احساس ہے۔ اس کا معاون اظہارِ خیال اور قوت مخترعہ ہے اور اس کے خارجی روپ وہ حسین ہیئت اور وہ خوبصورت پیرایہ ہائے اظہار ہیں جو لفظوں کی مدد سے تحریک کی صورت اختیار کرتے ہیں۔

اس فن لطیف میں الفاظ مرکزی حیثیت رکھتے ہیں اور یہی چیز اس کو باقی فنون لطیفہ سے جُدا کرتی ہے ورنہ شدّتِ تاثر اور تخیل کی مصوّری اور تخلیق و اختراع کا عمل دوسرے فنون میں بھی ہے"۔ (۵)

ادب چونکہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے معنی میں مختلف تبدیلیاں واقع ہوتی گئیں۔ قدیم عربی میں ادب کا لفظ دعوت طعام کا مترادف تھا۔ پھر اس کے ارد گرد اختلافات نظر آنا شروع ہو گئے۔ ابتداء میں اسے تعلیم کے معانی میں استعمال کیا گیا۔ "فیروز اللغات" میں ادب کے معانی یہ ہیں:

"ہر چیز کی حد کو نگاہ رکھنا۔ ۲۔ حفظِ مراتب، لحاظ ۳۔ تہذیب۔ شائستگی۔ تمیز ۴۔ علم زبان جس میں نحو۔ لغت۔ عروض۔ انشاء۔ معانی اور بیان وغیرہ داخل ہیں۔ ۵۔ حیا۔ شرم۔ لاج۔ ۶۔ تعظیم و تکریم"۔ (۶)

اس تعریف سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اوّل زبان کی مہارت سے متعلق تمام موضوعات زبان میں پائی جانے والی ناگزیر تحریریں اور بالخصوص ہر چیز کی حد کو نگاہ میں رکھنا کے معنی رکھتا ہے۔ کسی بھی فنی تحریر یا مختلف موضوعات سے متعلق تمام تحریروں کے اجتماع کو ادب کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ ادب ایسی فنی تحریروں کا نام ہے جن میں خاص وقت کے لیے لوگوں اور موضوعات کو ادبی آہنگ میں ڈھال کر تحریر کی صورت میں لایا جاتا ہے۔ ادب کا مترادف علم کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ ادب کی اجمالی صورت سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ لکھی ہوئی ہر چیز ادب ہے یا اس کے زمرے میں آتی ہے۔ ایسی تمام معلومات جو کتابوں سے حاصل ہوتی ہیں وہ "ادب" ہے۔

ادب زندگی کے تمام پہلوؤں میں انسان کی رہنمائی کرتا ہے کیونکہ اس کے اظہار اور اس کی تخلیق سے انسان کو سکون محسوس ہوتا ہے دوسری طرف اس کے مطالعے سے قاری ذہنی سکون اور اطمینان محسوس کرتا ہے۔ اس لیے ادیب کو معاشرے کا نمائندہ کہا جاتا ہے۔ یہ بات انسان کے لیے مشکل اور مفلوک الحال کہ ادب کے اظہار سے اس کو تسکین محسوس ہوتی ہے۔ اگر ادب کو محدود کیا جائے گا تو زندگی خود بخود بہت ہوتی

چلی جائے گی۔ زندگی کی پر کٹھن راہیں اور نشیب و فراز ادب کے ذریعے ہی پار کیے جاسکتے ہیں۔ اگر ادب نہ ہو تو انسان اپنی زندگی میں تیزی سے بیزاری محسوس کرتا ہے۔ اس لیے ادب اور زندگی کا کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ادب کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک ادیب جو ادب کا اظہار کرتا ہے اور زندگی کے روشن اور تاریک دونوں پہلوؤں پر نظر رکھتا ہے۔ زندگی کی حقیقتوں کو جاننے کے بعد اس کے بارے میں آگاہی فراہم کرتا ہے۔ تب انسان ان مسائل کے حل کے لیے ہر ممکن کوشش کرتا۔ ادب زندگی کی سچائیوں کو ہمارے سامنے لاکر زندگی کو مسرت اور شادمانی فراہم کرتا ہے۔ وہ تمام تحریریں جو مطبوعہ شکل میں ہمارے سامنے آتی ہیں، ان سب کو ادب سے منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ ان میں رسائل، اخبارات اور روز مرہ خبریں ادب کے دائرہ کار کا احاطہ نہیں کرتیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ادب کی وضاحت اور شناخت کے لیے انسان کے ارتقائی تاریخی عوامل کو پیش کیا جاتا ہے۔ اگرچہ انسان نے ادب کو بڑی بڑی کتابوں تک محدود کر دیا ہے، لیکن موضوع سے ہٹ کر اگر ادبی منظر نامے کو دیکھا جائے تو ادب اس معیار کا نام ہے جس سے ہمیں اپنی زندگی کے روزمرہ مسائل اور مشکلات کو حل کرنے کے لیے واسطہ پڑتا ہے۔ ادب ان کا مناسب اور موضوع حل ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ ایسی شائع شدہ تحریریں جو مسائل اور ان کے حل کا پیکر ہوں گی ادب کے زمرے میں آئیں گی۔ ادب سے ہر قاری کا واسطہ نہیں پڑتا بلکہ اس کو سمجھنے اور سوچنے کے لیے ایک خاص طبقہ ہوتا ہے جو اس کی اہمیت سے بخوبی آگاہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے:

> "ادب ایک لطیف احساس ہے۔ جس کا موضوع زندگی ہے۔ اس کا مقصد اظہار اور ترجمانی و تنقید ہے، اس کا سرچشمہ تحریک کا احساس ہے۔ اس کا معاون اظہار خیال اور قوت اختراع ہے اور اس کے خارجی روپ وہ حسین ہیئت اور خوبصورت پیرائے اظہار ہیں جو لفظوں کی مدد سے تحریر کی صورت اختیار کرتے ہیں۔
>
> اس فن لطیف میں الفاظ مرکزی حیثیت رکھتے ہیں اور یہی اس کو باقی فنون لطیفہ سے جدا کرتی ہے۔ ورنہ شدت تاثر اور تخیل کی مصوری اور تخلیق و اختراع کا عمل دوسرے فنون میں بھی ہے"۔ (۷)

ادب کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ یہ انسانی معاشرے کی روح ہوتی ہے جس سے تخلیق کار اپنی فکر، اپنی تخلیق میں الفاظ کا خوبصورت جامہ پہنا کر ایک مکمل ہیئت کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ مقبول عام ادب، ادب کی ایسی ہی ایک شاخ ہے جو زمانے میں وقت کے ساتھ ساتھ فروغ پاتی ہے۔ انیسویں صدی کے آخر سے

تاحال ادب میں جتنی بھی اصناف ادب آئی ہیں وہ زیادہ تر مغرب کی دین ہیں اور انہی ادبیات سے ہمیں ہدایت اور تخلیقی زبان کے بہت سے تصورات نہ صرف میسر آئے ہیں بلکہ بڑی حد تک ان کا اطلاق بھی ہمارے معاشرے پر ہوا ہے، جس کی وجہ سے ادبی افق کا ایک وسیع منظر نامہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ مقبول عام ادب کی اصطلاح کا چلن ہمارے اردو ادب میں مغرب ہی کے زیر اثر پیدا ہوا۔ حقیقت میں یہ کوئی نیا رجحان یا کوئی نئی تحریک نہیں ہے، جس کے تحت ایک خاص قسم کے ادب کی تخلیق کی گئی ہو بلکہ ادبی تخلیقات کو ناقدین نے مختلف خانوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ان ادبی خانوں کو الگ الگ ناموں سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ مغربی ادب میں مقبول عام ادب کی اصطلاح کا استعمال دورِ جدید میں ہوا کیونکہ اس سے پہلے وہاں کے سیاسی اور سماجی رابطے آج کے مختلف طبقوں کے لیے الگ الگ اور مخصوص ہوتے تھے۔ ان طبقوں کے رسم و رواج آج ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہیں۔ ان میں ایک گہری خلیج پیدا ہو گئی ہے اور اس خلیج کو اپنا کردار اس وقت ادا کرنا ہے جس وقت ایک حد تک تفریق پیدا ہو رہی تھی۔ اس کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طبقے سے تعلق رکھنے والے اہل قلم کی نگارشات دوسرے طبقے کے تخلیق کاروں کی تخلیقات سے الگ الگ یا لاشعوری طور پر اپنے طبقے کے احساس فکر اور اس کی ادبی زندگی کو زیادہ سے زیادہ اُجاگر کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ ہر شعبہ پر اعلیٰ طبقے کو اجارہ داری حاصل ہوتی تھی جس طرح وہ چاہتے تھے۔ اس قسم کا ادب تخلیق کرتے تھے اور اس کے ذریعے وضع کردہ اُصول و ضوابط ہر کسی فرد کی زندگی کے اوپر لاگو کرتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ لاگو کیے جانے والے اصول و ضوابط ہر کسی کے لیے قابل قبول نہیں ہوتے تھے۔ اس طرح اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ کوئی ایسا متوسط نظام تخلیق کیا جائے جس میں تمام نمائندہ ادب لکھنے والے ایسے اصول و ضوابط طے کریں کہ جو معاشرے میں تفریق کا باعث نہ بنیں بلکہ معاشرے کو آپس میں مل جل کر اکٹھا رکھنے کے لیے جدوجہد کریں۔ کسی ایک طبقے کی طرف داری اور قصیدہ خوانی نہ کی جائے بلکہ عام قاری اور عام فرد کے ذہن اور مزاج کو سمجھ کر اس کو مد نظر رکھتے ہوئے حالات کا جائزہ لے کر ادب تخلیق کیا جائے۔ تاکہ تمام شعبہ ہائے زندگی کے افراد مل کر ادب کے جو ضابطے طے کریں وہ سب کے لیے قابل قبول بھی ہوں اور وہ معاشرے کی اصلاح بھی کریں۔ اُردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں کے حوالے سے ڈاکٹر منظر اعظمی لکھتے ہیں:

> ”رومانویت لفظ رومانس سے ماخوذ ہے اور رُومانس ادب اس قسم کی کہانیوں سے عبارت ہوتا تھا جو پر شکوہ اور آراستہ پس منظر میں عشق و محبت کے واقعات کو پیش

کرتی تھیں۔ پروفیسر احتشام حسین کے نزدیک رومان سے مراد حسن و عشق کا افلاطونی اور تخیلی بیان نہیں بلکہ روایات سے بغاوت، نئی دنیا کی تلاش، خوابوں اور خیالوں سے محبت، اُن دیکھے حسن کی جستجو، وفور تخیل اور وفور جذبات انانیت میں ڈوبی ہوئی انفرادیت، آزادیٔ خیال حسن سے تابقدور لطف اُٹھانے میں ناآسودگی کا احساس اور اس کا کرب ہیں، ان سب کو رومانیت کہتا ہوں۔ رومان اسے بھی کہتا ہوں جو حقائق کی جستجو، مادّی اسباب سے زیادہ خیالات و تصورات کی رنگین دنیا میں کرتا ہے"۔ (۸)

انیسویں صدی کے نصف تک یورپی ممالک میں ادیبوں و دانشوروں اور اہل علم کا ایک ایسا طبقہ وجود میں آیا جو عوام کے مفادات کو مد نظر رکھ کر اپنے فن کا مظاہرہ کرنے لگا کیونکہ عوام ہی کی سرپرستی کے ذریعے ان کی تہذیب و ثقافت اور نشوونما ان کے خیالات و افکار کی نشر و اشاعت اور ان کی حرکات و سکنات کی ترجمانی، ان کے جمالیاتی حسن کو سامنے رکھ کر اس کی عکاسی کی جانے لگی جس کے باعث عوامی کلچر کا جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوا اور طبقہ امراء نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن یہ کہنا بے محل نہ ہو گا کہ سولہویں صدی کے نصف سے سماج میں جو تبدیلیاں آرہی تھیں ان کے نتائج بتدریج برآمد ہونا شروع چکے تھے۔ اس وقت جاگیر دارانہ نظام اپنی زندگی کی آخری حدوں کو چھو رہا تھا۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں نت نئی سائنسی ایجادات انسانی زندگی کے تصورات کو تیزی سے بدل رہی تھیں۔ حکمرانوں اور ریاستوں کی حدود سے آزاد ہونے اور نیا معاشرہ تشکیل دینے کے لیے کوششیں شروع کر دی گئی تھیں۔ جس کے باعث وقت کے ساتھ ساتھ فنون لطیفہ کے نام نہاد اجارہ دار مایوس ہونے لگے۔ متوسط طبقہ کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ سے خطرہ محسوس کرنے لگے کیونکہ ان کو اس بات کا خدشہ تھا کہ کلیسا اور ریاست نے ورثے کے طور پر ان کو معاشرے میں جو مقام دیا ہے، حقیقت میں وہ اس مقام کے اہل نہیں تھے۔ یہ مقام حاصل کرنا ان لوگوں کا منصب تھا جنہوں نے اپنی زندگی میں بہت زیادہ محنت، جستجو کے بعد وہ منزل حاصل کی تھی۔ ان کا مقصد صرف یہ نہیں تھا کہ وہ اپنے رویوں کے سبب زندگی کی اقدار سے بہرہ مند ہوں۔ بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ جو کوئی ادب کے حوالے سے زیادہ جستجو اور محنت کرتا ہے، اس کا مرتبہ اُسی قدر بلند ہونا چاہیے۔ طبقۂ امراء کے خلاف صف آراء ہونا اور معاشرے کو خواب غفلت میں مبتلا رکھنے کی کوشش کرنا زوال ادب کا باعث بن سکتا تھا۔ شارب ردولوی اس بارے میں کہتے ہیں:

"ادب دراصل زندگی اور تہذیب کا عکاس ہوتا ہے۔ وہ خارجی حقیقتوں کو داخلی آئینے میں پیش کرتا ہے۔ ادب انسانی زندگی کی ایک ایسی تصویر ہے جس میں انسانی جذبات و احساسات کے علاوہ مشاہدات، تجربات اور خیالات کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ اس میں تاریخی حقیقت، زندگی کا سچا تصوّر اور فن کے صحیح احساس کا ہونا ضروری ہے۔ بعض لوگ ادب کو "ذہن تعیش" کہتے ہیں لیکن زندگی اور اس کے ٹھوس حقائق سے ان کا فرار ہے۔ ایسی باتیں اس دور کی غمازی کرتی ہیں جب کہ بُرائی، تہذیب اور معاشرت بدلتے ہوئے نظام میں اپنے آپ کو سمو نہیں پاتی، اس کو قبول نہیں کرتی۔ وہ زمانہ دوغلی تہذیب کا زمانہ ہوتا ہے۔ ایسے موقعوں پر انسان زندگی کی حقیقتوں سے فرار اختیار کرتا ہے۔ اس میں جدوجہد کی قوت باقی نہیں رہتی۔ اس لیے وہ تصنع، بناوٹ اور تکلّف کو حقیقت سمجھنے لگتا ہے"۔ (۹)

اس کے بعد معاشرے میں بتدریج وہ تبدیلیاں رونما ہونا شروع ہو گئیں جو ابھی طبقۂ امراء کے حق میں نہ تھیں اور جن کا فائدہ کتب بینی کے فروغ کو زیادہ سے زیادہ پہنچ رہا تھا۔ اس وقت ایک گروہ ایسا بھی تھا جس نے سماجی اور اقتصادی جبر کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ انسان زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکتا اور وہ اپنی جھوٹی انا کی خاطر تسکین حاصل کرنے کے لئے مختلف حیلے بہانوں سے کام لیتا ہے۔ اس لیے انھوں نے اپنے وجود کے تشخص کو قائم رکھنے کے لیے صحیح ادب اور سنجیدہ ادب کی آواز بلند کی۔ دوسرے معنوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سماج سے متحدہ ہونے کے لیے ادب برائے ادب اور ادب عالیہ کے نظریے کی بنیاد ڈالی گئی جس میں خالص ادب کے متعلق خیالات پیش کیے گئے تھے۔ ان کے خلاف تین قسم کے بیانات ہمارے سامنے آئے جن میں ایک تو یہ کہ عوام کو شروع ہی سے نظر انداز کیا گیا اور ادب کے خالقین کو اچھا نہیں سمجھا گیا۔ فنون لطیفہ کے اعلیٰ اور بہترین تصورات کو مذاق سمجھا گیا۔ دوسرا اخلاقیات سے متعلق تھا وہ یہ کہ عوامی تہذیب و تمدن ثقافت کی جگہ لے رہی ہے، ایک انحطاطی رجحان ہے۔ تیسرے عصری، سماجی تناظر میں مظاہر نو کو سمجھنے کی کوشش کی گئی اور بنیادی سیاسی و اقتصادی مسائل کو بغیر کسی فیصلے کے اس سے منسلک کر دیا گیا۔ چنانچہ انیسویں صدی کے اواخر تک سماجی تبدیلیوں اور زندگی کے مختلف شعبوں میں ہمہ جہتی ترقی سے تعبیر کرتے رہے اور ادب کے خلاف متضاد بیانات بھی صادر ہوتے رہے ہیں۔

مقبول عام ادب کی روایت کوئی نیا اور جدید رجحان نہیں ہے بلکہ یہ کسی نہ کسی صورت ہر زمانے میں موجود رہا ہے۔ تاہم مقبول عام ادب کی اصطلاح وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہی ہے اردو ادب میں اس کے نقوش ادبِ عالیہ سے تلاش کر سکتے ہیں۔ جب ادب کا وجود ہمارے سامنے تھا تو اس وقت بھی مقبول عام ادب کی اصطلاح موجود تھی جو وقت کے ساتھ ساتھ نسل در نسل چلتی ہوئی جو آج تک پہنچی ہے۔ اس میں انسانی زندگی کے اجتماعی شعور کا عمل دخل بہت زیادہ ہے کیونکہ ادب عوام کے ذریعے تخلیق کیا جاتا ہے اور عوام کے تخلیق کیے ہوئے ادبی فن پارے پہنچتے ہیں تاہم اگر ایک فن پر کسی ایک ماہر تخلیق کو دسترس حاصل ہے تو وہ زبان زد عام ہو گا۔ ایسے فن پارے کا شمار بھی عوامی ادب کے زمرے میں آئے گا۔ زبانوں کے ادب کا تحریری شکل میں موجود ہونا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ اگر یہ تحریری شکل میں موجود نہیں ہو گا تو وقت کے ساتھ ساتھ یہ ختم ہوتا چلا جائے گا اور یہ ادب کبھی باقی نہیں رہے گا۔ لہٰذا اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ عوامی ادب کو اگر تحریری شکل میں محفوظ کر لیا جائے تو یہ ہمارے قومی ورثے کا ایک اہم حصہ بن کر اگلی نسلوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے گا جس سے ہماری نئی نسل اس تاریخی ورثے سے بھرپور فائدہ اٹھا سکے گی۔ ایسی تاریخی تحریروں کو ادب کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔ لوک ادب اور مقبول عام ادب میں چند مشہور شخصیات جن میں رشید حسن خاں کے شاہکار "فسانہ عجائب" کے متون کی از سر نو تدوین کی اور اس میں مختلف مقامات پر درج شدہ متعدد شعرا کے حوالے سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا اور شعر سے قبل لاعلم تحریر کر دیا ہے جس سے ان کی علمیت اور ان کے مطالبے پر آنچ نہیں آتی کیونکہ ان شعروں کے خالق شعرا بہت سی تلاش اور جستجو کے باوجود ان نئے کتب خانوں سے فیض حاصل کرنے کے بعد بھی میسر نہ ہو سکے تو انھوں نے ان اشعار کے سامنے نامعلوم لکھ دیا۔ ادبی سماجیات میں محمد حسن لکھتے ہیں:

> "ایک زمانہ تھا شاعری پیشہ تھی اور معزور مقتدر پیشہ۔ شاعر درباروں میں جگہ پاتے۔ امیروں اور منصب داروں کے ایوان میں عزت سے بٹھائے جاتے، قصیدے لکھتے اور انعام پاتے۔ وظیفے مقرر کیے جاتے اور ملک الشعرا قرار پاتے، جو اس پیشے کو قبول نہ کرتے وہ قلندری زندگی گزارتے اور عزت پاتے۔ عمومی طور پر انیسویں صدی تک اُردو کے شاعر کی تصویر صوفی، عاشق اور قلندر کی تھی جسے مال و دولت اتنی عزیز نہ تھی جتنی اپنی آزادی اور دل زدگی عزیز تھی"۔ (۱۰)

اردو ادب کے حوالے سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس میں عوامی ادب کا جنم اس وقت شروع ہو گیا تھا جب ہندوستانی تہذیب و ثقافت ایک مخصوص شکل اختیار کر گئی تھی۔ اس میں یہ بات بھی واضح ہے کہ اردو زبان ان مختلف زبانوں کے خمیر سے تیار ہوئی ہے جس میں فارسی شروع ہی سے رابطے کی زبان سمجھی جاتی تھی اس کے ساتھ ساتھ اس میں محاوروں کا چلن عام ہو گیا تھا اور یہ زبان عوامی زندگی میں اپنا کردار ادا کر رہی تھی۔ اس زبان کی خوبی یہ ہے کہ اس میں سادگی، سلاست اور روزمرہ بول چال کے لیے بنیادی خمیر یا مواد موجود ہے مگر جیسے جیسے اسے یہ زبان دوسری زبانوں عربی، فارسی کے الفاظ کو اپنے اندر سموتی چلی گئی تو اس کا ذخیرۂ الفاظ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ فارسی، عربی زبان سے زیادہ واقف تھے، انھوں نے اس کی روایات سے زیادہ فائدہ اٹھایا اور زیادہ متاثر ہوئے اس لیے یہاں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ عربی، فارسی کی تعلیم کے بعد اگر اردو زبان کا استعمال کیا جائے تو اس سے بہت سے فوائد حاصل ہوں گے۔

اردو ادب کے حوالے سے ایک اور بات قابل غور ہے کہ زمانہ قدیم میں عام طور پر پر زبان سے آشنا لوگ تصنیف و تالیف کا کام انجام دیتے تھے۔ آج کے زمانے میں بھی وہی لوگ اس میدان میں کامیاب ہیں جن کو علم لسانیات اور اپنی زبان پر دسترس حاصل ہے۔ ادب کی نشوونما، اس کی نشر و اشاعت میں وہی لوگ کردار ادا کر سکتے ہیں جو تخلیق کے فنی اصولوں سے واقف ہیں۔ خاص طور پر ایک تخلیق کار فکر و نظر کے ایسے رجحانات کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا جو ادب میں اپنا مقام پیدا نہیں کر سکتا جو وقت کے ساتھ ساتھ ادب میں عوامی ادب کی تخلیق کی استطاعت کے لیے ضروری ہو۔ اس وقت سماجی اور اقتصادی زندگی کے دو مختلف طبقے موجود ہیں جن میں ایک طرف عوام الناس ہوتے ہیں، جن میں بیشتر لوگ نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسری طرف بادشاہ، وزیر، اعلیٰ فوجی افسران اور درباروں سے وابستہ افراد ہوتے ہیں، جنھیں اونچا طبقہ کہہ سکتے ہیں جو عہد جدید کی طرح متوسط طبقے کا وجود نہیں رکھتے۔ ایسے لوگ جو اس طبقے میں ہو سکتے تھے اور ذہنی طور پر یہ جاگیر دارانہ نظام اور اس کی طرز زندگی سے متاثر تھے۔ اس وقت ان کو دو رنگ دیکھنے کو ملتے تھے جن میں دونوں طبقوں کے شعور و آگاہی، رسم و رواج، بود و باش انگلش کھانا پینا اور رہن سہن کا عکس دکھائی دیتا تھا۔ شاعری، مجلس آرائی اور دربار اُمرا تک رسائی کا ذریعہ تھی۔

اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ درباری اہل فن اونچے طبقے کے لوگوں کے احساسات و جذبات کی عکاسی تحریروں کے ذریعے کیسے کی جاتی تھی۔ وہ زندگی میں اصول و ضوابط اور رواج کی پابندی خیال کرتے تھے تاہم سوچنے کی بات یہ ہے کہ انسانیت بھی کوئی چیز ہے جس کی بقا کا ہر شخص ذمے دار ہے۔ اس لیے بنی نوع

انسان کے ساتھ اونچے طبقے کی پاسداری کرنے کے لیے تو بڑے ادیبوں، شاعروں، فنکار اور نثر نگاروں کی تخلیقات کو قبول کرنا تو اپنا فرض سمجھا جاتا ہے مگر چھوٹے طبقے، نچلے طبقے اور درمیانے طبقے کی آبیاری کرنا، ان کے مسائل کو اجاگر کرنا اور انہیں معاشرے میں تحفظ فراہم کرنے کے لیے ادیبوں نے ادب کے ذریعے اپنی وہ خدمات پیش نہیں کیں جو انھیں کرنی چاہیے تھیں یا جو اس طبقے کا حق بنتا تھا۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ ہر طبقہ اپنی تہذیب، اپنی اقدار اور اپنا ادب رکھتا ہے۔ ٹھیک اسی طریقے پر ہر دور میں کوئی نہ کوئی نظریہ قائم کرنا اسے قومی دھارے میں لانا استحصالی طبقہ کا شیوہ ہوتا اور مظلوم طبقہ کے مخالف یا پھر اس کے برعکس مغربی ادب میں بھی اس طبقے کے ساتھ ایک ایسے طبقے کا وجود ملتا ہے جس کی جڑیں عوام میں بہت گہری ہوتی تھیں۔ طبقہ اہل قلم عوامی روایت کو اپنا شعار بنائے ہوئے تھا۔ دوسرا طبقہ اعلیٰ طبقے کی قیادت کر رہا تھا۔ یہ دونوں ان حالات کا مشاہدہ اور عام زندگی کا مطالعہ اس طرح کر رہے تھے کہ ادب کے ذریعے عوامی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں کو محسوس کیا جاسکے۔ سب اپنے انداز سے اس احساس کو بیان کرنے کی جستجو میں لگے ہوئے تھے۔ پھر ایک وقت ادب پر ایسا بھی آتا ہے کہ جب دنیا میں انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ جب اعلیٰ طبقے کی پاسداری کرنے والوں کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ نچلے طبقے کی محرومیوں کو اس طرح سے بیان نہیں کر رہے، جس طرح سے ان کا حق ہے۔ اس بات کو شدت سے محسوس کرتے ہیں تو اس تحریک کے خلاف رد عمل شروع ہو جاتا ہے اور اس کے برعکس عناصر پر زور دیا جاتا ہے، یعنی ادب عالیہ وجود میں آتا ہے۔

ادبِ عالیہ وہ ادب ہے جس میں فنی اور ادبی کارنامے مروجہ ادبی اصول و ضوابط کے مطابق ہوں جو ماضی میں تخلیق کیے گئے یا حال میں ان کا وجود ملتا ہو۔ اس کو احسن طریقے سے اس طرح سے بیان کیا جائے کہ کسی بھی فرقے، قوم، مذہب یا انسان کو یہ احساس نہ ہو کہ یہ ادب کسی خاص ڈگر پر کسی مخصوص طبقے کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اس میں کلاسیکی ادب کو بھی بہت بڑا دخل ہے، کیونکہ کلاسیکی ادب کا وجود ہمیشہ برقرار رہتا ہے۔ کلاسیکی ادب لکھنے والوں میں ماضی، حال اور مستقبل میں رہتے ہوئے ماضی کا بھی سوچتے ہیں اور مستقبل کے بارے میں بھی خیال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ٹی ایس ایلیٹ نے کلاسیکل ادب کے حوالے سے لکھا ہے:

> "کلاسیکی اُس وقت ظہور میں آتی ہے جب کوئی تہذیب کامل ہوتی ہے۔ جب اس کا زبان و ادب کامل ہوتا ہے اور ساتھ ساتھ وہ کسی کامل دماغ کی تخلیق ہوتی ہے۔ دراصل یہ اس تہذیب اور اس زبان کی اہمیت اور ساتھ ساتھ کسی منفرد شاعر کے دماغ کی جامعیت ہوتی ہے جو کسی تخلیق کو آفاقیت کا درجہ عطا کرتی ہے"۔ (۱۱)

ادب میں تہذیب اور زبان پر کاملیت ہونے کا اطلاق ایک مشکل کام ہے کیونکہ تہذیبی اقدار کے تانے بانے وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ بنتے بگڑتے رہتے ہیں اور یہ ممکن ہے کہ جس تہذیب کو آج تک ہم کامل قرار دیتے ہیں، آنے والی نسلیں اسے بہتر سمجھ رہی ہوں۔ زندگی اور ادب کا ایک نیا تصور یا فلسفہ پیش کریں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ تہذیب اور زبان دونوں مجرد چیزیں ہیں جن کی سائنسی تحدید کرنا بہت ضروری ہے۔ اس تناظر کو سامنے رکھتے ہوئے اگر ماضی کا مطالعہ کیا جائے تو یہ تسلسل برقرار رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ چیزیں زبان کے بارے میں بھی ترقی پذیر ہوتی ہیں اور کچھ زبان کے ساتھ ساتھ متروک ہوتی چلی جاتی ہیں۔ جب اردو زبان رابطے کی زبان سے ادب کی زبان بنی تو اس میں فارسی اور عربی شعریت کا غلبہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ادب کے کلاسیکی سرمائے پر تخصیص کی جاسکتی ہے۔ فارسی، عربی زبان بولنے والوں پر پہلے والی تہذیب و ثقافت کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ سودا، ذوق، میر حسن اور دیا شنکر نسیم کی مثنویاں ہوں یا انیس و دبیر کے مرثیے ہوں، ان سب پر فارسی تہذیب کے رنگ و آہنگ گہرے دکھائی دیتے ہیں۔ تاہم فارسی تہذیب کے عناصر بہت حد تک ہمارے ابتدائی ہندوستانی کلچر میں سمو گئے تھے۔ اس لیے فارسی، عربی تہذیبی عناصر کی کثرت سے جو نتائج برآمد کیے جاسکتے ہیں، اردو زبان و ادب کے کلاسیکی سرمائے میں ہندوستانی ثقافت سے خالی ہیں۔ شاعر اور ادیب اپنی تخلیقات میں دوسری زبانوں کے اصناف سخن کو ادب کے مزاج اور اس کے مطابق استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں عوام و خواص نے ایسی تخلیقات کو پذیرائی بخشی ہے جو ادب وقت اور مذاق سخن کی تبدیلیوں سے عاری تھیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اردو ادب کے پیشتر کلاسیکی سرمائے پراگندگی کے عہد میں ضبط کیے گئے ہیں۔ اس بات کا قوی امکان ہوتا ہے کہ ایسے پر آشوب حالات میں ادیب کو سچائی کی تلاش اور حقیقت صحت کے ادراک میں دشواریاں ہو سکتی ہیں، تاہم اس کا معاملہ عام انسانوں کے اذہان سے ذرا مختلف واقع ہوا ہے۔ اس لیے وہ ہر تخلیق کار اسے اپنی الگ نظر سے دیکھتا ہے اور جو سچ سمجھتا ہے، تخلیق کرتا ہے۔ اردو ادب کے شعرا اور ادیبوں نے اپنی تخلیقات کے تقابلی مطالعے سے ادب عالیہ کے جو معیار و میزان وضع کیے ہیں، اردو ادب میں بہت بڑا اضافہ تھا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر شارب ردولوی نے لکھا ہے:

> ”جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ اس وقت شعر و ادب کی تنقید کے نہ تو باقاعدہ اُصول تھے اور نہ ہی آج کی طرح ادبی قدروں کے تعین کے لیے مختلف نظریات۔ جو چیز دوسروں کے مصائب و محاسن کے سلسلے میں ان کی رہنمائی کرتی تھی، اس میں سب

سے اہم ان کا وجدان تھا۔ دوسرے علم زبان و عروض، جو فارسی نظام کا ایک جزو تھا اور جسے اکتسابی طور پر حاصل کیا جاتا ہے۔ تیسرے قدیم اساتذہ کے کلام کا مطالعہ جس میں بہت سی جگہوں پر شعر گوئی و سخن فہمی کے سلسلے میں ایک نظام پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ چوتھے جمالیاتی و فنی قدریں جس میں صنائع و بدائع، تشبیہ استعارہ اور دوسری صفتیں شامل ہیں، جو بدیع و بیان اور عروض کا ایک حصہ بھی ہے"۔ (۱۲)

ادب علم اور جذبہ کی درمیانی خلیج کو باٹنے اور انسان کو داخلی سکون (طمانیت) عطا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور یہ تمام افکار و احساسات کو بھی بیان کرتا ہے جس سے قاری کو مسرت پہنچتی ہے۔

مولانا صلاح الدین نے ادب کے فروغ میں جو نظریہ پیش کیا اس میں انھوں نے ادب کو ابر گہربار سے تشبیہ دی ہے جو برستا ہے تو وجود کائنات کو تازگی عطا کرتا ہے۔ انداز بیاں کی دلکشی اور خوبصورتی بھی ادب میں بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ کوئی بھی شاعر یا نثر نگار جب کوئی تحریر لکھتا ہے تو یہ ضرور دیکھا جاتا ہے کہ اس کا اندازِ بیاں اور اسلوب کیسا ہے؟ شاعری کو شاعری اور ادب کو ادب بنانے میں اسلوب کا بھی اہم کردار ہوتا ہے۔ کیونکہ شعر و ادب میں جو بھی مزہ ہوتا ہے وہ کافی حد تک اسلوب کی دلکشی اور خوبصورتی پر منحصر ہوتا ہے۔ چونکہ ادب انسانی کردار کا آئینہ ہوتا ہے اس میں انسان کے جذبات، دکھ سکھ، حوصلہ، ہمت، فتح غرض یہ کہ زندگی کے تمام پہلوؤں کی عکاسی کرتا ہے۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مواد اور اسلوب کے ملاپ کو ادب کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اس کی مثال اس طرح سے دی جاسکتی ہے جیسے زندگی کی تخلیق میں چار بنیادی عناصر کارفرما ہوتے ہیں۔ مثلاً ہوا، پانی، مٹی اور آگ ان کو تخلیقی عناصر تو نہیں کہا جاسکتا البتہ کسی بھی وجود کے اجزا ضرور ہوسکتے ہیں۔ اسی طرح ادب کی تخلیق میں بھی چار عناصر کا عمل دخل ہوتا ہے۔ کیونکہ ادیب جو کچھ بھی تحریر کرتا ہے اسے عقل کے ذریعے ہی دریافت کرتا ہے۔ اور ادب میں جذبات کا لمس بھی شامل ہوتا ہے۔ ادیب یا شاعر جو کچھ بھی تخلیق کرتا ہے اس میں عقل کے ساتھ ساتھ دل اور روح کا رشتہ بھی قائم ہوجاتا ہے۔ ادب میں تخلیق کے ساتھ ساتھ ادراک، جذبات کے علاوہ تکنیک کا ہونا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ جو کچھ بھی لکھا جائے گا اسے کسی خاص سانچے میں ڈھال کر لکھا جاتا ہے مثلاً ناول، شاعری اور افسانہ وغیرہ۔ خوب صورت اسلوب اور اندازِ بیاں ہی قاری کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا ہے۔

عمدہ ادب ایک ماہر مصنف ہی تخلیق کر سکتا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے اس نے سیاہی سے ہی نہیں بلکہ اپنے خونِ جگر کو ایک کر کے لکھا ہے۔ ادب کے لیے یہ کہنا کافی نہیں ہو گا کہ ادب بیان، وجدان اور کیفیت کا ایسا مرقع ہے جو پڑھنے والے کے دل و دماغ میں اترتا جاتا ہے۔ ادب کی خوبصورتی یہ ہے کہ اس کی رسائی نہ صرف دل بلکہ دل سے باہر کی دنیا تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کا تعلق انسانی زندگی کے شعبوں سے نہیں بلکہ پوری دنیا ہی قدرت کی تمام رعنائیوں سمیت اس کے اندر موجود ہوتی ہے۔

ادب کا مطالعہ کرنے سے نئے احساساتی تناظر اور جمالیاتی حظ محسوس ہوتا ہے۔ ادب زندگی، تہذیب، فطرت اور فکر کے اتنا قریب کر دیتا ہے کہ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے سب کے سب اپنے وجود کا حصّہ ہوں۔

ادب چونکہ انسان کے باطن کا عکس ہے۔ ادب کو پڑھنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ ادب بھی ہمیں پڑھتا ہے اور پھر نہایت گہرائی، دل جمعی اور بصیرت سے ہمارے داخلی اور تہذیبی پہلوؤں کے اندر موجود دلائل کو باہر لاتا ہے اور رومانی، مادی اور ارتقائی مراحل سے گزرتے ہوئے نئے راستوں پر چلنے میں ہماری مدد کرتا ہے۔

ادب کو مندرجہ ذیل تین قسموں تقسیم کیا گیا ہے:

۱۔ ادبِ عالیہ

۲۔ مقبول عام افسانوی ادب

۳۔ پلپ فکشن

اس بات میں یقیناً کوئی شک نہیں کہ ادب، ادب ہوتا ہے چاہے وہ کسی بھی قسم کا کیوں نہ ہو۔ ویسے تو ادب میں جاسوسی ادب اور رومانوی ادب وغیرہ بھی شامل ہیں لیکن یہاں پر صرف تین قسم کے ادب کا تقابل ہی کیا جائے گا۔

ہمارے معاشرے میں بھی ادب کے حوالے سے دو قسم کی سطحیں نظر آتی ہیں۔ باشعور اور باذوق قارئین: یہ وہ لوگ ہیں جو اعلیٰ ادب اپنی داخلی طلب کی وجہ سے اپنی خوشی اور رضامندی سے پڑھتے ہیں۔ اعلیٰ ادبی ذوق و شعور سے محروم قارئین، یہ وہ سطح ہے جس میں وقت گزاری اور تفریح کے لیے معمولی اور سطحی قسم کے ادب کو پڑھنے کے لیے دلچسپی لی جاتی ہے۔

کچھ لوگ ادب کو دل بہلانے کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ کچھ لوگ اسے صرف ذات کا تزکیہ سمجھتے ہیں۔ اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو ادب ہمارے لیے ایک روح کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ جس چیز کا تعلق انسان کی روح سے قائم ہو جائے وہ چیز کبھی ختم نہیں ہوتی اور وہ انسانی زندگی میں ایک دوامی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔ اس لیے جب تک انسانی زندگی میں روح باقی ہے، ادب باقی رہے گا۔ دوسرے یہ کہ ادب کا تعلق ہمارے ظاہر سے بھی ہے کیونکہ جب ایک ادیب معاشرے میں ہونے والے ظلم و ستم اور ناانصافیوں سے متاثر ہوتا ہے تو اس کا اثر اس کی روح پر پڑتا ہے تو وہ اپنے دکھوں اور تکلیفوں کو شعر و سخن یا افسانوی ادب کی شکل میں معاشرے کے سامنے پیش کرتا ہے۔ دنیا میں کوئی بھی معاشرہ ادب سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ادیب کا دل حساس اور ہمدردی سے بھرپور ہوتا ہے۔ ادب کے تخلیق کار میں اس کی روح شامل ہوتی ہے۔ ایک ایسی روح جو معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں کا بھرپور طریقے سے مقابلہ کرتی ہے۔ محققین کا خیال ہے کہ مذہب کے بعد اگر کسی معاشرے کی تعمیر و ترقی کرنی ہو تو وہ ادب کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ گویا ادب انسانی زندگی میں ایک فعال کردار ادا کر سکتا ہے۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارے معاشرے میں ادب پر کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی۔ ادب پڑھ کر اُس پر عمل کرنے والے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب کا ہماری زندگیوں پر کوئی خاص اثر نہیں ہو رہا ہے۔ حالت یہ ہے کہ اس وقت شعر کہنے والوں کو بے کار انسان تصور کرتے ہوئے اسے فضول مشغلہ قرار دیا جاتا ہے۔ اگر ہمارے معاشرے میں انسانی تخلیقات پر توجہ دی جائے تو ادب ایک بہت سود مند اور تعمیری کردار کر سکتا ہے۔ جیسا کہ ادب کا تعلق روح اور مذہب دونوں سے ہے اور یہ دونوں چیزیں انسانی زندگی میں دوامی حیثیت رکھتی ہیں۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ جس معاشرے میں ادب پر توجہ دی جاتی ہے وہاں کے لوگ ہمیشہ تعمیری کردار ادا کرتے ہیں۔ جس معاشرے کے لوگ ترقی کرنے کے خواہاں ہوں، انھیں چاہیے کہ وہ ادب پر خصوصی توجہ دیں۔ ڈاکٹر نذر خلیق نے ادب اور معاشرے کے تعلق کے حوالے سے جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ

> ”ادب پر توجہ تخلیق کاروں پر توجہ دینا ہے۔ اُن کی قدر و منزلت میں اضافہ کرنا ہے تاکہ زرخیز ذہن کو فروغ ملے۔ ادب کتب اور رسائل کو فروغ دینا ہے۔ اُن کی اشاعت اور فروخت کو یقینی بناتا ہے۔ کیونکہ ادب میں کتب اور رسائل میں قوموں کی وہ تاریخ بھی ہوتی ہے جو حقیقت پر مبنی ہوتی ہے“۔ (۱۳)

مورخین بعض اوقات تعصبات کا شکار ہو کر تاریخی حقائق کو درست طریقہ سے بیان نہیں کرتے جس کی وجہ سے تاریخی کتب ہمیشہ نظروں سے اُوجھل ہو جاتی ہیں۔ ہمارے اکثر ادیب بعض اوقات گروہ بندیوں کا شکار ہو جاتے ہیں اور حقائق کو ٹھیک طریقے سے بیان نہیں کرپاتے جس کا نقصان معاشرے کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ادیبوں کا یہ فرض ہے کہ وہ گروہ بندیوں سے بالاتر ہو کر انسانی تعمیر و ترقی میں اپنا کردار ادا کریں۔ بہت سے غیر مذہب ادیبوں نے بہت اچھی اچھی بے شمار نعتیں لکھیں ہیں۔ اسی طرح رابندناتھ ٹیگور نے "گیتان جلی" میں اللہ تعالیٰ کی توحید بیان کرتے ہوئے گروہ بندیوں سے بالاتر ہو کر درسی کتابیں لکھیں جن پر انھیں نوبل انعام بھی ملا۔ یہی وجہ ہے کہ ادب مذہب اور دیگر گروہ بندیوں سے بالاتر ہو کر ادیبوں کو ادب کی خدمت پر خصوصی توجہ دینا ہو گی۔

اگر انسانی جذبات و احساسات کا ذکر کیا جائے تو اس کا تعلق براہ راست اس کے ذہن سے ہوتا ہے اور ان پر احساسات و جذبات کے ذریعے معاشرے میں مختلف کردار پیدا ہوتے ہیں اور یہ بات بھی سچ ہے کہ ہر آدمی اپنی ذہنی صلاحیت کے مطابق کام کرتا ہے۔ دیکھا جائے تو ذہنی طور پر حساس لوگ باقی دوسرے لوگوں سے مختلف ہوتے ہیں اور ان کی قوت مشاہدہ بھی عام لوگوں کی نسبت زیادہ اور مختلف ہوتی ہے اور ایسے لوگ فطرتاً الگ صلاحیتوں کے حامل ہوتے ہیں۔ علمی تنقید کے تناظر میں کسی بھی ادب پارے کی تحدید کرنا اور اُسے اس قابل بنانا کہ وہ اعلیٰ ادب کے زمرے میں رکھا جاسکے۔ فیروز اللغات میں ادبِ عالیہ کے معنی یہ ہیں:

"اعلیٰ درجے کا ادب Classic"(۱۴۵)

اگر کسی عام انسان کی بات کی جائے تو اس کے دن رات ایک ہی روٹین میں ہوتے ہیں۔ اس میں کسی خاص قسم کی کوئی بھی تبدیلی نہیں ہوتی اور وہ اپنے ارد گرد ہونے والے واقعات کو بھی اتنی شدت سے محسوس بھی نہیں کرتا جس طرح کوئی ادیب یا فنکار محسوس کرتا ہے۔ ادیب اپنے تجربے اور مشاہدے کے ذریعے ایسے تمام مناظر اپنے قلم میں محفوظ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے جسے وہ دیکھتا یا محسوس کرتا ہے۔ ڈاکٹر نظیر صدیقی ادبِ عالیہ کے بارے میں اپنے تاثرات کچھ یوں ہیں:

> "انسانی شخصیت کے اندر اخلاقی حسن اور انسانی دلکشی پیدا کرنے میں ادب عالیہ کے مطالعے کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ ادب عالیہ کا مسلسل مطالعہ غیر محسوس طریقے پر انسانی ذہن، انسانی شعور محسن اور انسانی شخصیت میں وسعت پیدا کرتا ہے۔ ادب عالیہ کے مطالعے سے نہ صرف انسان کا علم وسیع ہوتا ہے بلکہ انسان کے اندر وسیع

النظری اور رواداری آتی ہے۔ انسانی کمزوریوں کو سمجھنے اور انہیں معاف کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، انسانی صلاحیتوں کے امکانات کا اندازہ ہوتا ہے، انسانی فطرت اور انسانی زندگی کی پیچیدگیوں کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ انسانی زندگی میں عفو و درگزر اور صبر و ضبط کی کتنی ضرورت ہے۔ اس بات کی طرف نظر جاتی ہے۔ غرض یہ کہ ادبِ عالیہ کے مطالعے کے ذریعے انسان اپنی ذات پر قابو قابو پاتا ہے اور اس طرح اپنے اندر ایک نئی شخصیت پیدا کرنے میں کامیاب ہوتا ہے"۔ (۱۵)

ادب اس احساس کا نام ہے جس کا تعلق بنیادی طور پر انسان کے ذہن سے ہوتا ہے۔ ادب کسی بھی مقصد کی وجہ سے وقوع پذیر نہیں ہوتا بلکہ یہ زندگی کے مختلف مشاہدات و تجربات کے ساتھ مل کر نظر آتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ادب خود اپنے مقاصد کی راہیں متعین کر کے ادیب کی زندگی کے مشاہدات اور تجربات و احساسات جب ایک مکمل پیرائے میں قلمبند ہوتے ہیں تو ادب کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادب کے موضوعات زندگی کی طرح اپنے اندر وسعت لیے ہوتے ہیں۔ تہذیب، شائستگی، تمیز، علم، زبان جس میں صرف، نحو، لغت، عروض، انشا، معانی اور بیان سے مراد ادب ہے۔ ادب کی تعریف کچھ اس طرح سے بھی کی جاسکتی ہے کہ جس کا تعلق عام انسانی دلچسپی سے ہو، لیکن اس میں ایک خاص ہیئت بھی موجود ہو جو کافی دلکش اور فرحت بخش ہو۔ اس تعریف سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ادب میں مقصد کے ساتھ لطف اور دلچسپی بھی موجود ہو تو ادب حقیقت اور تخیل کا ایک خوبصورت امتزاج بن جاتا ہے۔ ادب عربی زبان کا لفظ ہے اور جس میں مختلف النوع کا مفہوم بھی موجود ہے۔ اسلام سے پہلے عربی زبان میں یہ لفظ ضیافت اور مہمان داری کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ پھر بعد میں شائستگی کے معنوں میں سامنے آیا ہے۔

جدید دور میں ادب کے معنی بھی مخصوص طور پر سامنے آئے ہیں۔ ادب کے لیے یہ بات لازمی ہے کہ اس میں تخیل اور جذبات ہوں ورنہ ادب کچھ بھی نہیں ہے۔ ہر تحریری کام ادب کہلایا جاتا ہے۔ اس میں آرٹ، سائنس اور فلسفہ کو سمیٹا جاسکتا ہے۔ تخلیقی خواہش چونکہ ہر انسان کی فطرت ہے اور اسی خواہش کی وجہ سے فن یا آرٹ تخلیق پاتا ہے۔ اگر نفع یا نقصان کی بات ہو تو آرٹ یا دوسرے علوم سائنس، فلسفہ ان میں سے کسی قسم کا مادی نفع حاصل نہیں ہوتا۔ یہ صرف خوشی کا نام ہے۔ ادب چونکہ آرٹ ہی کی ایک شاخ ہے جسے فنِ لطیف کا نام دیا جاسکتا ہے۔ مغربی نقاد نکلر نارمن جودک کا ادب کے بارے میں کہنا ہے:

"ادبِ عالیہ سے مراد ہے کہ اسے تمام سرمایہ خیال و احساسات سے تعبیر کیا جائے، جو تحریر میں آچکا ہے اور جسے اس طرح سے ترتیب دیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کو مسرت حاصل ہوتی ہے"۔(۱۶)

ادب اُن احساسات و جذبات اور خیالات کا نام ہے جس کا اظہار کوئی ادیب، مفکر یا نقاد نہ صرف اپنے کیتھارسس کے لیے کرتا ہے بلکہ اس کا یہ کیتھارسس اس دور کے عوام کے ساتھ بھی جڑا ہوتا ہے، جس میں وہ زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے۔ اس لیے ادب کے حوالے سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ کوئی ادیب اپنے معاشرے کا نمائندہ اور نقاد ہوتا ہے۔ وہ اپنے معاشرے میں وقوع پذیر ہونے والی تمام خوبیوں اور خامیوں کو اپنے خیالات کے مطابق بیان کرتا ہے۔ اُردو لغت میں اس کی وضاحت اس طرح پیش کی گئی ہے:

"کارڈینیل نیومن (Cardinal Newman) (Ideal of University) میں کہتا ہے، انسانی افکار و خیالات اور احساسات کا اظہار زبان اور الفاظ کے ذریعے ادب کہلاتا ہے"۔(۱۷)

ان آرا سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ادیب جو کچھ بھی لکھتا ہے وہ زندگی کے تجربات، احساسات و مشاہدات اور اس کے تخیل اور اپنی شخصیت کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ کیونکہ خارجی حقیقتوں کا اظہار اسی وقت پُرتاثیر ہو سکتا ہے جب داخلی کیفیات اور تخیل اس میں شامل ہوں۔ کوئی بھی فن پارہ یا تحریر اسی وقت ادب کے اعلیٰ درجے تک پہنچتی ہے جب ادیب زندگی کے تجربات، مشاہدات و احساسات، تخیل، داخلی اور خارجی کیفیات کو اکٹھا کر کے اُسے قلم بند کرتا ہے۔

ادب اور دوسرے علوم میں اہم اور نمایاں فرق یہ ہے کہ کسی بھی غیر ادبی تحریر میں کچھ نہ کچھ بتانا لازمی ہوتا ہے لیکن ادبی تحریروں میں اظہار بیان کا حسن اور دلچسپی پیدا کی جاسکتی ہے۔ غیر ادبی تحریروں کے برعکس ادبی تحریر میں مصنف کے تخیل کی عکاسی کے ساتھ ساتھ وہ اپنے جذبات بھی دوسروں پر عیاں کرتا ہے۔ ادب عام انسان کو سکون، تسکین اور مسرت پہنچانے کا باعث ہے۔ ادب زندگی کی ترجمانی کرتا ہے تو کبھی زندگی کا ناقد بن جاتا ہے اور زندگی کی تشریح کر کے اُسے بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کوئی بھی ادبی تخلیق زندگی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ چونکہ ادب زندگی ہے اس لیے زندگی پر اثرانداز ہوتا ہے۔

ادب میں انسان کی داخلی، خارجی کیفیات اور محسوسات کا عمل دخل ہے تو پھر نثر اور شاعری دونوں ادب میں داخل ہو سکتے ہیں کیونکہ وہ ادب جس کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے ہوتا ہے اس کی داخلی دنیا کی

عکاسی کرتا ہے اور یہ اردو ادب کا وہ درجہ ہے جس میں ہر طرح کا ادب شامل ہے۔ اس میں عشقیہ، صوفیانہ شاعری اور مرثیہ وغیرہ بھی شامل ہیں لیکن پھر وقت کے ساتھ ساتھ دوسری ادبی اصناف میں بٹتے چلے گئے اور ان کے اظہار کے طریقے بھی مختلف ہوتے گئے۔

"ادب اور نفیس ادب، مضامین" میں ڈاکٹر سعادت سعید نے ادب کی تعریف اس طرح کی ہے:

> "کچھ ادیبوں اور شاعروں کا ارسطو کی پیروی میں یہ عقیدہ ہے کہ ادیب کتھارسس کرتا ہے یعنی وہ عذاب جو انسانی شریانوں میں اُبلتے لاوے کی مانند تیر رہا ہوتا ہے اس سے نجات دلاتا ہے۔ کیا ہے کی بات ہے کہ عادی اور ٹھوس صورتِ حال جو عذابوں کی تولید کا منبع ہے وہ تو موجود ہے اور عذابوں سے نجات مل جائے یعنی ادیب جذباتی قے کرتا ہے اس کے سر کا غبار، ضمیر کی کثافت اور معدے کا بحران سب کچھ ایک غلیظ قے کی صورت میں باہر آجاتا ہے تو ادیب اور قاری کا کیتھارسس ہو جاتا ہے۔"(۱۸)

ادبِ عالیہ کیا ہے۔ کسی بھی زبان کے اعلیٰ ترین اور معیاری ادبی سرمائے کو ادبِ عالیہ، عالمی ادب اور کلاسیکی ادب بھی کہا جاتا ہے۔ اگر اس کا باضابطہ مطالعہ کیا جائے تو ادبیات مطالعہ کا نام دیا جاتا ہے۔ اگر ادبِ عالیہ کی تعریف اس کی حدود اور خوبیوں کو دیکھ کر کی جائے تو پتا چلتا ہے کہ قدیم تخلیق کردہ وہ ادب ہے جس میں فن کی پختگی اور جمالیاتی حسن اپنے لطف اور انبساط کے ساتھ دوامی اوصاف کا حامل ہو اور جو ایک زندہ روایت کا درجہ حاصل کر کے آنے والوں کو متاثر کر سکے۔ اس کے علاوہ ہر عہد میں جس کی قدر و قیمت اور معنویت کو از سرِ نو تلاش کرنے کی کوشش کرے اور پھر جس کے گھنے سائے تلے نئے تخلیقی پودے نمو پا کر نئی چیزیں (برگ و نمو) لائیں، اردو زبان چونکہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں میں شمار ہوتی ہے جو اپنے اندر ایک مضبوط، توانا اور منفرد قسم کا معیاری ادب رکھتی ہے۔ یہ بات بھی سچ ہے کہ اہل اُردو ابھی تک اس بات سے بھی اتفاق نہیں رکھتے کہ کس عہد کے یا کس دور کے ادب کو ادبِ عالیہ میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ تاہم محققین میں متوازن رائے یہ بھی پائی جاتی ہے کہ تقسیم ہند سے پہلے معیاری ادب اردو کا ادبِ عالیہ ہے کیونکہ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اسی دور میں اُردو نے ترقی کے وہ تمام مدارج، منازل طے کیں جو آج تک پھر اسے نصیب نہ ہوئیں۔ موجودہ دور میں بھی اُردو سارے خوش نما بال و پر اسی عرصہ کے مرہون منت ہیں۔

جہاں تک اُردو ادب کو مقبول بنانے کا سوال ہے تو اس کے لیے تین قسم کے موضوعات مناسب ہیں:

"ایسا ادب جو ان کے مزاج کے قریب ہو اور ان کے دل کو چھوئے۔ مثلاً میں نے جرمنی آنے کے بعد کرشن چندر کے دو ڈرامے "سرائے کے باہر اور کتے کی موت برلن ریڈیو کے لیے ترجمہ کیے، جو اتنے پسند کیے گئے کہ یہ پروگرام بار بار دہرائے گئے۔ اسی طرح کرشن چندر کی کہانی "آخری بس" جو میں نے جرمن رسالے Sim und Form کے لیے ترجمہ کی کافی پسند کی گئی۔ وجہ صرف یہ تھی کہ ان میں جو مسائل تھے وہ جرمنوں کے دل کو چھو رہے تھے۔ جرمن پروفیسر این میری شمل تو اقبال کی بعض نظموں کی عاشق تھیں۔ اگر ہم محبت، امن، دوستی، استحصال کے خلاف اور انصاف کے لیے جدوجہد یا ماحولیات کو حائل خطرات کے بارے میں مضامین اور کہانیوں کا ترجمہ کریں گے تو وہ یورپ میں مقبول ہوں گے"۔ (۱۹)

زندگی اور ادب کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ کوئی بھی ادیب یا فنکار اُس وقت تک کوئی بھی تخلیق سامنے نہیں لا سکتا جب تک اپنے ارد گرد کے ماحول اور معاشرے کے ساتھ جڑا ہوا نہ ہو گا اور نہ ہی اس کی کوئی ایسی تخلیق سامنے آسکتی ہے جو قاری کے لیے متاثر کن ثابت ہو۔ کیونکہ کسی بھی خیالی اور تصوراتی بات سے حقیقت اور مقصدیت والی بات زیادہ اثر رکھتی ہے۔

(ج) مقبولِ عام افسانوی ادب

مقبول عام دو الفاظ مقبول عام اور فکشن کا مجموعہ ہے۔ اس کے معنی ہیں ایسی بات یا عمل جو عام لوگوں کے لیے کیا جائے اور وہ عمل یا کام لوگوں میں مقبولیت کا درجہ رکھتا ہو۔ مقبولِ عام ادب کے بارے میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ کوئی بھی ایسی بات جو عام لوگ کریں اور اس کی پہنچ عام آدمی تک ہو اور عام لوگ اُسے قبول کرتے ہوں۔

مقبول عام ادب کی تعریف مختلف محققین نے اپنے انداز سے کی ہے۔ ڈاکٹر رؤف پاریکھ مقبول عام ادب کی تعریف کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"maqbul; 1. popular, known, famous; chosenمقبول ; accepted, admitted; received; pleasing; grateful. ۲beloved مقبولِ خلائق / عام .very popular).fem (مقبولہ)" (۲۰).

شان الحق حقی، بہت سی زبانوں کے ماہر ہیں اور ادب کے حوالے سے ایک دقیق اور وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے کئی لغات اور فرہنگیں بھی مرتب کی ہیں۔ انھوں نے اپنی مرتبہ "فرہنگ تلفظ" میں مقبولِ عام ادب کی تعریف یوں کی ہے:

"مقبول: پسندیدہ جسے عام طور پر پسند کیا جائے، جن کا چلن یا مانگ ہو، قبولیت عام، مقبولیت۔ (۲۱)

"فرہنگ عامرہ" میں محمد عبداللہ خویشگی کی تعریف اس طرح سے ہے:

"قبول، قبول کیا ہوا، مانا ہوا"۔ (۲۲)

لفظ فکشن کو دیکھیں تو اس میں معنی کے کئی پہلو نظر آتے ہیں۔ اس میں ناول نگاری، افسانہ نگاری، ڈرامہ نگاری کو ایک تہذیبی معاشرے میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ فکشن کے حوالے سے عامر خاکوانی اپنی کتاب "زنگار نامہ" میں لکھتے ہیں کہ فکشن کے دو فائدے ہیں۔ یہ آپ کو پڑھنے کا عادی بناتا ہے۔ آپ نئے لفظوں سے روشناس ہوتے ہیں۔ آپ کو نئے خیال ملتے ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ آپ کو دوسروں کے ساتھ موافقت یا ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ آپ پڑھتے ہوئے اپنے تخیل کی مدد سے ایک دنیا تخلیق کرتے ہیں۔

فکشن ایک ایسی نثر ہے جس میں تخیلاتی منصوبہ بندی، حقیقی زندگی سے دوری اور خواب ناکی کے تمام عناصر پائے جاتے ہیں۔ مقبولِ عام ادب کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایسا ادب ہے جس میں عام لوگوں کی ذہنی سطح کو مدِ نظر رکھ کر عام قسم کا ادب تخلیق کیا جاتا ہے اور یہ ادب زیادہ سے زیادہ لوگوں کو تفریح فراہم کرتا ہے۔ مقبولِ عام ادب پہلے سے موجود ادب عالیہ سے استفادہ کرتا ہے۔ یہ ادب اپنے اندر کئی نئی تکنیکی سہولتوں کو بھی مدِ نظر رکھتا ہے اور اپنے اندر ایسی دلچسپی پیدا کرتا ہے جس سے لوگوں کی زیادہ تعداد اس طرف متوجہ ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش لکھتی ہیں:

"مقبول عام ادب ایک خاص طرز احساس کا حامل ہوتا ہے۔ وقتی طور پر قارئین کو جذباتی آسودگی پہنچاتا ہے۔ اپنے دور کے غالب رجحان، مسائل یا موضوعات کی ترجمانی کرتا ہے۔ ایسے ادب کی بنیاد قارئین کی پسندیدگی پر منحصر ہوتی ہے"۔ (۲۳)

مقبولِ عام ادب میں ایسی تحریریں شامل کی جاتی ہیں جنھیں ناظرین کی زیادہ تعداد پسند کرے اور جو عوام کے لیے لکھی جائیں۔ یہ تحریریں عوام ہی سے اخذ کی جاتی ہیں۔ مقبولِ عام ادب میں چونکہ فکشن ہی زیادہ

تر عوام کی دلچسپی کا حامل ہوتا ہے جس میں ناول اہم ہے۔ ناول کسی بھی شکل میں کیوں نہ ہو، خواہ اس میں جاسوسی کہانیاں ہوں یا جرائم کی کہانیاں یا پھر طنز و مزاح جیسی تحریریں۔ اس سب میں عوام کی دلچسپی معلوم ہوتی ہے اور تفریح کا سامان ملتا ہے۔ مقبولِ عام ادب میں جاسوسی ادب کو بھی اہمیت حاصل ہے اور یہ مقبولِ عام ادب کا اہم ترین موضوع ہے۔ ادبی منظر نامے کو دیکھا جائے تو مقبولِ عام ادب نے ادب عالیہ کو بھی نظر انداز کر دیا ہے کیونکہ آج کل زیادہ تر لوگ مقبول عام ادب کے دیوانے ہیں۔ محمد فیصل نے "ابن صفی شخصیت اور فن" میں مقبول عام ادب کی تعریف کچھ یوں کی ہے:

> "مقبول عام ادب ایسے ادب کو کہا جاتا ہے جو ہر دل عزیز ہو۔ نیز اس میں عمومیت انسانی، سماجی سے قریب ہو۔ عام معاشرے اور سماج کے مسائل آسان انداز میں بیان کیے جائیں۔ اس کے مرکزی کردار اسی معاشرے کا حصّہ ہوتے ہیں۔ یہ ادب عوام کے دل کی آواز ہوتا ہے اور اس کا بنیادی وصف یہ ہے کہ پڑھنے والا اسے اپنا انداز مانے۔ ادب کی اصطلاح میں مقبول عام ادب اس وقت سے انسان کا ساتھی ہے جب سے انسان نے بولنا، سوچنا اور لکھنا سیکھا۔ انسانی ترقی کے ساتھ ساتھ مقبول عام ادب بھی موضوعات اور کرداروں کے حوالے سے ترقی پاتا چلا گیا۔"(۲۴)

اگر دیکھا جائے تو ادب بھی دورویوں میں بٹا ہوتا ہے جو خالص تحقیقی ادب ہوتا ہے، وہ کبھی بھی عوام کی پسند نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ ہائی لیول کا ادب ہوتا ہے اور عوامی ادب میں ادب عالیہ کی بات نہیں ہوتی۔ یہ عوام میں بھی مقبول ہوتا ہے اور پسند کیا جاتا ہے کیونکہ اس کی سطح کا لیول عام لوگوں کی ذہنی سطح کے برابر ہوتا ہے۔ جاسوسی ادب، رومانی ادب شاید اس لیے بھی عوام میں مقبول ہوتے ہیں کہ اس کی نثری تحریر ایسے عام انداز میں ہوتی ہے، اسے عام لوگ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے تک ہمارے معاشرے کے لوگوں کو مقبول عام ادب پڑھنے کا شوق تھا کیونکہ وہ ایسی کہانیاں وقت گزاری کے لیے پڑھتے تھے اور پھر ان کے کرداروں کو اپنے آپ پر حاوی کرنا بھی ان کا شوق تھا۔ خواتین کے لیے شعاع، پاکیزہ، خواتین، کرن، حنا جیسے ڈائجسٹوں نے لکھنے اور پڑھنے والوں کے لیے نئی راہیں کھول دیں، مقبول عام ادب کو شاید اس لیے بھی مقبول عام ادب کا نام دیا جاتا ہے کہ لوگ اسے اپنی عام زندگیوں میں شامل کرتے ہیں۔

مقبولِ عام ادب میں کہانی کے ذریعے ایسی فضا تخلیق کی جاتی ہے جس میں مصنف اپنے کرداروں کے ساتھ کھیل سکتا ہے اور اُنہیں جیسا چاہے کہانی میں سمو دیتا ہے۔ دیکھا جائے تو مقبول عام ادب اردو زبان و ادب

کا اہم ترین حصّہ ہے اور ادب میں نکلنے والے ڈائجسٹوں اور مختلف رسالوں نے اُردو زبان کے علاوہ ادب کی بھی بڑی خدمت کی ہے۔

"عصری ادب اپنے پیش رَو ادب سے مکمل طور پر آزاد نہیں ہوتا نہ ہی اتنا ہم آہنگ ہوتا ہے کہ ایک عہد کا ادب دوسرے عہد کا سرمایہ قرار دیا جاسکے۔ عصری ادب اور ماضی کے تمام تر ادب کے مابین ادبی روایت کا ان دیکھا تعلق موجود ہوتا ہے۔ یہی وہ رشتہ ہے جو عصری ادب کی معنویت اور اس کے جواز کو قائم بھی کرتا ہے۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ کسی بھی زمانے کا ادب نہ تو ماضی کے ادب سے پوری طرح خود مختار ہوتا ہے اور نہ ہی اس کا پرتو"۔ (۲۵)

مقبولِ عام ادب کے متعین کیے گئے جو بھی معیارات ہمارے سامنے آتے ہیں اس میں مقبولِ عام ادب کا مصنف اور قاری دونوں ہی ان معیارات اور حدود کو اس میں قید نہیں کر سکتے۔ ان کا مقصد محض تفریح پہنچانا نہیں ہوتا بلکہ ان کا بنیادی مقصد قاری کے ذوق کی تسکین بھی ہے۔ مقبولِ عام ادب میں جو نثر لکھی جاتی ہے وہ عام طور پر پوری طرح جذبات پر مشتمل ہوتی ہے اور اس کا پہلا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ احساسات و جذبات کو ابھارا جائے۔ یہ نثری تحریر افسانہ، ناول کی صورت میں ہو سکتی ہے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایسا ادب ہے جو اپنی کہانی، پلاٹ اور کرداروں کے ذریعے قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔

"دنیا کی کوئی چیز بے ضرورت نہیں ہے۔ حدیث کی ضرورت اس لیے ہے کہ قرآنی توضیح کافی نہیں۔ فقہ، قرآن و حدیث میں "پراگندہ" احکام میں سے مطلوبہ چیز کو نکالا جاسکتا ہے۔ پھر ہر شخص کی سمجھ میں بھی فرق ہوتا ہے، اسی لیے مذاہب نکلتے ہیں۔ اہل قرآن اور اہل حدیث بھی نیک نیتی سے نکلے مگر نظر کی تنگی کی وجہ سے چل نہ سکے اور تفرقہ ہو کر رہ گئے"۔ (۲۶)

ادب کا مقصد حقیقت کی وہ تفسیر ہے جو ایک ادیب من و عن ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حقیقت سے عہدہ برآں ہونے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ انسانی زندگی میں تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں ان کو عملی طور پر دیکھا اور پرکھا جائے۔ دوسرے یہ کہ انسان ذہنی اور جذباتی فکروں کا بھرپور مطالعہ کر کے عملی طور پر معاشرے کی تبدیلیوں کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ اس طرح حقیقت تک پہنچنے کے

لیے ان دونوں حوالوں سے ہم آہنگی پیدا کی جا سکتی ہے۔ راجندر سنگھ بیدی نے ان حقیقتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ”آپ جزو کو کل سے زیادہ دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ یہ آپ کی شخصی فتح مندی ہے لیکن یہاں پہنچ کر ایسا نہ ہو کہ جزو ہی مقصد بن جائے جیسا ہمارے اگلے شعرا کا وطیرہ تھا۔ میں فن کے کمال کا اتنا قائل نہیں جتنا کہ فنکار کے کمال کا“۔ (۲۷)

چند ضروری اور غیر ضروری چیزوں میں تمیز اور سچ کو جھوٹ میں گڈمڈ کرنے سے ادب کی واضح تصویر کبھی بھی ہمارے سامنے نہیں آسکتی۔ اس لیے ادب کا مقصد حقیقت کے درمیان ایک ایسی مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کرنا ہے کہ جس سے تجربے کے معاملے میں ہمارے جتنے بھی ردِ عمل ممکن ہیں اُن میں نظم و ضبط پیدا کیا جائے۔ ایک منتشر مواد کو گرفت میں لایا جائے اور اس کی تفہیم اس طرح سے کی جائے کہ خارجی مواد کو ادب کے ذریعے ممکن الحصول بنانے کے عمل کو قطع و برید کے بعد پیش کیا جائے۔ اس حوالے سے قراۃ العین حیدر نے اس طرح سے بیان کیا ہے:

> ”مدھم سر اپنی تیزی عمل سے آنکھ کو نگر نگر اور شہر شہر اُڑائے لیے پھرتے ہیں۔ چاند نکلا تھا کہ اب ڈوب رہا ہے۔ صبح ہوئی کہ شام ہو گئی ہے۔ دن دیہاڑے چاندنی پھیلی ہے۔ اندھی اندھیری رات میں سورج جگمگا رہا ہے۔“ (۲۸)

انیسویں اور بیسویں صدی کے ادب کے حوالے سے اگر جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ مغربی ادب نے مشرقی ادب پر بہت سے اثرات مرتب کیے ہیں۔ مغربی ادیبوں نے ادب کی تعمیر و ترقی کے حوالے سے بہت سے سوال اُٹھائے تھے اور ان کے جوابات معاشرے پر چھوڑے تھے کہ اگر ان سوالات کا مناسب حل تلاش کر لیا جائے تو معاشرے کی ترقی میں وہ مسائل بہت سی رکاوٹوں کو دور کر سکتے ہیں۔ ایسے سوالوں کا اُٹھایا جانا کسی عام ادیب اور کے بس کی بات نہیں تھی کیونکہ اس کے لیے بہت بڑے حوصلے اور جرأت کا مظاہرہ کرنا تھا۔ جارج ایلیٹ جیسے بے باک ادیبوں کی سطح پر یہ سوالات اُٹھائے گئے تھے۔ یہ تحریکیں ادبی تحریکوں کے حوالے سے اُٹھائی گئی تھیں۔ اسی بات کا اظہار کرتے ہوئے رضی عابدی نے مغربی ڈرامہ اور جدید ادبی تحریکوں کے حوالے سے لکھا ہے:

> ”انیسویں صدی کا موڈ بنیادی طور پر استفسارانہ تھا۔ گو کبھی کبھی وہ اپنے زمانہ سے شاکی بھی تھے لیکن عام طور پر وہ اپنے ہی اُٹھائے ہوئے سوالوں کے جوابات

ڈھونڈنے میں کوئی دل چسپی نہیں رکھتے تھے۔ یقیناً ان میں کچھ مخلص اور جرأت مند لوگ بھی تھے مثلاً جارج ایلیٹ، جنھوں نے صورتِ حال کا جہاں تک ممکن ہو سکا سنجیدگی سے مطالعہ اور تجزیہ کیا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ انسان کی صورت حال قطعی طور پر المناک ہے۔ تاہم وہ اپنی تلاش میں منہمک رہے۔ ان مشکل سوالوں کے جواب ڈھونڈنے کی ذمہ داری بیسویں صدی پر پڑی"۔ (۲۹)

غیر ملکی ادب سے استفادے کی صورت اُسی وقت ہمارے سامنے آسکتی ہے جب اچھے ادب کے تراجم اپنی زبان میں پیش کیے جائیں اور ان تراجم کے حوالے سے بھی ترجیحات مقرر کی جائیں۔ ادب کے ایسے تراجم سے گریز کیا جائے کہ جن کے باعث معاشرے کو فائدہ نہ پہنچ رہا ہو۔ اس حوالے سے حقیقت نگاری کو فروغ دیا جائے۔ اس بات کا خیال رکھا جائے کہ کسی کلچر کا زوال قدرتی طور پر اس کے فن کے انحطاط میں ظاہر ہوتا ہے۔ ادب کا موجودہ انحطاط اور سماج کا تہذیبی تعطل اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ یہ نظام خیال ادب سے کس حد تک مماثلت رکھتا ہے۔ غیر ملکی ادب کے تراجم کے حوالے سے ڈاکٹر حمیرا اشفاق لکھتی ہیں:

"انگریزی اور فرانسیسی زبان سے ادبی سطح پر ۱۸۴۹ء سے شروع ہونے والے تراجم کا لامتناہی سلسلہ ہی زیر بحث لایا جا سکتا ہے۔ اُردو کے ناول نگار جن کے فن پر فرانسیسی ناولوں کے تراجم کے اثرات نمایاں ہیں، اُردو میں اس وقت تک وکٹر، ہیوگو، اناطول فرانس، وؤللٹیر اور بالزاک، پریم چند پر حقیقت نگاری، عزیز احمد پر فطرت نگاری، قرۃ العین حیدر، انیس ناگی اور انور سجاد کے فن میں وجودیت کے اثرات کا مطالعہ بآسانی کیا جاسکتا ہے"۔ (۳۰)

جس طرح انسان کے سماجی اور تہذیبی ارتقا کی دستاویز تاریخ نویسوں کے ہاتھوں مرتب ہو کر محفوظ ہو جاتی ہے، اسی طرح انسانی احساسات و جذبات اور جمالیاتی ذوق کی پوری داستان مختلف زبانوں کے شعر و ادب کے آئینے میں دیکھی اور پڑھی جاسکتی ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ شاعر اور ادیب کو انسانی معاشرے کا ضمیر بھی کہا جاتا ہے۔ کون ہے؟ کیا ہے؟ کیسے ہے؟ جیسے سوالات ایک مفکر ہی اُٹھا سکتا ہے۔ یہ سوچ اور فکر ایک عام انسان کے بس سے باہر ہے۔ بعض اوقات ایسے سوالات کے جوابات اُس مفکر کے ذہن میں ہوتے ہیں مگر وہ یہ بنیادی سوالات معاشرے کے سامنے رکھتا ہے تاکہ وہ اندازہ کر سکے کہ اس حوالے سے معاشرے

کی سوچ کیا ہے؟ "تاریخ ادبیات عالم" میں پروفیسر وہاب اشرفی نے اس حوالے سے تجزیہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"انسان کیا ہے؟ اس کو تمام مخلوقات میں کیا منصب حاصل ہے؟ اور انسان کے جذباتی اور جمالیاتی رویے کیونکر متعین ہوتے ہیں؟ ادیب، بنیادی طور پر ان سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کرتا ہے اور اس کوشش میں اخلاقی اقدار اور تہذیبی پیمانوں کو کبھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا۔ اس لیے کسی بھی زبان کے ادب کی تاریخ لکھنا دراصل انسانی وجود سے متعلق بعض بنیادی سوالات سے دوچار ہونے کے مترادف ہے"۔ (۳۱)

پروفیسر وہاب اشرفی آگے چل کر مزید لکھتے ہیں کہ معاشرہ کسی مفکر یا ادیب کے لیے ایک آئینے کی حیثیت رکھتا ہے جس میں وہ پورے معاشرے کا چہرہ دیکھتا ہے۔ ادب چونکہ معاشرے کا عکاس ہوتا ہے اس لیے ادبی نگارشات کے حوالے سے بات کرتے ہوئے بتاتے ہیں:

"ادبی نگارشات وہ منظر نامے ہیں جن کی روشنی میں انسانی اقدار کے ہمہ جہت پہلوؤں سے آشنائی ممکن ہے، ایک ملک کا ادب دوسرے ملک سے مختلف ہو سکتا ہے، بلکہ ہوتا بھی ہے لیکن متعینہ عہد کے حوالے سے مختلف قوموں اور ملکوں کے ادب عالیہ کا مطالعہ اور موازنہ ممکن بھی ہے اور مفید بھی۔ یہی سبب ہے کہ "تاریخ ادبیات عالم" ہمیشہ ہی ایک اہم ضرورت کا احساس دلاتی رہے گی۔ لیکن یہ کام بڑے جوکھم کا ہے، کون کرے اور کیسے کرے؟" (۳۲)

ادبِ عالیہ ہی وہ ادب ہے جو کسی معاشرے کو آسمانوں کی بلندیوں تک لے جا سکتا ہے۔ کیونکہ یہ ادب کی اعلیٰ اصناف اور وسیع تر معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ادب عالیہ کی تعریف لغات میں مختلف حوالوں سے کی گئی ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ادبِ عالیہ کس قدر وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح "علمی اُردو لغت" میں وارث سرہندی نے ادب عالیہ کی تعریف ان معنوں میں کی ہے:

"کسی زبان کا مستند سرمایہ جس کو ہمیشہ کے لیے بنیادی حیثیت حاصل ہو، اعلےٰ ادب کہلاتا ہے۔ یہ انگریزی لفظ Classic کا ترجمہ ہے۔

"مقبول کے معانی، قبول کیا گیا، مانا گیا، پسندیدہ، برگزیدہ، پیارا، محبوب"۔ (۳۳)

نامور محقق، نقاد اور قومی نصاب کمیٹی کے چیئرمین، ممبر محمد اسحاق جلال پوری، تاج محمد نے اپنی مرتبہ "درسی اُردو لغت" میں ادب عالیہ کے حوالے سے جو تعریف کی ہے وہ یہ ہے:

"مقبول: پسندیدہ، محبوب، پیار"۔ (۳۴)

تاریخ ادبِ اردو کے خالق، نامور محقق، نقاد اور مفکر ڈاکٹر جمیل جالبی نے "قومی انگریزی اردو لغت" میں ادب عالیہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ ادب جو سب کے لیے قابل قبول ہو اور کلاسیک کا درجہ رکھتا ہو۔ دونوں الفاظ کی الگ الگ تعریف کرتے ہوئے انھوں نے کچھ اس طرح سے وضاحت کی ہے:

Acceptable

"قابل قبول، اچھا، پسندیدہ، من بھاوتا، جو قبول کیے جانے کے لائق ہو، تسلی بخش، مناسب؛ کم سے کم تقاضوں پر پورا اُترنے والا (عسکری)، کسی اقدام کا یا اقدام کی قیمت پر جسے گوارا حدود کے اندر خیال کیا جائے"۔ (۳۵)

Classic

کلاسیک اعلیٰ درجہ کا مصنف یا ادبی فن پارہ خصوصاً یونانی یا لاطینی کوئی چیز جسے تقریباً مکمل معیار کا نمونہ سمجھا جائے۔ روایتی لحاظ سے معنی خیز یا واقعہ"۔ (۳۶)

یہ بات مشاہدے میں آئی ہے کہ ادب کے علاوہ بھی اگر غور کیا جائے تو معاشرے میں کسی چیز کی مقدار کو نہیں جانچا جاتا بلکہ اس کے معیار کے حوالے سے جانچ پرکھ کی جاتی ہے۔ اسی طرح ادب میں صرف معیار کو دیکھا اور پرکھا جاتا ہے۔ مقدار کے حوالے سے ادب کا جائزہ نہیں لیا جاتا۔ اگر غور کیا جائے تو بہت سے ایسے ادیب ہیں جن کی نگارشات بہت کم ہیں لیکن انھوں نے معاشرے میں وہ مقام حاصل کر رکھا ہے جو کسی بڑے ادیب کے حصّے میں بھی نہیں آیا۔ اس کی مثال اس طرح لے سکتے ہیں کہ احمد شاہ پطرس بخاری نے بہت کم لکھا ہے مگر خوب لکھا ہے۔ اس کے مقابلے میں بڑے بڑے ادیبوں اور نقادوں نے بہت زیادہ لکھا ہے مگر وہ احمد شاہ پطرس بخاری کا مقام حاصل نہیں کر سکے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے لکھنے والوں کو مقدار پر نہیں بلکہ لکھنے کے معیار پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سید عبداللہ اپنی کتاب "اشارات تنقید" میں لکھتے ہیں:

"اچھے ادب کی یہ خاصیت ہے کہ اس سے قاری یا سننے والا متاثر ہوتا ہے۔ اس پر وجد و تواجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور اس اثر کی وجہ یہ ہے کہ اس میں پاکیزہ

جذبات و خیالات بھی ہوتے ہیں اور اسلوب ایسا ہوتا ہے جس میں جذبے اچھی طرح رچے بسے ہوتے ہیں"۔ (۳۷)

کوئی بھی ادیب یا شاعر صرف اپنے زمانے کا نمائندہ نہیں ہوتا بلکہ وہ ہر زمانے اور ہر وقت پر نظر رکھے ہوئے ہوتا ہے۔ وہ حال میں رہتے ہوئے مستقبل پر نظر رکھتا ہے اور ماضی پر غور کرتا ہے۔ لہٰذا جو بات اس نے اس وقت کہی ہو وہ کتنے برس گزر جانے کے بعد بھی قاری ویسی ہی تازگی اور مسرت بخشتی ہے جو اُس وقت کے زمانے میں بخشتی تھی۔ حقیقی ادیب کی کہی ہوئی بات کبھی پرانی نہیں ہوتی بلکہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت اور بھی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اسی بات کو لون جائنس کے خیالات کے ساتھ جوڑتے ہوئے اس کی وضاحت ڈاکٹر سید عبداللہ نے یوں کی ہے:

"لون جائنس کے خیال میں عظیم ادب کی مزید شناخت یہ ہے کہ وہ قاری کو بار بار پڑھنے کے بعد بھی متاثر کرتا ہے اور اگر یہ تاثیر قارئین کے زیادہ وسیع حلقے میں یا کسی ادوار میں یا اس خاص زبان سے باہر دوسری زبانوں تک بھی محسوس ہو تو یقیناً وہ ادب عظیم ہو گا۔ جو ادب سب کو ہر وقت متاثر کرے واقعی ارفع ادب ہے"۔ (۳۸)

درج بالا گفتگو کے تناظر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اچھا ادیب زمانے کی ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد ہو کر ایسا ادب تخلیق کرتا ہے جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسے امر کر دیتا ہے۔ اس کے دل میں جو بات ہوتی ہے وہ بلا خوف و تردید سب کے سامنے اپنے لفظوں میں بیان کر دیتا ہے۔ وہ جانتا ہے حقیقت کو سامنے لانے کا نام ہی کلاسیکی ادب ہے۔

(د) پلپ فکشن

یہ اصطلاح انگریزی ادب سے آئی ہے۔ عورتوں کے فکشن کے طور پر یہ اصطلاح رائج ہوئی ہے۔ عورتوں کے فکشن کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو اس طرح کی اصطلاح سامنے آتی ہے تو اسے منفی پہلو سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ اس لیے کہ اس میں عورت کا کردار بڑا تقلیدی ہوتا ہے۔ سماجی طور پر ناسمجھ ہونا یا جنسی حوالے سے معصوم ہونا یا مردوں کی پیروی کرنے والی عورتیں دکھائی جاتی ہیں۔ اس میں ایک پہلو اور بھی ہے کہ اس صنف اردو ادب میں پلپ فکشن کو دیکھنا پڑے گا۔ یہ ادب ایک مکالمے کے طور پر اعلیٰ ادب سے جڑا ہوا ہے جسے اُس سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ ایک کڑی کی طرح جڑا ہوا ہے۔ اس کے لکھنے والے اور اعلیٰ ادب

کے لکھاری ایک دوسرے سے سیکھتے ہیں۔ ان کہانیوں میں شاید ایک جھلک ان کہانیوں کی بھی ملتی ہے جو ہمارے یہاں عورتوں (انیسویں صدی میں) کی ایک روایت کے طور پر سامنے آتی ہے (جہاں مختلف آوازیں ہوتی ہیں) کہانی کے اندر ایک نقطۂ نظر نہیں ہوتا، کیونکہ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں لکھنے کا جو نیا طریقہ رائج ہوا جس میں لکھنے کا انداز بدل گیا۔ ان کہانیوں میں وہ پرانی جھلک بھی ملتی ہے جہاں ان کہانیوں کو پرکھنے کے لیے ہمیشہ سماجی تنقید اور اخلاقی اصلاح کے طور پر نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ کہ یہ ان آوازوں کی مانند ہیں جو ہمارے شریف گھرانوں کے اندر سڑک سے چلی آتی ہیں۔ مردانہ آواز کے ذریعے ان کو کچلنے کی کوشش کی گئی وہ جھلک ان کہانیوں میں کبھی کبھار نظر آجاتی ہے۔ وہ آوازیں جن پر اب تک ہماری رسائی نہیں ہو رہی تھی اس ادب میں جس کو ادبِ عالیہ کہا جاتا ہے۔ اس میں عورتوں کی کہانیاں مقبول عام ہوئیں۔ عورتوں کو مظلوم بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اصل میں ان کہانیوں میں فراریت کو بھی بیان کیا جاتا ہے۔ اس کو رجحان مندانہ فعل بھی کہا جا سکتا ہے۔ عورتیں اپنے روزمرہ مسائل کو چھوڑ کر ان کہانیوں کی طرف کیوں رجوع کرتی ہوں گی۔ اپنی گھریلو مصروفیات سے وقت نکال کر وہ ان کہانیوں کو پڑھاتی یا پڑھتی ہوں گی۔ ہو سکتا ہے ان کہانیوں کو پڑھ کر ان کو سکون ملتا ہو۔ ان کہانیوں کو رجعت پسند اور ترقی پسند نظر سے نہ دیکھا جائے۔ سیاست اپنی جگہ لیکن سب سے پہلے یہ پتا ہو کہ عورتیں چاہتی کیا ہیں؟ یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ کہانیاں اصل میں کیا کہہ رہی ہیں اور یہ مقبول کیوں ہیں؟ علامہ راشد الخیری ایک رسالہ "عصمت" شائع کرتے تھے، ایک رسالہ "خاتون" نکالا کرتا تھا۔ ان کی کہانیوں میں اصلاحی پہلوؤں کو نمایاں کیا جاتا تھا۔ خدیجہ مستور، رشید جہاں، ہاجرہ مسرور، عصمت چغتائی، قراۃ العین حیدر، اس کے بعد رضیہ بٹ جیسے لوگ بہت مقبول ہوئے۔ ساٹھ اور ستّر کی دہائی میں خواتین کی تعلیم کی شرح بڑھی۔ اس میں ڈائجسٹ کے کلچر کو بھی اہمیت حاصل ہوئی۔ پلپ فکشن کی وضاحت کچھ اس طرح سے بھی ملتی ہے:

"The pulps, as pulp fiction was also called, descended from an earlier type of cheap magazine popular in the 19th century: penny dreadfuls and dime novels.

The word pulp in the designation refers to the cheap wood pulp paper on which the magazines were printed. The covers, usually of better stock, attracted readers with

lurid pictures of space aliens and damsels in distress. The magazine edges were untrimmed and ragged. More expensive magazines, aimed at the affluent middle class, were called slicks or glossies because of the more expensive stock they were printed on[۳۹]."

مغرب سے آیا ہوا پلپ فکشن اپنے اندر بہت وسیع تناظر میں ایک الگ پس منظر رکھتا ہے۔ انیسویں صدی میں یورپ اور امریکہ میں اس کی مقبولیت تھی اور اس میں صرف عورتوں کے رومانوی ناول شامل نہیں تھے بلکہ بنیادی طور پر جو لکھا گیا وہ مردوں نے لکھا۔ اس میں غیر ضروری سائنس فکشن اور جاسوسی ادب کا احاطہ کیا جاتا تھا۔ بلکہ پلپ فکشن کے نام سے ایک کالم بھی بنا ہوا تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں اس کا تعلق صرف خواتین کے ساتھ جوڑنا درست نہیں ہے۔ فیاض ایڈووکیٹ کے ناول "انور" اور "شمیم" وغیرہ کے علاوہ خواص نے سماجی اور معاشرتی مسائل کی عکاسی کی۔ ان میں اے آر خاتون صفِ اوّل کی لکھنے والیوں میں شامل ہوتی ہیں۔ انھوں نے جس طرح تہذیب کا احاطہ کیا ہے، آنے والی خواتین کو بھی نئی راہ دکھائی ہے۔ واجدہ تبسم، عصمت چغتائی اور رام لعل کو عالمی ڈائجسٹ میں جگہ دی گئی۔ پلپ فکشن کو ادبی دائرے میں لانے کے لیے ان لوگوں نے بہت مدد کی جس سے لوگوں کا ذوق بلند ہوا۔ پلپ فکشن کا جڑاؤ عالمی ادب کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ قراۃ العین حیدر نے سائنسی فکشن بھی لکھے۔ سائنسی فکشن اگر کسی اور گمنام بندے نے لکھے ہوئے ہوں تو اُسے پلپ فکشن کہا جاتا ہے۔ محققین نے پلپ فکشن کی تفصیلی وضاحت یوں کی ہے:

☆ ایک نرم، گیلے، بے ساختہ بڑے پیمانے پر شائع ہونے والا مواد۔
☆ کسی پھل کا نرم مانسل حصہ۔
☆ کاغذ سازی میں مستعمل ریگوں یا لکڑی سے نکلے ہوئے ریشوں کے نرم گیلے اجزا۔
☆ دانتوں کی اندرونی گہا اور جڑ کی نہروں کو بھرنے والے ویسکولر ٹشو۔
☆ پلورائزڈ ایسک پانی میں ملا ہوا۔
☆ مشہور یا سنسنی خیز تحریر جسے عام طور پر ناقص معیار کی حیثیت سے سمجھا جاتا ہے۔
☆ نرم، بے شکل وسیع پیمانے پر کچل دیں۔
☆ مارکیٹ سے (اشاعت) واپس لائیں اور کاغذ کو ری سائیکل کریں۔

☆ کسی کو بری طرح سے پیٹا۔

☆ کوئی نرم یا ناپاک ماس۔

☆ ایک پھل کا ایک نرم نم حصہ۔

☆ سیلولوز ریشوں کا ایک مرکب۔

☆ ناقص معیار کے کاغذ پر چھپنے والا ایک سستا رسالہ۔

☆ دانت کا نرم اندرونی حصّہ۔

☆ جیسے گویا پھل سے گودا کو ہٹا دیں۔

☆ گودا کو کم کرنا۔(۴۰)

پلپ فکشن کو مقبولِ عام فکشن کہیں گے۔ مقبولِ ادب معیاری ادب ہوتا ہے یا نہیں یا معیاری ادب کو مقبول ادب بھی کہا جا سکتا ہے یا نہیں؟ معاشرے میں ہر طرح کے گروہ ہیں اور ہر گروہ کے مختلف نفسیاتی مسائل ہیں جن کی وہ گروہی سطح پر تسکین چاہتا ہے۔ انیسویں صدی میں اپنی روایتوں سے جو منحرف ہو گئے وہ بھی نظام تعلیم تھا۔ وہ سسٹم توڑ دیا گیا اور جو نیا سسٹم بنا اُس کی وجہ سے ہمارے ہاں بہت مشکلات پیدا ہوئیں۔ ۱۹۳۶ء میں ہماری ادب کے ساتھ وابستگی زیادہ نظر آنا شروع ہوئی۔ اس سے پہلے ادب کے لوگ کم تھے۔ (ابن صفی۔ شفیق الرحمن)

ڈائجسٹوں نے اعلیٰ ادب کو بھی مقبولِ عام ادب کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ ادب میں جو بھی تراکیب وضع ہوئی ہیں، ہر ترکیب کا تہذیبی اور تاریخی پس منظر ہوتا ہے۔ اگر اس کو ویسے ہی اٹھا کر کسی اور جگہ پر لگا دیا جائے تو ایسے ہی مسائل درپیش ہو سکتے ہیں۔

پلپ دراصل ایک نرم بغیر کسی شکل کے مادہ ہے۔ کوئی رسالہ یا کتاب جس میں لوریڈ شامل ہے۔ کسی نامکمل کاغذ پر چھپا ہوا مواد پلپ کہلاتا ہے۔ پلپ (گودا) ادب کیا ہے؟ دراصل یہ ایک نچلی سطح کا ادب ہے۔ جیسا کہ کسی بھی تحریر کی نام نہاد اعلیٰ ادبی شکلوں سے متصادم ہے۔ گودا کم قیمت والے ناولوں، اوقات، مدھر اور دلچسپ افسانوں کی نام نہاد شکل ہے کیونکہ ان کی قیمت بھی کم ہوتی ہے۔

۱۸۶۰ء میں ایرستس اور ارون بیڈل نے پہلا ناول شائع کیا اور این اسیٹیفر مالیسکا، وائٹ ہنٹر کی ہندوستانی بیوی نے اس طرح کی داستانوں میں ایسے ہی موضوعات کو شامل کیا جن میں رومانس، لالچ، سفید فام،

تاریخی واقعات اور پر تشدد کارروائی جیسے موضوعات قابلِ ذکر تھے۔ اس کے علاوہ ان میں کچھ خانہ جنگی کے حالات وواقعات بھی شامل تھے۔

انیسویں صدی کے آخر تک مرد وخواتین زیادہ تر ٹائمز ہی پڑھتے تھے۔ اس میں ناشر مردوں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا گیا۔ یہ بھی خیال کیا جا سکتا ہے کہ کچھ تبدیلی ریکنگ کی وجہ سے بھی ہو سکتی تھی۔ انیسویں صدی کے آخر میں نئی مردانگی کی طرف زور دیا گیا جس میں نسائی اور جذباتی پن کو ابھارا گیا۔ اس سے پہلے انسان دوستی کو زیادہ سنجیدگی سے لیا جارہا تھا اور اسی کی تشکیل کردہ دیگر خصوصیات میں ماؤں، بہنوں اور بیویوں کے اثرات سے متعلق ایک صنف "نیلی کتاب" سامنے آئی جس میں ایک سستے قسم کا ہار تھا جس کا پس منظر گودا (لاطینی گودا گوشت) تھا، اس نے ابتداء میں ہی خاصی شہرت حاصل کر لی تھی۔

بیسویں صدی میں گودا کی تعریف اس طرح کی جانے لگی کہ کوئی ایسی تحریر جو سستی لکڑی کے گودا کاغذ پر چھپی ہوئی ہو، اس کو پلپ (گودا کہا جاتا ہے)۔

اس صنف کو پائی کا جان نشین سمجھا جاتا تھا۔ "وفناک اور ڈائم نامل" "بیتی ڈریڈ فلز چونکہ ایک برطانوی رجحان تھا جو ۱۸۰۰ء میں مقبول تھا۔ اس نے ہر طرح کی کہانیاں پیش کیں جن میں عشقیہ، رومانوی اور دل پھیرنے کی دلچسپ کہانیاں شامل تھیں۔ گودا پلپ فکشن نے مڈل کلاس اور کام کرنے والے لوگوں کو سستی تفریح فراہم کی اور اس کی قیمت باقی ناولوں کی نسبت کم تھی۔

گودا افسانے زیادہ تر موٹے ہوتے تھے اس کے الفاظ کا سائز بھی زیادہ بڑا ہوتا تھا۔ پلپ فکشن میں عام طور پر مختصر کہانیاں شامل کی جاتی تھیں۔ لیکن کبھی کبھار ناولوں کے نچوڑ کو بھی شامل کیا جاتا تھا۔ گودا جو کہ عموماً ردی کی ٹوکری میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ گودا میں فحش، نرم، تصوراتی مواد شامل کیا جاتا ہے۔ اس کی مقبولیت کی وجہ سے اِسے "ریڈرز آف ڈیوسٹ آف فکشن" بھی کہا جاتا ہے۔

۱۹۲۰ء کی دہائی میں دوسو سے زیادہ گودا رسائل تھے جن کی بنیاد فرینک منسی ارگوسی نے رکھی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی اور مشہور مثالیں بلیک ماسک، ڈائم جاسوسی، سنسنی خیز جاسوسی اور جاسوسی میگزین کہانیوں میں ایک بڑا حصّہ سائنس فکشن کا بھی ہے۔

"Pulp Fiction is a 1994 American black comedy, crime film directed by Quentin Tarantino, who co-wrote its screenplay with Roger Avary. The film is known for its

eclectic dialogue, ironic mix of humor and violence, nonlinear storyline and a host of cinematic allusions and pop culture references. The film was nominated for seven Oscars, including Best Picture; Tarantino and Avary won for Best Original Screenplay[۴۱]."

اُردو ادب میں رسائل کا کردار

اُردو زبان و ادب کے فروغ میں ادبی رسائل نے ہمیشہ اہم اور بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ ادبی رسائل انسان کی ذہنی تربیت اور اسے متحرک رکھنے کا ایک اہم ذریعہ بھی ہیں۔ ادبی رسائل کی اہمیت موجودہ دور میں اور بھی بڑھ گئی ہے کیونکہ نئے تخلیق کار اپنی تخلیقات کو منظر عام پر لانے اور عوام الناس میں متعارف کروانے کے لیے ادبی رسائل کا ہی سہارا لیتے ہیں۔ اس طرح نئے لکھنے والوں کے نئے تجربات ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اس لیے کہہ سکتے ہیں ادبی رسائل ہماری زندگی میں بیک وقت اہم معلومات فراہم کرنے ساتھ ساتھ علم کے خزانے کے طور پر بھی کردار ادا کرتے ہیں۔ ادبی رسائل نئے لکھنے والوں کے خیالات کو پروان چڑھاتے ہیں اور نئی نسل کی میراث آنے والی نسلوں کو سونپ دیتے ہیں۔ یہ رسائل صرف زمانہ حال کی ہی ترجمانی نہیں کرتے بلکہ آج کا ادب مستقبل میں ماضی کا حصّہ شمار کیا جاتا ہے۔ اگر کسی معاشرے کی اقدار کا اندازہ کرنا ہو تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ ان کے ہاں کس معیار کے ادبی رسائل شائع ہوتے تھے اور یہ رسائل قارئین میں کس حد تک مقبول تھے۔ ادبی رسائل کے آغاز کے حوالے سے ڈاکٹر انور سدید کا کہنا ہے کہ

> "برصغیر میں ادبی رسائل انیسویں صدی میں شائع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ادبی صحافت کی طرف پہلا قدم مولوی محمد باقر نے اُٹھایا تھا جو مولانا محمد حسین آزاد کے والد گرامی اور "دہلی اُردو اخبار" کے مدیر تھے۔ لیکن ادبی جریدہ نگاری کو فروغ ماسٹر رام چند اور سرسید احمد خان نے دیا جو ادیب بھی تھے اور قوم کے معلم بھی۔ رسالہ "فوائد الناظرین" ماسٹر رام چندر کی روشن خیالی کا اور "تہذیب الاخلاق" سرسید کی کشادہ فکری کا نقیب تھا۔ اس بامعنی ابتدا کو میر ناصر علی دہلوی، عبدالحلیم شرر اور حسرت موہانی نے فکر انگیز اور مثبت جہت دی۔ انھوں نے "صلائے عام"، "دل گداز" اور "اُردوئے

معلٰی" جیسے رسائل سے نہ صرف ادب کو مائل بہ ارتقاء کیا بلکہ ان سے قوم کی ذہنی، فکری، تہذیبی اور ادبی رہنمائی کا فریضہ بھی سرانجام دیا"۔ (۴۲)

بیسویں صدی کے آغاز میں ادبی رسائل نے ایک نئے جذبے اور ولولے سے اپنا حصّہ ڈالا تو اس فہرست میں کئی اہم رسائل شامل ہونا شروع ہوگئے جن میں "ستارہ صبح"، "زمانہ"، "الہلال"، "ادبی دنیا"، "ساقی"، "شاہکار"، "ہمایوں" اور "نگار" وغیرہ شامل ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد ادبی رسائل میں اور اضافہ ہو گیا اور کچھ نئے رسائل سامنے آئے جن میں "سویرا"، "نقوش"، " نیا دور"، "سیارہ"، "سیپ"، "فنون" اور "اوراق" جیسے اہم رسائل منظر عام پر آئے جن کے باعث فروغِ ادب میں اضافہ ہوا اور ایک نئے رُخ سے معاشرے کی تعمیر شروع ہوئی۔ ان ادبی رسائل کی کامیابی کا سہرا ان رسائل کے مدیروں کے سر ہے کیونکہ انھوں نے ادب کو زندگی کی سب سے بامعنی سرگرمی قرار دیتے ہوئے معاشرے کی تعمیر کو اپنا فرض سمجھا۔

ادبی رسائل، ڈائجسٹوں کی ضرورت واہمیت

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر انسان اپنی زندگی میں اس قدر مصروف ہے کہ اس کے پاس وقت بہت کم ہے اور وہ اسی کم وقت میں بہت سی چیزوں کے بارے میں معلومات حاصل کر کے اپنے علم میں اضافہ کرنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب میں ڈائجسٹ کے فروغ وارتقا میں یہی حقیقت کارفرما تھی کہ کم سے کم وقت میں آج کے مصروف انسان کو وسیع تر ذخیرہ علوم، ادب، ایجادات، مسائل، رجحانات اور تحریکوں کے بارے میں بھرپور آگاہی فراہم کی جائے۔ مسئلہ یہ تھا کہ تمام علوم وفنون کا بیک وقت مطالعہ کرنا انسان کے لیے بہت مشکل تھا۔ اس لیے یہ بات شدت سے محسوس کی گئی کہ اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی مناسب حل نکالا جائے تاکہ کم وقت میں انسانی علم میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کیا جاسکے۔ پاکستان میں ادبی رسائل نے علمی، تاریخی اور تحقیقی حوالے سے بہت خدمات انجام دی ہیں۔ سرسید احمد خان نے اپنے عہد میں قوم کو نئی تہذیب سے متعارف کرانے کے لیے ادب کو وسیلہ اظہار بنایا تو اپنے خیالات عوام الناس تک منتقل کرنے کے لیے "فوائد الناظرین" اور "تہذیب الاخلاق" جیسے اہم ادبی رسائل کو اظہار کا ذریعہ بنایا۔ سرسید کی یہ تحریک اتنی کامیاب ہوئی کہ پورے برصغیر میں ادبی جریدہ نگاری کو فروغ دینے کے لیے اسے ایک مشن کے طور پر اپنایا گیا۔ اس کے بعد حسرت موہانی، وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی تک جو بھی اہلِ قلم اس تحریک میں شامل ہوئے، انھوں نے ادبی

جریدہ نگاری کی اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے رسائل کی صورت میں اپنا حصّہ شامل کیا۔ اس کے بعد کئی ایک ادبی شخصیات نے مختلف علمی و ادبی رسائل شائع کرنے شروع کیے جن میں "ادبی دنیا"، "ساقی"، "نیا دور"، "فنون"، "سیپ" اور "اوراق" جیسے اہم رسائل کو بہت پذیرائی حاصل ہوئی اور ان کے مدیروں نے اردو ادب کو ایک مخصوص رُخ دینے کے حوالے سے بڑے اقدام کیے۔ تحریک آزادی سے پہلے کم ضخامت کے ماہانہ رسالوں کا رواج تھا مگر تحریک آزادی کے بعد ضخیم ادبی رسائل کو فروغ حاصل ہوا۔ ان میں "سویرا"، اور "نقوش" کے خاص نمبروں نے ادبی دنیا میں ایک پوری لائبریری کی شکل میں ادب کی خدمت کو اپنا شعار بنایا۔ ان رسائل کے باعث قاری کو بیک وقت ایک ہی شمارے میں بہت سا مواد میسر آنا شروع ہو گیا۔ اگر تعلیمی اداروں میں ادبی رجحانات کی بات کی جائے تو انھوں نے بھی اپنا بھرپور حصّہ شامل کیا۔

> "تعلیمی اداروں کے مجلوں کا رجحان اب اشاعت ادب کی طرف زیادہ ہو گیا ہے۔ بیشتر رسائل اگرچہ سال میں ایک آدھ مرتبہ ہی چھپتے ہیں تاہم ان میں نامور اور ممتاز ادبا کی تخلیقات حاصل کر کے پیش کی جاتی ہیں اور یوں طلبہ کی تربیت کے مواقع پیدا کر لیے جاتے ہیں۔ ان میں "راوی"، فاران، محور اور علم و آگہی کو اعزاز حاصل ہے کہ ان کے بعض شمارے خصوصی موضوعات پر شائع ہوئے اور اب انہیں حوالے کی کتابوں کا درجہ حاصل ہے"۔ (۴۳)

ڈائجسٹ سے مراد بہت سے جرائد میں شامل کلاسیک تحریروں کو اکٹھا کر کے یا ڈائجسٹ کر کے ایک ہی جریدہ کی صورت میں زیادہ سے زیادہ معلومات شامل کی جاتی ہیں تا کہ اس سے وقت کی بچت ہو سکے اور زیادہ سے زیادہ معلومات بھی قارئین کو فراہم کی جا سکیں۔

ڈائجسٹ (Digest) کے لغوی معنی تو بہت سے ہیں مگر عام طور پر ڈائجسٹ کے جو معنی مراد لیے جاتے ہیں ان کا تعلق تحریر کے ساتھ گہرا ہوتا ہے۔ اس لیے عام طور پر ادبی حوالے سے ڈائجسٹ کو ان معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے جو ادبی تحریروں کے بہترین انتخاب پر مشتمل ہوں۔ ممتاز ادبی محقق ڈاکٹر رؤف پاریکھ نے "اوکسفرڈ اُردو انگریزی لغت" میں ڈائجسٹ کی تعریف کچھ اس طرح سے کی ہے:

> "Digest (غذا کو) ہضم کرنا۔ ۲۔ کسی بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرنا۔ ۳۔ کیمیا (کسی مادّے کو) حرارت پہنچا کر یا خامرے یا محلل کی آمیزش سے گلانا: ست نکالنا، جوہر نکالنا۔ ۴۔ (الف) اختصار کرنا، مختصر، عام فہم یا مرتب صورت میں لانا

(ب) ذہن میں پکانا، غور و فکر کے ذریعے کسی بات کو ذہن میں مرتب کرنا یا جمانا۔
اسم /dardzest/ ا۔ (الف) خلاصہ، خصوصاً قوانین کا (ب) (the Digest)
روما کے قوانین کا ضابطہ جو جسٹی نین (چھٹی صدی عیسوی) کے دور حکومت میں
مرتب کیا گیا تھا۔ ۲۔ معاصر اخبارات یا ادب کا خلاصہ، انتخاب، مختصر مجموعہ۔"(۴۴)

ادبی حوالے سے ڈائجسٹ کا لفظ تحریر کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ اس میں ادبی تحریروں کی تلخیص پیش کی جاتی ہے۔ انگریزی میں اس کی تعریف ان الفاظ میں کی جاسکتی ہے۔(A compilation or summary of material or information)ڈائجسٹ میں پیش کی جانے والی تحریروں کا آغاز پہلے پہل بیسویں صدی کی اولین دہائیوں میں یورپ سے ہوا۔ اس کے تحت بہت سے اہم رسائل ڈائجسٹ کی صورت میں شائع ہونا شروع ہو گئے۔ ان میں اس وقت کی بہترین تحریروں کا انتخاب کر کے شائع کیا جاتا تھا۔ ڈائجسٹ کا رواج سب سے پہلے یورپ میں بیسویں صدی کی اولین دہائیوں میں ہوا تھا جن میں سب سے پہلے منظر عام پر آنے والے ڈائجسٹ (The English and Empire Digest) کو شمار کیا جاتا ہے جو ۱۹۱۹ء میں شائع ہونا شروع ہو گیا تھا اور اس میں زیادہ تر قانونی مقدمات کے حوالے سے تحریروں کا ایک انتخاب شائع کیا جاتا تھا۔ ڈائجسٹ کا اجراء چونکہ انگریزی رسائل و جرائد سے زیادہ تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے محققین نے اس کی تعریف بھی اپنے اپنے انداز میں کی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی "قومی انگریزی اُردو لغت" میں ڈائجسٹ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہضم کرنا؛ تحلیل کرنا؛ پچانا؛ غذائی نالی میں خوراک یا مشروب کو ایسی حالت میں تبدیل کرنا جو بدنی بافتوں میں جذب ہو جائے؛ سلیقے سے ترتیب دینا؛ ذہن نشین کرنا؛ پوری طرح غور کرنا؛ آسانی سے مشاورت یا مطالعے کے لیے ترتیب دینا؛ جماعت / صنف / قسم بندی کرنا؛ تلخیص کرنا؛ خلاصہ تیار کرنا؛ اختصار کرنا۔ (کیمیا) نرم کرنا؛ تحلیل کرنا یا تیار کرنا جیسے حرارت، نمی یا کیمیائی مادوں سے۔ (مجازاً) صبر سے یا سعی کر کے برداشت کرنا؛ پی جانا؛ سہہ جانا۔ (فعل لازم) ہاضمے سے گزرنا، جیسے خوراک کا؛ خوراک یا مشروب ہضم ہونا / تحلیل ہونا۔ (کیمیا) حرارت، نمی یا کیمیائی مادوں کے ذریعے تحلیل ہونا۔ (اسم) ادبی یا علمی مواد کا مدون شدہ مجموعہ جو اکثر مختصر یا تلخیص کردہ ہوتا ہے؛ ڈائجسٹ؛ خلاصۂ مضامین؛ مجلّہ۔ (قانون) مجموعۂ

قوانین؛ تلخیص کردہ قوانین کا مجموعہ؛ مجلہ قوانین؛ قوانین یا عدالتی فیصلوں کی تالیف یا خاکہ جو باقاعدہ طور پر مرتب ہو"۔(۴۵)

ڈائجسٹ کے آغاز کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ "ریڈر ڈائجسٹ" شاید واحد شمارہ تھا کہ جو امریکہ کے شہر نیویارک سے فروری ۱۹۲۲ء میں ڈیوٹ ویلس اور اس کی بیوی لیلا بیل ویلس نے مختلف موضوعات پر عوام کی پسندیدہ تحریریں جمع کر کے ایک ساتھ شائع کیں۔ وہ بڑی بڑی تحریروں کو شائع کرتے وقت مختصر بھی کر دیتے تھے تا کہ قارئین کے وقت کی بچت کی جا سکے۔ اس طرح "ریڈر ڈائجسٹ" کو دنیا کا پہلا ڈائجسٹ شمار کیا جا سکتا ہے جس نے اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں عوامی سطح پر بہت مقبولیت حاصل کی۔

مغرب میں ڈائجسٹ، رسائل کے فروغ کے حوالے سے بنیادی طور پر یہ حقیقت کار فرما تھی کہ آج کا انسان دنیاوی معلومات، سائنس، ایجادات اور حالاتِ حاضرہ سے مستفید ہونا چاہتا تھا اور ان سب کے بارے میں جاننا اس کی دسترس میں نہیں تھا۔ مغرب میں ڈائجسٹ کی مثال انگریزی ڈائجسٹ "ریڈر" اس کی اہم اور زندہ مثال ہے۔ اس میں مختلف قسم کے مضامین کا خلاصہ، حالات حاضرہ، ملکی و غیر ملکی حالات کے ساتھ ساتھ غیر افسانوی نثر اور افسانوی نثر کو بھی شامل کیا جاتا تھا اور یہ ڈائجسٹ کثیر الاشاعت اور دنیا بھر میں پڑھا جاتا ہے۔ اردو میں بھی ایسے ہی ڈائجسٹوں کی ضرورت محسوس کی گئی جس کے ذریعے انسان اپنے علم اور معلومات میں اضافہ کر سکتا ہو۔ آزادی سے پہلے ہی یہ روایت سامنے آچکی تھی جس میں ماہ نامہ "ادبی دنیا" اور "ہمایوں" کے مدیر نے ایسے رسالے نکالے جن میں ادبی نوعیت کے مضامین شامل تھے اور ان رسالوں نے ادبی مضامین کی روش اختیار کی اور رسالوں کو نئی جہت سے روشناس کروایا۔ برصغیر میں جو بھی ادبی رسالے نکلا کرتے تھے اس زمانے میں اس کی اشاعت پچاس، ساٹھ ہزار تک ہوتی تھی اور باقی جو رسالے نکلا کرتے تھے ان کی تعداد بھی پانچ سے چھ ہزار تک ہوتی تھی۔ اس زمانے میں لوگوں میں ادب کا ذوق و شوق بھی تھا۔ حسن عسکری کا ایک مضمون ایک ماہ نامہ میں "جھلکیاں" کے نام سے شائع ہوتا تھا تو لوگ اس کا انتظار کرتے تھے۔ ان رسالوں میں ادب کی جہت کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی اور ایسی تحریریں شائع ہوتی تھیں جن کے شائع ہونے کے بعد پورے برصغیر میں بحث ہونا شروع ہو جاتی تھی۔ تحریریں پڑھنے کا رواج تو اب بہت حد تک کم ہو کر رہ گیا ہے۔ ڈائجسٹوں کی روایت اگرچہ ہمارے ہاں زیادہ پرانی نہیں ہے لیکن جس طرح سے ڈائجسٹوں کی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہے وہ بھی کسی تعریف کا محتاج نہیں۔ اُردو ڈائجسٹوں میں بلاشبہ بہت سارے ڈائجسٹ منظر عام پر آئے ہیں اور ان کی

تعداد میں بھی روز بروز اضافہ ہورہا ہے۔ شکیل زادہ کا ڈائجسٹ "سب رنگ" اس کو ایورسٹ کہا جا سکتا ہے۔ اس کی اشاعت اس زمانے میں ایک لاکھ تک ہوتی تھی اور ایسے دور میں جب لوگوں میں پڑھنے کا رجحان بھی کم ہو گیا ہو تو اتنی اشاعت کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ڈائجسٹوں میں اگر معیاری ڈائجسٹوں کی بات کی جائے تو بہت کم ایسے ڈائجسٹ ہوں گے جن میں ایسی اصناف کو شامل کیا جاتا ہو جو ادب کے لحاظ سے معیاری تصور کی جاتی ہوں۔ پاکستان بننے کے بعد جو ادبی ڈائجسٹ اپنی پہچان بنا سکے اِن کا شمار حقیقی معنوں میں معیاری ڈائجسٹوں میں کیا جا سکتا ہے۔ ان میں "اُردو ڈائجسٹ" جو کہ ۱۹۶۰ء میں نکلنا شروع ہوا تھا۔ اس ڈائجسٹ نے ان لکھنے والوں کو جگہ دی جو کہ ادب کے حوالے سے اپنی پہچان رکھتے تھے جن میں احمد ندیم قاسمی، زاہدہ حنا، افتخار عارف، پروین شاکر، مشتاق احمد یوسفی، بانو قدسیہ، ممتاز مفتی، مسعود مفتی کے علاوہ افسانے، سفرنامے، خاکے، آپ بیتیاں، ناقابل فراموش واقعات کے ساتھ ساتھ انھوں نے اسلامی تحاریر ملکی و غیر ملکی حالات حاضرہ کو بھی جگہ دی اور یہ ایک ایسا ڈائجسٹ ہے جو ابھی تک اپنی ساکھ برقرار رکھے ہوئے ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ اگر دوسرے ڈائجسٹوں کی بات کریں تو ان میں ماہنامہ "سیارہ" بھی اپنی نوعیت کا منفرد ڈائجسٹ ہے جس میں قسط وار ناول شائع ہوتے رہے۔ ماہنامہ "حکایت"، ڈائجسٹ بھی ایسا ڈائجسٹ ہے جس نے ایسی تحاریر شامل کی ہیں جن کا شمار ادبی تحریروں میں ہوتا ہے۔ باقی دوسرے ڈائجسٹوں نے بھی اپنا فونٹ چھوٹا کرتے ہوئے تین سو سے چھ سو صفحات تک کر دیے اور مختلف انواع و اقسام کی تحاریر کو اس میں جگہ دی جو کہ لوگوں کی دلچسپی کا سامان پیدا کرتے ہیں۔

پاکستان میں ڈائجسٹ کا فروغ وارتقاء

پاکستان بننے کے بعد بہت سے اہل علم نے ادبی رسائل کی داغ بیل ڈالی اور سب سے پہلے پاکستان میں ڈائجسٹ کے اجراء کے حوالے سے مولانا حسرت موہانی کے بھائی متین موہانی نے کام شروع کیا لیکن ان کا ڈائجسٹ مالی مشکلات کا شکار ہو گیا اور بہت جلد انھیں بند کرنا پڑا۔ اس کے بعد کم و بیش دس سال بعد پاکستان سے دوسرا ڈائجسٹ ۱۹۵۷ء میں جاری ہوا جس میں اعجاز حسین قریشی، الطاف حسین قریشی اور ملک ظفر اللہ خان نے "اُردو ڈائجسٹ" کے نام سے ایک ڈائجسٹ کا اجرا کیا۔ اس وقت ملکی صورتِ حال یہ تھی کہ پاکستان کے بہت سے حلقوں سے مذہبی و سیاسی جماعتوں کی اسلامی جماعت کے ساتھ وابستگی تھی جس کے باعث

ڈائجسٹ کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۹۶۰ء میں اس ڈائجسٹ نے کامیابی حاصل کی اور باقاعدگی سے مارکیٹ میں آنے لگا۔ ۱۹۶۱ء میں ڈائجسٹ کی ٹیم میں عنایت اللہ جیسے سینئر لوگ شریک ہوئے اور انھوں ایک اور ڈائجسٹ "سیارہ" کے نام سے منظر عام پر لانے کا ارادہ کیا۔ ان دونوں ڈائجسٹوں کا مشن تھا کہ سبھی مکتبہ ہائے فکر کے خیالات کو مربوط صورت میں عوام الناس کے سامنے پیش کیا جائے۔ یہی وجہ تھی جنرل ضیا الحق کے دور حکومت میں ان ڈائجسٹوں کو ان کی پالیسوں کی وجہ سے حکومت کی حمایت بھی حاصل رہی۔ اس ٹیم میں شکیل عادل زادہ نے بہت معاونت کی اور سجاد حیدر یلدرم، منشی پریم چند، منٹو، بیدی، کرشن چندر، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر اور بہت سے نامور ادیبوں کی تحریریں شامل ہوا کرتی تھیں۔ اس کے ساتھ عالمی ادب سے انتخاب بھی ان ڈائجسٹوں کی زینت بنتے تھے۔ ان میں نئے لکھنے والوں کا خاص خیال رکھا جاتا تھا اور انھیں مناسب جگہ دی جاتی تھی۔ شکیل عادل زادہ نے جون ایلیا سے الگ ہو کر اپنا نیا ڈائجسٹ "سب رنگ ڈائجسٹ" متعارف کرایا۔ اس میں شوکت صدیقی کا کلاسیکی ناول "جانگلوس" اسی ڈائجسٹ میں قسط وار شائع ہونا شروع ہوا۔ اس کے ساتھ ابن انشا کے بھائی محمود رمیض نے "خواتین ڈائجسٹ" کا اجرا کیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ پاکستان سے بہت سے ڈائجسٹ جاری کیے گئے۔ مرد لکھاریوں کے ساتھ ساتھ خواتین لکھاریوں نے بھی ڈائجسٹوں کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ محمد زاہد پرویز زاہد نے اس حوالے سے لکھا ہے کہ:

> "عمیرہ احمد اور نمرہ احمد جیسی خواتین لکھاریوں نے پالولر ادب کی وہ شکل استوار کر دی جس میں مذہب، سماج اور اس سے جڑی اخلاقیات کو مرکز بنایا جاتا ہے۔ خواتین کی مارکیٹ کو ٹارگٹ کرنے والے ڈائجسٹوں کے بعد دوسرے نمبر پر روحانی اور تیسرے پر جاسوسی و سسپینس چھاپنے والے ڈائجسٹ ہیں"۔ (۴۶)

۲۰۱۰ء کے بعد سے ایک بار پھر ڈائجسٹوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ پاکستان میں ڈائجسٹوں کا مستقبل روشن ہے۔ ادب ہی وہ واحد ذریعہ ہے جو کسی کلچر کو معاشرے میں فروغ دینے کا اہم وسیلہ ثابت ہو سکتا ہے۔ اس لیے ادب کو ثقافت کے ساتھ جوڑنے کی اشد ضرورت ہے۔ ادب اور کلچر کے باہمی رشتہ کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے کہ

> "ادب اور ہر تخلیقی سرگرمی کا تعلق براہِ راست نظام خیال سے ہوتا ہے۔ ہر نظام خیال اندرونی طور پر ایک مکمل اکائی ہوتا ہے جس کی اپنی مخصوص روح، مخصوص شخصیت اور مزاج ہوتا ہے۔ یہ روح اپنا اظہار، اپنے علوم، اپنے فلسفے، اپنے اداروں

اور اپنی متنوع تخلیقی سرگرمیوں کے ذریعے کرتی ہے۔ ہر تخلیقی سرگرمی ایک زندہ نظام خیال کی کوکھ سے جنم لیتی ہے اور نظام خیال کے انجماد کے ساتھ اپنے سارے تہذیبی اداروں اور اظہار کے سانچوں کے ساتھ خود بھی منجمد ہو جاتی ہے۔ ہمارے تہذیبی تعطّل اور بے معنویت کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا کلچر اور اس کے تہذیبی سانچے مغرب کے کلچر کے ہاتھوں اپنی مکمل فنا پر راضی نہیں ہو رہے ہیں۔ ایک طرف مغرب کا کلچر سائنسی ترقی کے ساتھ ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کو ہمارے اپنے نظام خیال کے تہذیبی دائرے سے باہر کھینچ رہا ہے اور دوسری طرف اس دائرے کی مرکزی کشش اسے اپنے اندر کی طرف کھینچ رہی ہے۔ اسی لیے ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ معطّل کھڑا ہے اور سارا سماج انتشار، تضاد، کش مکش، تصادم اور عدم توازن کا شکار ہے"۔ (۴۷)

کسی بھی معاشرے میں مثبت قدروں کا فروغ ضروری ہوتا ہے اور یہ قدریں صرف ادب کے ذریعے سے ہی نوجوان نسل میں پروان چڑھائی جاسکتی ہیں۔ یوں تو ادب کا ایک بہت بڑا ذخیرہ کتابی شکل میں بھی موجود ہے، لیکن بدلتے ہوئے تناظر میں ضرورت اس بات کی ہے کہ مثبت قدروں کی تجدید نو کے لیے ایسے اقدامات کیے جائیں جو فوری اور دیرپا نوعیت کے ہوں۔ اس لیے ہمیشہ ایسے رسائل کی ضرورت شدت سے محسوس کی جاتی رہی ہے جو نوجوان نسل میں فوری مثبت قدروں کو فروغ دیں۔ اس حوالے سے حکایت نے بھرپور طریقہ سے اپنی خدمات پیش کی ہیں۔ ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید نے لکھا ہے:

"حکایت نے فحاشی کے خلاف محاذ کھڑا کرنے کا دعویٰ بھی کیا اور اس محاذ پر اپنی جنگ ادب کے وسیلے سے لڑی "اُردو ڈائجسٹ" اور "سیارہ ڈائجسٹ" کی ادبی جہت کو "حکایت" نے بھی قائم رکھنے کی کوشش کی، چنانچہ "حکایت" میں ایسا ادب پیش کیا گیا جس میں افسانے جیسی چاشنی موجود تھی"۔ (۴۸)

انفرادی سوچ اور اجتماعی سوچ میں بہت فرق ہوتا ہے۔ جہاں ایک پورا معاشرہ مثبت سوچ کا حامل نہ ہو تو وہاں انفرادی سوچ کوئی معنی نہیں رکھتی۔ ایسے میں ضرورت اس بات کی ہے کہ پورے معاشرے میں مثبت سوچ کو اُجاگر کیا جائے اور انفرادی سطح سے ہٹ کر اجتماعی سوچ کے لیے پر ایسی کوششیں کی جائیں جن کے باعث معاشرے کی سوچ کو تبدیل کیا جاسکے۔ یہ کام اُس وقت ممکن نہیں ہو سکتا ہے جب تک مثبت سوچ

کے حامل تمام افراد کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا نہ کیا جائے۔ یہ کام صرف اور صرف معاشرے کا ادیب ہی سر انجام دے سکتا ہے۔ "سیارہ" ڈائجسٹ نے اپنے مشن کا آغاز ایسے ہی نامور ادیبوں کی تحریروں سے کیا اور اس کے ساتھ ان کے مثبت افکار کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے مختلف ادبی مذاکروں اور سیمیناروں کا بھی اہتمام کیا تاکہ معاشرے میں پیدا ہونے والی منفی قدروں کی حوصلہ شکنی کرتے ہوئے مثبت سوچ کو اُجاگر کیا جا سکے۔ اس کی وضاحت ڈاکٹر انور سدید نے بھی کی ہے:

> "سیارہ" نے اجتماعی سوچ ابھارنے اور فکر و خیال کو متنوع زاویوں سے اُجاگر کرنے کے لیے ادبی مذاکروں کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ چنانچہ "ادب اور فحاشی" کے موضوع پر مذاکرے میں ڈاکٹر عبد السلام خورشید، نعیم صدیقی، پاشا رحمن، فضل من اللہ اور انور سدید نے حصّہ لیا"۔ (۴۹)

بلاشبہ ادب کے فروغ اور معاشرے کی تعمیر و ترقی اور اصلاح کے لیے ادبی رسائل اور ڈائجسٹوں کا کردار بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں رسائل کی اہمیت و ضرورت اور فروغ ادب میں ان کے کردار کے حوالے سے خاص طور پر ماہنامہ "اُردو ڈائجسٹ"، "حکایت ڈائجسٹ" اور "سیارہ ڈائجسٹ" کا خصوصی مطالعہ فکری، فنی اور خصوصی تحریروں کے حوالے سے لیا گیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ رفیق خاور، اُردو تھیسارس، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، دسمبر ۱۹۹۳ء، ص ۴۰۶-۴۰۷

۲۔ احمد دہلوی، سید، مولوی، فرہنگ آصفیہ، جلد سوم، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۲ء، ص ۳۸۳

۳۔ اشرف ندیم، جدید اُردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۱۳

۴۔ رؤف پاریکھ، ڈاکٹر، اوکسفرڈ اُردو انگریزی لغت، اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۲۰۱۳ء، ص ۲۲

۵۔ شارب ردولوی، ڈاکٹر، جدید اُردو تنقید، اصول و نظریات، اُتر پردیش اُردو اکادمی، لکھنؤ، انڈیا، ۱۹۸۷ء، ص ۳۲

۶۔ الحاج مولوی فیروز الدین، فیروز اللغات، اُردو، فیروز سنز، لاہور، س۔ن، ص ۴۷

۷۔ کتاب نما، ماہنامہ، جامعہ دہلی، جون ۱۹۹۷ء، ص ۴-۳

۸۔ منظر اعظمی، ڈاکٹر، اُردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصّہ، اتر پردیش اُردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۹۶ء، ص ۳۲۲

۹۔ شارب ردولوی، ڈاکٹر، جدید اُردو تنقید، اصول و نظریات، اُتر پردیش اُردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۷ء، ص ۳۲-۳۳

۱۰۔ محمد حسن، اَدبی سماجیات، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، انڈیا، باراوّل ۱۹۸۳ء، ص ۲۴

۱۱۔ اسلوب احمد انصاری، پروفیسر، ادب اور تنقید، نیشنل آرٹ پرنٹر، الہ آباد، باراوّل ۱۹۶۸ء، ص ۹۰

۱۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، پروفیسر، ایلیٹ کے مضامین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، انڈیا، ۱۹۷۸ء، ص ۲۱۶-۲۱۷

۱۳۔ نذر خلیق، ڈاکٹر، کچھ ہماری باتیں بھی، مشمولہ ماہ نامہ ابتہاج، راولپنڈی، فروری ۲۰۱۹ء، ص ۴

۱۴۔ الحاج مولوی فیروز الدین، فیروز اللغات، اُردو جدید، فیروز سنز، لاہور، س۔ن، ص ۵۴

۱۵۔ نثار احمد قریشی، ڈاکٹر، ادب عالیہ، شعبہ اُردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۱ء، ص ۱۰

۱۶۔ معین الرحمٰن، ڈاکٹر، انگریزی ناول کے زیر اثر اردو ناول کا آغاز، مشمولہ، دریافت، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، شمارہ جون ۲۰۰۲ء، ص ۴۵۰

۱۷۔ اُردو لغت، جلد اوّل، ترقی اردو بورڈ، کراچی ۱۹۸۷ء، ص ۲۴۷

۱۸۔ سعادت سعید، ڈاکٹر، راشد اور ثقافتی مغائرت، جی سی یونیورسٹی، لاہور ۲۰۱۰ء، ص ۱۸
۱۹۔ عارف نقوی، اُردو کی مقبولیت اور مسائل تجربات کے آئینے میں، مشمولہ، ماہنامہ، قومی زبان، انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی، جلد ۹۳، شمارہ ۶، جون ۲۰۲۱ء، ص ۹
۲۰۔ رؤف پاریکھ، ڈاکٹر، اوکسفرڈ اُردو انگریزی لغت، ص ۱۰۲۸
۲۱۔ شان الحق حقی، فرہنگ تلفظ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۸۸۶
۲۲۔ محمد عبداللہ خویشگی، فرہنگ عامرہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء، ص ۶۰۴
۲۳۔ سلطانہ بخش، ڈاکٹر، مرتبہ، اُردو میں اصولِ تحقیق، منتخب مقالات، اُردو اکیڈمی، لوئر مال، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۱۵
۲۴۔ رفیع الزمان زبیری، ابنِ صفی شخصیت اور فن، مشمولہ ایکسپریس نیوز، جمعہ، ۲۹/ جون ۲۰۱۸ء ادبی صفحہ
۲۵۔ ابرار مجیب، ادب نامہ، روزنامہ دنیا، (ادبی ایڈیشن)، اسلام آباد، منگل ۲۹/ جون ۲۰۲۱ء، ص ۱۰
۲۶۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، مکاتیب ڈاکٹر محمد حمید اللہ بنام محمد طفیل (پیرس)، قرطاس پبلی کیشنز، کراچی ۲۰۲۰ء، ص ۸۱
۲۷۔ راجندر سنگھ بیدی، دانہ و دام (افسانے)، نیا ادارہ، لاہور، ۱۵ جون ۱۹۴۳ء، ص ۸
۲۸۔ قرۃ العین حیدر، شیشے کا گھر، مکتبہ جدید لاہور، اکتوبر ۱۹۶۹ء، ص ۴۴۸
۲۹۔ رضی عابدی، مغربی ڈرامہ اور جدید ادبی تحریکیں، ادارہ تالیف و ترجمہ، جامعہ پنجاب، لاہور، جون ۱۹۸۷ء، ص ح، ط
۳۰۔ حمیرا اشفاق، ڈاکٹر، اُردو اور فرانسیسی ادب کے باہمی روابط، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۵
۳۱۔ وہاب اشرفی، پروفیسر، تاریخ ادبیاتِ عالم، پورب اکادمی، اسلام آباد، جون ۲۰۰۶ء، ص ۱۹
۳۲۔ ایضاً، ص ۹
۳۳۔ وارث سرہندی، علمی اُردو لغت، علمی کتاب خانہ، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۸۶-۱۴۱۱
۳۴۔ محمد اسحاق جلالپوری / تاج محمد، مرتبہ، درسی اُردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۱۳۲۳
۳۵۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی اُردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۹
۳۶۔ ایضاً، ص ۳۰۳
۳۷۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، اشارات تنقید، چمن بک ڈپو، اُردو بازار، دہلی، س ن، ص ۹۶
۳۸۔ ایضاً، ص ۹۸

۳۹۔ https://www.google.com/url?sa=t&source=web, 28-08-2021 at 5 pm

۴۰۔ https://www.meaningguru.com/en-ur/pulp ,28-08-2021 at 5 pm

۴۱۔ https://www.definitions.net/definition/pulp+fiction, 28-08-2021 at 5 pm

۴۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ(ابتدا تا ۱۹۸۸ء)، اکادمی ادبیات پاکستان، جنوری۱۹۸۸ء، ص۳

۴۳۔ ایضاً، ص۳۷۶-۳۷۷

۴۴۔ رؤف پاریکھ، ڈاکٹر، اوکسفرڈ اُردو انگریزی لغت، ص۴۸۵

۴۵۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی اُردو لغت، ص۴۷۰

۴۶۔ https://www.google.com.pk/search?q= , 29-8-2021, at 4 p.m

۴۷۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر تنقید اور تجربہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۹ء، ص۱۳-۱۴

۴۸۔ انور سدید، ڈاکٹر، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ،(ابتدا تا ۱۹۸۸ء)، اکادمی ادبیات پاکستان، جنوری۱۹۸۸ء ص۳۵۹

۴۹۔ ایضاً، ص۲۰۰

باب دوم:

ماہنامہ "اردو ڈائجسٹ"، "حکایت" اور "سیارہ" ڈائجسٹ میں ادب عالیہ، مقبول عام افسانوی ادب اور پلپ فکشن کے فکری رجحانات کا تقابل

باب دوم ماہنامہ "اُردو ڈائجسٹ"، ماہنامہ "حکایت" اور ماہنامہ "سیارہ"، ڈائجسٹ "ادبِ عالیہ"، مقبول عام افسانوی ادب اور پلپ فکشن کے فکری رجحانات کے تقابل پر مشتمل ہے۔ ان ڈائجسٹوں میں ۲۰۱۷ء تا ۲۰۱۹ء کے شماروں میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ صرف ان نمائندہ تحریروں کو مقالے میں شامل کیا جائے جو ادبی لحاظ سے بھی اہم ہونے کے ساتھ ساتھ عوامی سطح پر بھی مقبول ہوں۔ اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک حصہ منتخب افسانوں کا احاطہ کرتا ہے جبکہ دوسرے حصّے میں ناولوں کو شامل کیا گیا ہے۔

فکری رجحان:

رجحان کی ابتداء ایک خاص ذہنی رویے سے ہوتی ہے اور اس کا مفہوم ایک خاص نہج اور اسلوب کی ابتداء اور اس کے پھیلنے سے وابستہ ہے۔ میلان کو بھی رجحان کا نام دیا جاتا ہے۔ دراصل یہ دونوں الفاظ انگریزی زبان کے لفظ Trend کے متبادل کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد خان اشرف اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''رجحان انفرادی یا اجتماعی دونوں صورتوں میں ہو سکتا ہے لیکن اس کی سطح عموماً کم تر اور کمزور تر ہوتی ہے اور ضروری نہیں کہ یہ مروجہ نہج اور مسلمہ ادبی معیاروں سے مختلف عمل یا حرکت کو وجود میں لائے۔ بسا اوقات یہ مروجہ نہج یا معیار ہی میں ہلکے سے ارتعاش کی نشاندہی کرتا ہے جس کی بنیاد میں ضروری نہیں کہ کوئی گہرے شعور لاشعوری عوامل و محرکات کارفرما ہوں۔''(۱)

رجحان کے لیے فکری بنیاد ضروری نہیں رجحان کے اثرات محدود مدت تک بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ وقت اور حالات کا تقاضا بھی ہو سکتا ہے۔ یہ مواد اور موضوع کی سمت بڑھتا ہے۔ رویہ رجحان کی ہی ابتدائی شخصی شکل ہے۔ رویہ چونکہ اشخاص تک محدود ہوتا ہے جب رویے کا دائرہ عمل بڑھتا ہے اور اس کا اظہار گروہی سطح پر ہوتا ہے تو رجحان کی شکل اختیار ہونے لگتی ہے۔ رجحان کا آغاز اور انجام سوچا سمجھا نہیں ہوتا یہ حالات پر منحصر ہوتا ہے اگر اس میں بڑھوتری کی طاقت نہ ہو تو یہ نہ صرف ہمیشہ زندہ رہتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ترقی کے بہت سے مدارج بھی طے کرتا ہے اور دوسری صورت میں یہ اپنے خول میں ہی بند رہتا ہے اور مواقع میسر آنے کا انتظار کرتا ہے۔

تقابل:

تقابل سے مراد وہ ہم پلہ اور ہم سر اشیاء کے اشتراکات اور اختراقات کا باہم موازنہ کرنا ہے اور نتیجتاً ایک کے مقابلے میں دوسرے کا معیار متعین کرنا اور پہلے سے مختص کسی پیمانے کے مطابق دونوں کا باہم موازنہ کر کے کوئی مقام متعین کرنا تقابل کہلاتا ہے۔ تقابلی مطالعہ ادب میں تعلیمی شعبہ کا نام ہے، اسے تقابلی مطالعہ کہا جاتا ہے۔ یہ تقابل دو مختلف زبانوں کے ادب کے مابین بھی ہو سکتا ہے اور ایک ہی زبان کے دو ہم پلہ ادب پاروں کے مابین بھی۔ تقابلی ادب دراصل ایک کثیر العلمی مضمون ہے جس کا تعلق زبان و مکاں کے بعد بھی پیدا ہونے والے ادب کے درمیان ہے۔

تقابل کی دو اقسام ہیں۔ (۱) بیانیہ تقابل (۲) اقداری تقابل

بیانیہ تقابل دو ٹھوس چیزوں کا مخصوص خصوصیات کی بنا پر کیا جانے والا تقابل بیانیہ کہلاتا ہے۔ دو ٹھوس اشیاء، صفات، رنگ، ضخامت اور حجم کا باہمی تقابل کر کے نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔

اقداری تقابل اس میں ایک مرکزی اور بنیادی پیمانہ بنایا جاتا ہے اور اصول و ضوابط کے تحت دو یا دو سے زیادہ چیزوں کا ایک پیمانے کی بنیاد پر تقابل کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک معیاری افسانے کا معیار تیار کر کے دو افسانوں کو ایک مرکزی معیار پر پرکھا جاتا ہے اور نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔ ادب پاروں کی ساخت، ہیت اسلوب کو بھی باہمی موازنے پر پرکھا جاتا ہے۔

تینوں ڈائجسٹوں میں شامل اہم افسانوں کا (۲۰۱۷ء تا ۲۰۱۹ء) کا فکری تقابل تسلسل کے ساتھ شائع ہونے والے شماروں کو سامنے رکھتے ہوئے پیش کیا جارہا ہے۔

افسانے

افسانہ ایک ایسی نثری صنف ہے جس میں زندگی کے کسی ایک پہلو کو خوبصورتی سے کم سے کم الفاظ میں سمویا جاسکتا ہے۔ یہ ایک مغربی صنف ہے لیکن اس میں شروع سے ہی مقامی موضوعات کو پیش کیا جاتا رہا ہے۔ ہمارے بہت سے لکھنے والوں نے افسانے کی صنف کو بام عروج بخشا ہے۔ مقالہ ہذا کے موضوع میں شامل اہم افسانوں کا فکری جائزہ پیش کیا جاتا ہے:

ا۔ جوتا —احمد ندیم قاسمی

احمد ندیم قاسمی اُردو کے مایہ ناز افسانہ نگار ہیں۔ ان کا تعلق چکوال سے تھا۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے۔ ان کے افسانے زیادہ تر دیہی زندگی، نچلے طبقے اور معاشرے کے پسے ہوئے طبقات اور ان کے سماجی اور معاشی مسائل سے متعلق ہیں۔ ان کا افسانہ "جوتا" بھی ہمارے ایسے معاشرے کی عکاسی کرتا ہے جس میں نچلے طبقے کو بُری طرح کچلا گیا ہے۔

جوتا احمد ندیم قاسمی کا شاہکار افسانہ ہے جو اردو ڈائجسٹ کے شمارہ جولائی ۲۰۱۷ء میں شائع ہوا ہے۔ اس افسانے میں ایک مراثی اور چودھری کی کہانی بڑی خوبصورتی سے بیان کی گئی ہے۔ یہ کہانی ہمارے پسماندہ اور ذہنی طور پر بیمار معاشرے کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ مراثی کا نام کرمو ہے جبکہ گاؤں کے چودھری کا نام چودھری ریاض ہے۔ چودھری ریاض سمجھتا ہے کہ میراثی کا وجود اس گاؤں کے لیے ایک بوجھ ہے۔ اس کی سوچ ہے کہ معاشرے میں ترقی کرنا صرف وڈیروں، امیروں اور چودھریوں کا ہی حق ہے۔ اس کے خیال میں صرف امیر آدمی ہی ترقی کر سکتا ہے۔ غریب کو ترقی کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس لیے چودھری ریاض کرمو کو میراثی سے کہتا ہے کہ وہ جو بھی کام کرے، اس کی اجازت اور مشورے کے بغیر نہیں ہونا چاہیے۔ مراثی قوال پارٹی کے ساتھ کام کرتا ہے اور تالیاں بجا کر اپنی روزی روٹی کماتا ہے۔ مراثی کے تین بیٹے ہیں۔ وہ تھوڑے بڑے ہوتے ہیں تو کرمو ان کو سکول داخل کروانا چاہتا ہے تاکہ وہ تعلیم حاصل کر کے اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں اور باعزت روزگار حاصل کر سکیں لیکن جب چودھری ریاض کو اس بات کا پتہ چلتا ہے تو وہ کرمو میراثی پر سخت خفا اور برہم ہوتا ہے اور اس کو بلا کر ہدایت کرتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اسکول داخل کروادے گا

تو شادی بیاہ اور دیگر پارٹیوں میں جا کر ناچ گانا سنانے کی بجائے کیا وہ کتابیں پڑھ کر لوگوں کو سنائیں گے اور ان کا دل خوش کریں گے۔ کرمو میراثی کو چودھری ریاض کی اس بات کا بہت دکھ ہوتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ میرا جو دل چاہے گا میں کروں گا۔ لہٰذا وہ اپنے بچوں کو اسکول داخل کرواتا ہے اور اس کے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے مختلف شہروں میں نوکریاں کرتے ہیں جس کا چودھری کو بہت افسوس ہوتا ہے اور وہ میراثی کو اپنے ڈیرے پر بلا کر کئی دفعہ ذلیل کرتا ہے۔ اب اس نے قوال پارٹی کے ساتھ جانا چھوڑ دیا تھا اور الگ سے اپنی بیٹھک بنالی تھی جس میں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ خوش گپیاں کر کے وقت گزارتا تھا۔ چودھری کو اس بات پر بھی بہت رنجش تھی کہ لوگ میرے پاس بیٹھنے کی بجائے میراثی کے پاس جا کر کیوں بیٹھتے ہیں۔ ایک دن چودھری ریاض، کرمو میراثی کو اپنے ڈیرے پر بلاتا ہے اور اپنے منشی سے کہتا ہے کہ اس کو جوتے لگاؤ۔ چنانچہ منشی چودھری کی بات پر عمل کرتا ہے اور میراثی کو جوتے لگاتا ہے۔ میراثی جوتے کھا کر بھی پریشان نہیں ہوتا بلکہ اُلٹا اپنے جسم پر لگنے والے جوتوں کی گنتی کرتا جاتا ہے۔ میراثی جوتے کھانے کے بعد چودھری سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ جب مجھے جوتے لگ رہے تو میں ان کی گنتی کر رہا تھا پورے ۶۲ جوتے مجھے لگائے گئے۔ اب اس سے کئی گنا زیادہ جوتے جب چودھری کو قیامت میں پڑیں گے تو چودھری کیسے برداشت کرے گا؟ میراثی چودھری کو حقیقت حال سے یوں آگاہ کرتا ہے:

> ”ایک روز کرمو گلی میں بیٹھا لوگوں سے گپیں ہانک رہا تھا۔ باتوں باتوں میں کہنے لگا:
> ”میں میراثی ہوں پر تین بابو لوگوں کا باپ بھی ہوں۔ اس لیے جی چاہتا ہے یہاں گلی میں بیٹھنے کے بجائے ایک پکی بیٹھک بنوالوں۔ اس میں پلنگ اور مونڈھے بچھادوں اور تم سب کے ساتھ بیٹھ کر دنیا جہان کی اچھی اچھی، پیاری پیاری، میٹھی میٹھی باتیں کروں۔ بیٹھنے کے لئے چودھری کا ڈیرہ تو ہے مگر میں وہاں بیٹھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے سر کے بل کھڑا ہوں“۔ (۲)

ایک بار مراثی اپنے بیٹے سے ملنے فیصل آباد جاتا ہے جو کسی مل میں کام کرتا تھا۔ واپس آتے ہوئے میراثی کا بیٹا اس کو ایک خوبصورت کمبل کا تحفہ دیتا ہے۔ جب وہ کمبل لے کر گاؤں آتا ہے تو سب لوگ اُس سے پوچھتے ہیں کہ آپ نے اتنا مہنگا کمبل کہاں سے لیا تو میراثی کہتا ہے کہ میرا بیٹا شہر میں نوکری کرتا ہے۔ اس کا ایک دوست ہے جس کا باپ بیرون ملک رہتا ہے اور اُس نے مجھے یہ کمبل تحفہ میں دیا ہے۔ چودھری کو جب یہ خبر ملتی ہے تو وہ کسی نہ کسی طرح میراثی سے کمبل حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ایک دن میراثی اتفاق سے چودھری

کے ڈیرے کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ چودھری اس کو بلاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ کمبل تم مجھے دے دو۔ یہ میرے پاس ہونا چاہیے تم اس کی جتنی قیمت چاہو لے لو۔ میراثی کہتا ہے کہ میں اس کے ۲۶۲ روپے لوں گا۔ چودھری اپنے منشی سے کہتا ہے کہ اس کو جتنی رقم چاہے ادا کر دو اور کمبل اس سے لے لو۔ اس طرح کسی نہ کسی طرح چودھری کر مو میراثی سے کمبل حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور وہ اپنے منشی سے کہتا ہے کہ اس کو دھوپ میں خشک کر کے پیٹی میں رکھ دو۔ کمبل تو میرے پاس اِس جیسے اور بھی بہت ہیں لیکن یہ کمبل میراثی کے پاس نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ میرے پاس ہونا چاہیے تھا۔ اس پر چودھری ایک تاریخی جملہ کہتا ہے کہ "جوتا پاؤں میں ہی اچھا لگتا ہے سر کے اوپر رکھا جائے تو اچھا نہیں لگتا"۔

اس سے چودھری ریاض کی ذہنیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں کس طرح غریبوں کا استحصال کیا جاتا ہے اور ان کے ترقی کرنے سے وڈیروں کو کس قدر پریشانی لاحق ہوتی ہے۔ اس افسانے میں احمد ندیم قاسمی نے ہمارے معاشرے کی اپنے الفاظ میں خوبصورت عکاسی کی ہے۔ مصنف نے جس طرح کا ماحول دیکھا ہے ویسا ہی اس نے بیان کر دیا ہے۔ بظاہر تو یہ چودھری اور مراثی کی کہانی ہے لیکن اگر گہرائی سے اس کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس افسانے کے ذریعے معاشرے کی ذہنی پستی اور فکری پہلوؤں کو کس خوبصورتی سے اُجاگر کیا گیا ہے۔ یہ افسانہ فکری لحاظ سے وڈیروں کی ذہنی پستی کا عکاس ہے۔

۲۔ بندرابن کی کج گلی میں-اشفاق احمد

اشفاق احمد کا شمار اُردو ادب کے ان نامور فنکاروں اور ادیبوں میں ہوتا ہے جو قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ادبی اُفق پر اُبھر کر سامنے آئے۔ ۱۹۵۳ء میں "گڈریا" افسانے نے اُن کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ ان کو کہانی لکھنے پر ایسا عبور حاصل تھا جو بہت کم لوگوں کے حصّے میں آتا ہے۔ "ایک محبت سو افسانے" ان کا ابتدائی افسانوں کا مجموعہ ہے۔ "اُجلے پھول" ۱۹۵۱ء میں سامنے آیا۔ اس میں ۱۳ افسانے موجود ہیں۔

اشفاق احمد اردو افسانہ نگاری میں اپنا ایک الگ مقام رکھتے ہیں وہ کئی افسانوں کے مصنف ہیں۔ بندرا بن کی کج گلی میں ان کا ایک اہم افسانہ ہے جو اردو ڈائجسٹ، جولائی ۲۰۱۷ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ اس میں ایک مچھیرے کے بیٹے کی کہانی بیان کی گئی ہے جس کا نام نم دار ہے۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ مچھلیاں پکڑتا ہے اور اسے اسکول جانے کا بہت شوق ہے۔ کام کے ساتھ ساتھ وہ تعلیم بھی حاصل کرتا ہے۔ وہ میٹرک کرنے کے بعد لاہور کے کسی اسکول میں داخل ہوتا ہے۔ جس کے بعد وہ بی۔ اے کرنے کی غرض سے کالج

میں داخلہ لیتا ہے مگر غربت کی وجہ سے مفلوک الحال زندگی بسر کر رہا ہے، مگر اسے تعلیم جاری رکھنے کا انتہائی شوق ہے۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ہوسٹل میں بھی نہیں رہ سکتا کیونکہ وہ غربت کے باعث ہاسٹل کی فیس ادا کرنے سے قاصر ہے۔ وہ غریب ہونے کے باوجود اپنے دوستوں کا لیڈر اور شرارتیں بھی خوب کرتا ہے۔ اسے کالج میں اپنی کلاس کی ایک لڑکی کلثوم سے محبت ہو جاتی ہے۔ کلثوم بھی اس سے اپنی محبت کا اظہار ان الفاظ میں کرتی ہے:

> "کلثوم کہہ رہی تھی میرا کوئی ساتھی نہیں۔ ہمارے خاندان میں بہت سے آدمی ہیں مگر سارے کے سارے تاجر۔ ان کے یہاں ہر قسم کا سودا ہے لیکن لطیف جذبات کی کمی ہے۔ کوئی ایسا ذہن نہیں جو میرا ساتھ دے سکے۔ کسی میں اتنی سکت نہیں کہ میرے ساتھ مل کر میری سکیم چلا سکے۔ لیکن میں کیا! میں تو خود ان کے ساتھ اسی دھارے میں بڑی تیزی سے بہہ جاتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے میرا مستقبل کیا ہو گا؟ مجھے اس دن کا علم ہے جب میری تعلیم کسی کا کچھ نہ بگاڑ سکے گی۔ میں تو اس دن کا انتظار کر رہی ہوں، ہاں بڑی شدت سے "۔ (۳)

نم دار نے اپنی زندگی میں بہت سے خواب دیکھے تھے اور اپنی والدہ کو یقین دلایا تھا کہ وہ پڑھ لکھ کر جب بی اے کرے گا تو اسے اچھی نوکری مل جائے گی مگر بی اے کرنے کے بعد اس کی قسمت میں نہ اچھی نوکری ہوئی اور نہ وہ بنگلہ مل سکا، جس کا اس نے اپنی تعلیم کے دوران خواب دیکھا تھا۔ مگر اتنا ضرور ہوا کہ وہ سندھ کے کسی دور دراز علاقے میں کسی وڈیرے کے ہاں ملازم ہو جاتا ہے۔ وہاں تنخواہ اور مراعات کی کمی کے باعث اس کے لیے زندگی گزارنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ لیکن وہ اپنے خوابوں کی تعبیر کے لیے کوئی نہ کوئی ایسا کام کرنا چاہتا ہے جس سے باعزت طریقے سے روزی کما سکے اور اس کی گزر بسر بہتر انداز میں ہو سکے۔ اپنے اس خواب کو پورا کرنے کے لیے وہ ایک ڈاکٹر کے ہاں نرسنگ اسٹاف میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہ یہاں دل لگا کر دن رات کام کرتا رہتا ہے۔ معاش کی فکر سے کلثوم کا خیال بھی اس کے دل سے نکل جاتا ہے۔ جب کہ وہ اس سے پہلے ہمیشہ اس کے خیالوں میں کھویا رہتا تھا۔ اس کا روزگار محبت پر حاوی ہو جاتا ہے۔ ایک دن ڈاکٹر اسے بلا کر کہتا ہے کہ ایک مریضہ آئی ہے جس کے ساتھ ایک شخص ہے، وہ شخص کہتا ہے کہ میں نے بندرگاہ پر جا کے کچھ مال چھڑوانا ہے۔ ہم اس کی مریضہ کا علاج معالجہ کریں۔ اس پر ڈاکٹر اس کو تسلی دیتا ہے مگر آدمی اپنی مریضہ کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ یہ مریضہ بے

ہوش ہوتی ہے۔ ڈاکٹر نم دار کو مریضہ کا علاج کرنے، اسے انجیکشن لگانے کے لیے کہتا ہے۔ جب نم دار اس کو انجیکشن لگاتا ہے اور مریضہ کو ہوش میں لانے کی کوشش کرتا ہے مگر جب مریضہ ہوش میں آتی ہے تو نم دار یہ دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے کہ وہ تو کلثوم ہے، جو اس سے کالج کے زمانے میں بچھڑ گئی تھی اور وہ ساری زندگی اپنی محبت کو حاصل کرنے اور اِسے تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اب مایوس ہو چکا تھا۔ آج وہ اچانک ڈرامائی انداز میں اس کے سامنے آگئی تھی۔ کلثوم جب اس کو ملتی ہے تو اس کی زندگی تقریباً ختم ہو چکی ہوتی ہے۔ جس فکری انداز میں اس کہانی کو بیان کیا گیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے مصنف اپنی قلم پر کس قدر مضبوط گرفت رکھتا ہے۔ مصنف نے معاشرے کا گہری اور فکری سوچ کے باعث باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے جو ہمارے عام اور پسماندہ طبقے میں اس طرح کے مسائل کو سامنے لاتا ہے۔

۳۔ تاج محل کا خانسامہ-خواجہ حسن نظامی

خواجہ حسن نظامی جن کو شہرت انشائیے اور مضامین (بیگمات کے آنسو) سے ملی۔ شاید ہی کوئی ایسا موضوع ہو جس پر انہوں نے نہ لکھا ہو۔ ایک سو سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔

تاج محل کا خانسامہ، خواجہ حسن نظامی نے اردو ڈائجسٹ، اگست ۲۰۱۷ء کے شمارے میں لکھا ہے۔ جس میں تاج محل میں کام کرنے والے ایک تیموری شہزادے قسمت بیگ کی زوال پذیر کہانی بڑی خوبصورتی سے بیان کی گئی ہے۔ تاج محل سمندر کے قریب واقع ہے جہاں مہاراجا بھاؤ نگر قیام کرتا ہے۔ اس کی خدمت کے لیے ایک پرانے خانساماں قسمت بیگ کو متعین کیا جاتا ہے۔ وہ پیدائشی طور پر کچھ بہرہ ہے لیکن اپنا بہرہ پن کسی پر آشکار نہیں ہونے دیتا۔ ایک دن مہاراجا بھاؤ نگر نے اس کو بلایا اور اسے کہا کہ آج شام تاج محل میں دس آدمیوں کے کھانے کا بندوبست کرنا ہے۔ محل والوں سے کہہ دیں کہ بندوبست ٹھیک سے کر دیں قسمت بیگ نے راجا کو روایتی مغربی انداز میں سلام کیا اور کہا کہ حکم کی تعمیل ہو گی۔ قسمت بیگ سنتا کم تھا لیکن پھر بھی وہ اشاروں کنایوں سے سمجھ جاتا تھا کہ بولنے والا کیا کہہ رہا ہے مہاراجہ نے تاج محل والوں سے پوچھا کہ یہ قسمت بیگ روایتی سلام کیوں کرتا ہے حالانکہ آج کل تو ہوٹلوں والے انگریزی سلام کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ قسمت بیگ اپنی ایمانداری ،دیانت داری اور فرض شناسی کی وجہ سے بہت زیادہ اہم ہے۔ اس لیے کسی بڑی شخصیت کے ساتھ قسمت بیگ کی ڈیوٹی لگائی جاتی ہے۔ مہاراجہ بہاؤ نگر تاج محل والوں سے کہتا ہے کہ وہ قسمت بیگ سے ذاتی حیثیت سے ملنا چاہتا

ہے اور کچھ باتیں کرنا چاہتا ہے۔ تاج محل والوں نے بتایا کہ قسمت بیگ ڈیوٹی کے علاوہ نجی بات چیت کے لئے وقت نہیں دیتا۔ ڈیوٹی کے دوران صرف کام کرتا ہے۔ بعد وہ بہت سخت ہے۔ چنانچہ قسمت بیگ راجہ بھاؤ نگر سے ملنے کے لیے راضی ہو جاتا ہے اور وہ اپنی سر گزشت اسے کچھ اس انداز سے سناتا ہے کہ میں بادشاہ کا بیٹا ہوں ۱۹۵۷ء میں جب انقلاب آیا تو میری ماں بادشاہ کی بیوی تھیں۔ وہ بیان کرتا ہے:

> "میں بہادر شاہ بادشاہ کا بیٹا ہوں۔ میری ماں لونڈی تھی اور بادشاہ کی معتوب۔ جب غدر ۱۸۵۷ء کا انقلاب ہوا تو میری عمر دس سال تھی۔ بادشاہ نے گھبراہٹ کے وقت اپنی بیوی بچوں کا انتظام ادھورا کیا تھا۔ اس وقت میرا اور میری ماں کا شاید ان کو خیال بھی نہ آیا ہو گا کہ میری ماں لال قلعہ کے باہر خاص بازار میں ایک مکان میں رہتی تھیں۔ مکان شاہی تھا پہرے دار اور نوکر بھی بادشاہ کی طرف سے تھے، خرچہ بھی ملتا تھا مگر بادشاہ میری پیدائش سے پہلے میری ماں سے خفا ہو گئے تھے۔ انھوں نے کبھی میری صورت نہیں دیکھی نہ میری ماں کو قلعہ میں بلایا"۔ (۴)

جب اس نے اپنی کہانی سنائی تو راجا بھاؤ نگر نے کچھ اس طرح سے سر اٹھایا ہے کہ جیسے وہ اس سے بہت متاثر ہو۔ قسمت بیگ کہتا ہے کہ مجھے قسمت سے گلہ ہے نہ دنیا سے اور نہ وہ اپنے ماضی کو یاد کر کے کبھی پچھتاتا ہے۔ راجہ اس کی باتوں سے بہت سبق سیکھتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ تم میرے ساتھ چلو میں آپ کو اس سے دگنی تنخواہ دوں گا۔ قسمت بیگ نے اس کو سلام کیا اور کہا کہ میں یہاں پر بہت عزت سے رہ رہا ہوں۔ میں ان لوگوں کے ساتھ اپنی زندگی بسر کرنا چاہتا ہوں اور میرا مزاج نہیں ہے کہ میں اپنے ایک آرام کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ جاؤں اور سکون کی خواہش کروں۔ راجہ اس کی بات سے بہت خوش ہوا اور اس نے اس کو ایک ہزار کا چیک پیش کیا اور کہا کہ یہاں بھی رہیں آپ کو ہر سال ایک ہزار روپے کا چیک ملتا رہے گا۔ معلوم نہیں کہ قسمت بیگ کو رونا کس بات پر آیا تھا اور کون سی بات پر اِسے ماضی یاد آ گیا۔ فکری لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے جس شخص نے اپنی زندگی کے خوبصورت دن دیکھے ہوں، جب اس کو مشکلات سے نبرد آزما ہونا پڑے تو اس کے لیے کتنی پریشانی ہوتی ہے۔

۴۔ انوکھا ڈرائیور۔ حجاب امتیاز

حجاب امتیاز علی تاج پاکستان کی نامور افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ ان کی زیادہ تر تحریریں رومانوی ہیں۔ ان کا پہلا افسانہ "میری ناتمام محبت" ۱۲ سال کی عمر میں سامنے آیا اور اسی نام سے ان کا افسانوی مجموعہ بھی ہے۔ ان کے اور بھی افسانوی مجموعے منظر عام پر آئے جن میں ممی خانہ، تحفے اور شگوفے، وہ بہاریں یہ خزائیں شامل ہیں۔

افسانہ انوکھا ڈرائیور اردو ڈائجسٹ، ستمبر ۲۰۱۷ء کے شمارے میں شائع ہونے والی ایک خوبصورت کہانی ہے جسے حجاب امتیاز نے انوکھے انداز میں بیان کیا ہے۔ کہانی میں ایک فرض شناس ڈرائیور کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ اپنی ڈیوٹی کے ساتھ کس قدر مخلص ہے۔ جب کبھی وہ بیمار بھی ہو جائے تو اپنی ڈیوٹی سے انکار نہیں کرتا۔ افسانے میں ایک ایسا ہی واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ ایک دفعہ ڈرائیور کو اپنی مالکن کو لے کر وہاں جانا پڑتا ہے۔ ڈرائیور کا نام کریم ہے جو چھٹی پر گیا ہوا تھا۔ جب وہ شام تک نہیں آتا تو صبح واہ جانے کے لیے اس کی مالکن اپنی کسی دوست کو فون کر کے ڈرائیور کا بندوبست کر لیتی ہے تاکہ وہ اس کے ساتھ واہ جا سکے۔ لیکن عین رات کے بارہ بجے جب وہ جانے کی تیاری کر رہی تھی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اس کا اپنا ڈرائیور کریم اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہو گیا اور اس نے آکر بتایا کہ میں ڈیوٹی پر حاضر ہو گیا ہوں۔ اس کی مالکن نے بتایا کہ صبح سویرے وہ ڈیوٹی کے لیے تیار ہو جائے کہ نماز کے بعد گاؤں میں جانا ہے۔ ان دنوں سخت سردی کے دن تھے لیکن اس کے باوجود اس نے گاڑی نکالی اور علی الصبح جانے کے لیے روانہ ہو گئے۔ راستے میں کریم ڈرائیور نے گاڑی اتنی تیزی سے چلائی کہ مالکن نے اس کو روکا کہ کار اتنی تیز مت چلائے مگر اس نے کہا کہ میں آپ کو ہر حال بارہ بجے تک گاؤں پہنچا دوں۔ جس وقت کا آپ نے بتایا ہے وہاں اس وقت تک ہم پہنچ جائیں گے۔ اس طرح جب مالکن اس کو گاڑی تیز چلانے سے روکتی ہے تو ان کے درمیان یہ مکالمہ ہوتا ہے۔

> "اس نے کار کی رفتار اور تیز کر دی۔ کار ضبط و احتیاط کو نظر انداز کر کے ایک بے عنان جنون میں اُڑی جا رہی تھی! میں بدحواس ہو گئی۔ چیخ پڑی۔ روکتے ہو یا نہیں؟ میرا خون جسم میں جم گیا۔ ہاتھ پاؤں سرد پڑ گئے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ شخص ایک خوفناک جنونی ہے یا کسی شدید مرض میں مبتلا۔ وہ میرے پاس چھ سال سے تھا۔ میری تمام کاروں کا وہی نگران تھا۔ بے حد محتاط تھا، ایسا گستاخ کبھی نہ تھا"۔ (۵)

اس طرح کار بے قابو ہو کر ایک ٹیلے پر چڑھ جاتی ہے تو مالکن خوف کے مارے بے ہوش ہو جاتی ہے، جب انھیں ہوش آتا ہے تو ایک قبرستان کے باہر لوگ جنازہ لے کر آرہے ہوتے ہیں وہ دریافت کرتی ہے کہ یہ جنازہ کس کا ہے تو اس کو بتایا جاتا ہے کہ یہ ڈرائیور کریم کا جنازہ ہے جس کا رات ۱۲ بجے کسی کار حادثے میں انتقال ہو گیا تھا۔ اس طرح ڈرائیور نے اپنی جان دے دی مگر اس نے اپنی مالکن کے سامنے انکار نہیں کیا اور اپنی ڈیوٹی کو فرضِ عین سمجھتے ہوئے آخری دن اور اپنی موت کے آخری وقت تک ڈیوٹی انجام دیتا رہا۔ یہ افسانہ کسی شخص کی فرض شناسی اور ذمہ داری کے بارے میں نہایت اہم اور سبق آموز ہے۔ مالکن کہتی ہے کہ جب جنازہ کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ پیچھے گرد کا طوفان سامنے موت کا منظر نظر آرہا تھا۔ اس طرح اچھے رشتوں کے ٹوٹنے کا ہر وقت خطرہ رہتا ہے۔ میرا دل ڈر رہا تھا اور میں خدا سے دعا مانگ رہی تھی کہ جلد سے جلد کوئی حادثہ پیش آئے اور یہ خوفناک منظر کا سلسلہ اختتام تک پہنچے۔ فکری لحاظ سے یہ افسانہ ہمیں زندگی ناپائیداری پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ کوئی بھی چیز یہاں مستقل رہنے والی نہیں ہے۔ ہماری زندگی ناپائیدار ہے جو کسی بھی وقت ختم ہو سکتی ہے۔

۵۔ مہمان-رضیہ بٹ

رضیہ بٹ ۱۹ مئی ۱۹۲۴ء کو پیدا ہوئیں اور ۱۴ اکتوبر ۲۰۱۲ء کو ان کا انتقال ہوا۔ پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی خاتون ناول نگار کا درجہ رکھتی تھیں۔ انہوں نے کہانیوں میں پاکستانی معاشرے کی عورت کے کردار کو اہمیت دی ہے۔ انہوں نے ۵۱ سے زیادہ ناول لکھے اور ۳۵۰ سے زائد مختصر کہانیاں تحریر کیں۔

مہمان رضیہ بٹ کا ایک معروف افسانہ ہے جو اردو ڈائجسٹ، جنوری ۲۰۱۸ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ اس افسانے میں عورت ہاجرہ اپنی نادانی اور پاگل پن کی وجہ سے مہمان کو رحمت کی بجائے بلائے جان سمجھ بیٹھتی ہے۔ لیکن یہی مہمان اس کی خوبصورت سوچوں کا عکاس ہوتا ہے۔ جب ہاجرہ کو یہ بات معلوم ہوتی ہے تو مہمان کے ساتھ وہ خود بھی شرمندہ ہوتی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ گھر میں اگر کوئی مہمان آتا ہے تو اس کی خدمت پر خرچ کرنے سے گھر میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں مہمان کا درجہ بہت افضل ہے اور اسلام نے مہمان کو اللہ کی جانب سے باعثِ رحمت قرار دیا ہے۔ گھر میں مہمان کے کھانے سے انسان کا رزق کم ہونے کی بجائے بڑھ جاتا ہے۔ دیگر مذاہب میں تو شاید یہ بات سوچی جا سکتی ہو، لیکن اسلام میں مہمان

کو فضیلت دی گئی ہے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ بعض اوقات مہمان گھر والوں کے لیے کتنی بڑی رحمت بن کر آتا ہے۔ رشید اور فرید کی دوستی کچھ اس طرح سے ہوئی:

"رشید صاحب ادھیڑ عمر کے بڑے مقبول قسم کے آدمی تھے۔ فیصل آباد میں رہتے تھے بہت بڑا بزنس تھا۔ فرید سے رشتہ داری کے ناطے ایک تقریب میں ملاقات ہوئی ہے۔ یہ ملاقات دوستی کی ابتدا بن گئی۔ دونوں کے مزاج ایک سے تھے۔ مزاجوں کی ہم آہنگی نے دوستی کی مضبوطی اور پائیداری کی بنیاد رکھی"۔ (۶)

کسی سے دوستی کے لیے دونوں ذہنوں کا ہم خیال ہونا ضروری ہوتا ہے۔ لہٰذا فرید اور رشید کی ذہنی ہم آہنگی کے باعث ایسے ہی باتوں باتوں میں ایک دوسرے کے گہرے دوست بن گئے۔ فرید لاہور میں سرکاری افسر تھا اور رشید صاحب اکثر اپنے کاروبار کے سلسلے میں لاہور جاتے رہتے تھے۔ رشید نے فرید کو بتایا کہ وہ اکثر اپنے کاروبار کے سلسلے میں لاہور جاتا رہتا ہے اور وہاں کسی ہوٹل وغیرہ میں ٹھہرتے ہیں مگر اسے ہوٹل پسند نہیں ہے مگر بہ امر مجبوری ہی وہاں رُکنا پڑتا ہے۔

رشید صاحب کو کاروبار کے سلسلے میں اکثر لاہور آنا پڑتا تھا۔ وہ جب بھی آتا فرید سے مل کر جاتا لیکن اتنی جلدی میں ہوتے کہ ملاقات ایک آدھ گھنٹہ ہی ہوتی۔ ایک بار فرید نے اصرار سے انہیں روکا۔ اپنے ہاں ٹھہرایا۔ باتوں ہی باتوں میں رشید صاحب کی پرابلم پتہ چلی۔ وہ ہوٹلوں میں نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ اکثر وہ صبح آتے اور شام کو واپس لوٹ جاتے۔ کئی دفعہ یوں بھی ہوا کہ کام ایک دن نہیں نمٹتا تو انہیں دو دو تین تین دن فیصل آباد سے روزانہ آنا پڑتا۔ یہ ساری باتیں فرید صاحب کو معلوم ہوئیں تو پھر کیسے ممکن تھا کہ وہ رشید صاحب کی تکلیف کا احساس نہ کریں۔ دوستی بے تکلفی میں بدل چکی تھی۔ فرید نے انہیں مجبور کیا کہ وہ اس گھر کو اپنا گھر سمجھیں۔ جب بھی لاہور آئیں اس کے ہاں ٹھہریں۔ اطمینان سے اپنا کام کریں۔ جتنے دن ٹھہرنا ہو۔ اسی کے پاس ٹھہریں"۔ (۷)

وہ وہیں ہوٹل میں کھانا کھاتے تھے۔ اس وقت فرید نے کہا کہ میرا گھر لاہور میں ہے۔ اسے آپ اپنا ہی گھر سمجھیں اور جب بھی آپ کا لاہور آنا ہو تو میرے گھر پر ہی قیام کریں۔ اس پر رشید نے کہا کہ اگلی بار جب میں لاہور آیا تو آپ کے گھر ہی قیام کروں گا۔ اس کے بعد جب رشید لاہور گیا تو فرید کے گھر چلا گیا اور

پھر یہ معمول بن گیا کہ وہ جب بھی کبھی لاہور جاتا تو فرید کے ہاں قیام کرتا۔ رشید کے قیام کی وجہ سے فرید کی بیگم کو یہ بات ناگوار لگتی تھی۔ اگلی بار پھر جب ایک دن رشید نے اپنے دوست فرید کو فون کیا کہ وہ لاہور کب آرہا ہے؟ تو فرید نے اپنے گھر فون کر کے اپنے دوست کی آمد کا بتایا۔ اس بار فرید کی بیگم نے سخت ناگواری کا اظہار کیا اور اپنی دونوں بچیوں سمیرا اور حمیرا سے کہا کہ آج پھر وہ بلائے جان مہمان آپ کے ابا کا دوست رشید آرہا ہے۔ اس کے کھانے کے لیے آج میں کوئی تیاری نہیں کروں گی۔ میں اس بار اسے ایسا ذلیل کروں گی تاکہ وہ آئندہ ہمارے گھر کا رُخ بھی نہ کرے۔ اس پر دونوں بچیوں نے کہا کہ مہمان اللہ کی رحمت ہوتی آپ ایسا نہ کریں۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو وہ ہم سے ناراض ہو جائیں گے اور آپ کی ابو سے لڑائی ہو جائے گی۔ لیکن اس عورت نے یہ کیا کہ جب رشید آتا ہے تو فرید اس کو چائے پلا کر کچھ دیر کے لیے باہر چلا جاتا ہے۔ جب دوبارہ گھر واپس آتا ہے تو باتوں باتوں میں فرید سے رشید صاحب (مہمان) ذکر کرتا ہے کہ وہ آج ان سے کچھ مانگنا چاہتا ہے۔ جس پر فرید نے کہا کہ ضرور مانگیں۔ جب رات نو بجے فرید گھر آتا ہے تو اس کی بیگم نے کھانے کے لیے کچھ نہیں بنایا ہوتا۔ فرید نے اپنی بیگم سے پوچھا کہ مہمان کے کھانے کے لیے کیا بنایا ہے تو اس نے سخت ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس کا آنا تو روز کا معمول بن گیا ہے۔ میں نے اس کے لیے کچھ بھی نہیں بنایا۔ جب اس نے دوسری بات کی کہ وہ آپ سے مانگنا چاہتا ہے۔ میرا مطلب رقم ادھار لینا چاہتا ہے، تو میں اس کو پیسے ہرگز نہیں دوں گی۔ کیونکہ یہ لوگ پہلے دوستی میں اپنا پیار جتانا شروع کرتے ہیں۔ اس کے بعد پیسے مانگنا شروع کرتے ہیں۔ اس پر فرید نے کہا کہ وہ پیسے نہیں مانگ رہا، بلکہ اس کے دو بچے ہیں جو تعلیم یافتہ ہیں اور وہ کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں وہ لاکھوں کے مالک ہیں۔ وہ دونوں بچوں کے لیے ہماری دونوں بچیوں سمیرا اور حمیرا کا رشتہ مانگنا چاہتا ہے۔ اس پر فرید کی بیگم خوش ہو جاتی ہے اور رشید صاحب کی بہت زیادہ خاطر مدارت کرتی ہے۔ اللہ کا شکر ادا کرتی ہے اور اپنے کیے پر شرمندہ ہوتی ہے کہ جو سلوک وہ رشید صاحب سے کرنا چاہتی تھی اس کے برعکس رشید صاحب نے ان کی عزت افزائی کی اور ان کی دونوں بچیوں کو اپنی بہو بنا لیا۔ پہلے تو وہ اس بات پر بھی راضی نہیں ہوتی تھی کہ وہ رشید صاحب کے لیے چائے بھی بنائے، مگر اب بچیوں کے لیے جب رشید صاحب قیمتی تحائف لے کر آئے تو وہ اور بھی خوش ہو رہی تھی۔ بچیوں کے رشتے کی بات سے بہت مطمئن نظر آتی ہے۔ فکری لحاظ سے یہ ایک شاہکار افسانہ ہے جو ذہن کی فکری سوچ کا آئینہ دار اور بہترین عکاس بھی ہے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ ہمیں مہمان کو دیکھ کر کم ظرفی نہیں بلکہ اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ اس سے اللہ تعالیٰ برکت عطا فرماتا ہے۔

۶۔ سونے کا ہار-احمد ندیم قاسمی

یہ افسانہ احمد ندیم قاسمی کے مجموعہ "سیلاب و گرداب" میں دسمبر ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں گیارہ افسانے موجود ہیں۔ "سونے کا ہار" احمد ندیم قاسمی کا ایک سبق آموز افسانہ ہے جو ہمارے معاشرتی حالات کی ایک جیتی جاگتی تصویر پیش کرتا ہے۔ یہ افسانہ اردو ڈائجسٹ فروری ۲۰۱۸ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ افسانے میں معاشرے میں پنپنے والی فضول رسومات اور بے کار خواہشات کی تکمیل معاشرے کو اپنے اندر کچھ اس طرح سے جکڑے ہوئے ہے کہ ہم نمود و نمائش کے چکر میں اپنا گھر بار اور عزت تک گنوا بیٹھتے ہیں لیکن سماج کے سامنے پھر بھی وہ مقام حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہیں جس کے لیے ہم یہ سب کچھ کرتے ہیں۔ یہ افسانہ اس حوالے سے بہت اہم ہے۔ مذکورہ افسانے میں احمد علی کی کہانی بیان کی گئی ہے کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی پر سونے کا ہار تحفے میں دینے کے لیے ہر قسم کے جتن اور پریشانیوں سے گزرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ اس کے ہاں اولاد نرینہ نہیں مگر جب بھی وہ کسی شادی پر دلہنوں کے گلے میں سونے کا ہار دیکھتا ہے تو اس کا دِل مچلتا ہے کہ وہ بھی اپنی لاڈلی بیٹی کے گلے میں اس کی شادی پر سونے کا ہار سجا دہوا دیکھے۔ اس کے دل میں یہ خواہش کروٹیں لینا شروع کر دیتی ہے کہ وہ بھی اپنی بیٹی کے لیے سونے کا ہار بنوائے گا تاکہ اس کی بیٹی خوبصورت دلہن کے روپ میں اس کے سامنے ہو اور وہ دنیا کا ہر سکھ اس کو دے سکے، جس کے لیے وہ اپنی بیوی سے مشورہ کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اگر اس کی زمین بھی بک جائے تو وہ سونے کا ہار بنوانے کے لیے تیار ہے۔ احمد علی کی بیوی بھی سونے کے ہار کی خواہش کا اظہار یوں کرتی ہے:

> "مجھے تو ہار کی الجھن نے بیمار کر دیا ہے۔ زمینیں بیچ ڈالو سو بات کی ایک بات کہی تھی میں نے۔ مگر اپنا پیٹ کیسے بھرے گا اپنا پیٹ کاٹ کر ہی اولاد کا پیٹ بھرنا پڑتا ہے جلدی جلدی کوئی خریدار نکالو۔ میں اپنی لاڈلی بیٹی کو بن ہار کے دیکھوں تو میری آنکھیں پھٹ جائیں۔ سہاگن کے سینے پر ہار نہ چمکے تو مجھے تو اللہ کی قسم رونا آجاتا ہے"۔ (۸)

دونوں میاں بیوی مل کر یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ سونے کا ہار خریدنے کے لیے اپنی زمین کا سودا کر دیں۔ اس مقصد کے لیے وہ گاؤں کے ذیلدار کے پاس جاتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ اس کو پیسوں کی اشد ضرورت ہے جنھیں وہ اپنی بیٹی کی شادی پر خرچ کر کے اسے سونے کا ہار بنا کر دینا چاہتا ہے۔ ذیلدار اُسے کہتا ہے کہ وہ نقد رقم

دینے سے قاصر ہے لہٰذا وہ ادھار پر زمین خرید سکتا ہے۔ لیکن اس کو ہار کے لیے پیسوں کی فوری ضرورت تھی۔ اس لیے احمد علی گاؤں کے چودھری کے پاس جاتا ہے اور اسے اپنی زمین خریدنے کی دعوت دیتا ہے۔ چنانچہ چودھری اسے زمین کی جو قیمت بتاتا ہے وہ بہت کم ہوتی ہے۔ چودھری کہتا ہے کہ اگر اڑھائی سو روپے میں فروخت کرنی ہے تو کر دو ورنہ جہاں آپ کا دل چاہے اپنی زمین فروخت کر لو۔ احمد علی نقد رقم کے لالچ میں اپنی زمین کا سودا کر دیتا ہے اور گاؤں سے چار پانچ میل دور ایک قصبے میں ہار خریدنے کے لیے روانہ ہوتا ہے تاکہ وہ اس شام کو جب گھر جائے تو اپنی بیوی کو سونے کا ہار دکھا سکے۔ ہار دیکھ اس کی بیوی اور بیٹی خوش ہو جائیں گی۔ وہ قصبے میں سنار کے پاس جاتا ہے جو اسے ہار دکھا کر اس کی قیمت بتاتا ہے۔ احمد علی ہار کی قیمت کم کرنے کے لیے کہتا ہے مگر سونار کہتا ہے کہ ہار کی قیمت کم نہیں ہو گی کیونکہ یہ اصلی سونے کا ہے۔ یہ رعایت بھی صرف آپ کے لیے ہے۔ آپ کی جگہ کوئی اور خریدار ہوتا تو میں ہار کے پورے پانچ سو روپے لیتا مگر آپ کے لیے یہ قیمت صرف ساڑھے تین سو روپے ہو گی کیونکہ آپ ہمارے پرانے گاہک ہیں۔ احمد علی ہار خرید کر گھر آجاتا ہے اور اپنی بیٹی کی شادی کے دن مقرر کر دیتا ہے۔ جب بیٹی کی رخصتی کا وقت آتا ہے تو وہ دوسرے تحائف کے ساتھ سونے کا ہار بھی تھال میں رکھتا ہے اور گاؤں والوں کو ہار دکھاتا ہے۔ تمام بڑی بوڑھی عورتیں اور مرد ہار دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں اور احمد علی کو دعائیں دیتے ہیں کہ اس نے اپنی بیٹی کے لیے کتنا خوبصورت سونے کا ہار تحفے میں دے دیا ہے۔ عین اسی وقت یہ ساری خوشیاں خاک میں مل جاتی ہیں جب ایک عورت ہار کا بغور جائزہ لینے کے بعد یہ کہتی ہے کہ یہ ہار تو نقلی ہے۔ یہ تو پیتل کے اوپر سونے کی ملمع کاری کی گئی ہے مگر احمد علی یہ بات ماننے کو تیار نہیں ہوتا۔ وہ اپنے ساتھ ایک سنار کو بھی لے کر آتا ہے۔ سنار کو ہار پرکھنے کے لیے کہتا ہے۔ جب سنار ہار کا جائزہ لیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ ہار تو نقلی ہے۔ وہ یہ کہہ کر چلا جاتا ہے لیکن اپنے پیچھے ایک بہت بڑا سوال چھوڑ جاتا ہے جو احمد علی کی زندگی، اس کی تمام جمع پونجی اور زمین تک بیچ کر اس نے اپنے ارمانوں کو پورا کیا تھا وہ آج اپنے ارمانوں کا خون اپنے سامنے ہوتا دیکھ رہا ہے۔ اس کہانی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنی حیثیت کے مطابق ہمیں اپنی بچیوں کو تحائف دینے چاہییں۔ حیثیت سے بڑھ کر کوئی کام کریں گے تو وہ ہمارے لیے نہ صرف نقصان دہ ہو گا بلکہ ہم اسے پورا کرنے کے لیے اپنے ارمانوں پر بھی پانی پھیر سکتے ہیں۔ اس افسانے میں فکری انداز کو جس طریقے سے پیش کیا گیا ہے وہ ہمارے معاشرے کا ایک بہت بڑا المیہ ہے۔ بعض اوقات انسان اپنی خواہشات کے ہاتھوں اپنی زندگی کی تمام جمع پونجی، عزت اور گھر بار برباد کر بیٹھتا ہے جس کا احساس اُسے پوری زندگی ملامت کرتا رہتا ہے۔

۷۔ دل کا قرار-رفیع احمد قدوائی

رفیع احمد قدوائی کی پیدائش ۱۸۹۴ء میں ہوئی۔ تحریکِ آزادی ہند کے سرگرم رکن تھے۔ جواہر لال نہرو کی کابینہ میں صرف دو مسلم تھے جن میں رفیع احمد قدوائی اور مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔

دل کا قرار، رفیع احمد قدوائی کا لکھا ہوا افسانہ ہے، جسے اردو ڈائجسٹ کے شمارے جون ۲۰۱۸ء میں پیش کیا گیا ہے۔ افسانے میں ایک کھیت مزدور فضلو کا دل آویز ماجرا بیان کیا گیا ہے جس سے معاشرے کی ایک جیتی جاگتی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ فضلو حادثاتی طور پر اپنی ساری جمع پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ فضلو ایک گاؤں میں رہتا تھا اور کھیتوں میں محنت مزدوری کر کے اپنی زندگی بسر کرتا ہے۔ اسے اچانک گاؤں میں رہنے والی ایک لڑکی جمیلہ سے محبت ہو جاتی ہے۔ جمیلہ اپنی والدہ کے ساتھ اسی گاؤں میں رہتی تھی۔ اس کا والد فوت ہو چکا تھا اور اپنی والدہ کے ساتھ کسم پرسی کی زندگی گزار تھی۔ فضلو جمیلہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ وہ اسے شادی کا پیغام دیتا ہے تو جمیلہ اس کو کہتی ہے کہ آپ کے پاس مجھے دینے کے لیے ہے ہی کیا؟ فضلو کہتا ہے کہ میں اپنی پوری دولت آپ کو دے دوں گا۔ اتفاق سے عظیم چودھری جو اس گاؤں کا وڈیرہ ہے اس کا بیٹا ہاشم چودھری بھی جمیلہ کو پسند کرتا ہے اور اس سے شادی کا خواہش مند ہے۔ فضلو کی شادی میں چودھری اور اس کا بیٹا رکاوٹ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر ان کا والد بڑا چودھری عظیم ان کو منع کرتا ہے۔ چنانچہ فضلو کی شادی جمیلہ سے ہو جاتی ہے۔ تب غربت کی وجہ سے فضلو سوچتا کہ شہر جا کر کچھ محنت مزدوری کرنی چاہیے تا کہ اپنی دلہن کو خوش کر کے اس کی ضروریات پوری کر سکے۔ لیکن جمیلہ کے ہاں اسی عرصہ میں ایک بچہ ہوتا ہے اور فضلو کا شہر میں اس بچے کے بغیر دل نہیں لگتا۔ لہٰذا وہ دوبارہ گاؤں واپس آجاتا ہے۔ بیکار ہونے کی وجہ سے وہ چھوٹی موٹی چوریاں شروع کر دیتا ہے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ وہ چوری کرنے کے لئے ہاشم چودھری کے گھر کا رُخ کرتا ہے۔ اس کا گھر ایک ندی کے پاس ہے۔ جب وہ وہاں جاتا ہے تو عظیم چودھری کا بیٹا ہاشم چودھری ندی میں کشتی میں بیٹھا ہوا ہے۔ افسانہ نگار اس منظر کو اس طرح پیش کرتا ہے:

> ”کچھ دیر میں حویلی کے اندر داخل ہو کے اُس کمرے میں تھا جہاں چودھری کا خزانہ تھا۔ کمرے کے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ لیکن اس کے پاس تالا توڑنے اور کھولنے کے اوزار تھے۔ اُسے کمرے کے دروازے پر لگا ہوا قفل کھولنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی، بلکہ کمرے میں پہنچ کر اس نے چودھری کا فولادی بکس بھی کھول

لیا۔ بارش نے گھر میں موجود لوگوں کو اس قدر گہری نیند سلا دیا تھا کہ فضلو کو بڑے آرام سے کام کرنے کا موقع مل گیا۔ اس نے تھیلی اپنے قبضے میں کر لی جو اوپر سے نیچے تک بڑے چھوٹے کرنسی نوٹوں سے بھری ہوئی تھی"۔ (۹)

باقی سب گھر والے سو رہے ہوتے ہیں۔ وہ موقع پا کر حویلی کی جائیداد پر قبضہ کرتا ہے اور سارا مال و اسباب لوٹ لیتا ہے۔ جب وہ مال لوٹ کر گھر آتا ہے اور سارا مال و اسباب جمیلہ کو دے کر اُسے خوش کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اس کی حیرت کی اس وقت انتہا نہیں رہتی جب وہ دیکھتا ہے کہ جمیلہ اُس جھونپڑی میں نہیں ہے جہاں وہ اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ وہ ادھر اُدھر تلاش کرتا ہے لیکن ناکام رہتا ہے۔ اسے ہاشم چودھری اغوا کر کے لے جاتا ہے۔ اس طرح اس کی ساری دولت جو اس نے جمیلہ کی محبت میں اکٹھی کی تھی، اس کے کسی کام نہیں رہتی۔ فکری لحاظ سے اس افسانے کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں احساس ہو گا بظاہر جس چیز میں ہمیں کشش محسوس ہوتی ہے وہ محض نظروں کا دھوکہ ہو سکتا ہے۔ اگر آپ ایک طرف سے کسی کو لوٹ رہے ہیں تو دوسری طرف سے کوئی آپ کی دولت کو لوٹ رہا ہے۔ اس لیے کوئی بھی ایسا کام کرنے سے پہلے اس کے نتائج پر غور و فکر کرنا چاہیے۔

۸۔ سفید بال- نیلم احمد بشیر

نیلم احمد بشیر کا شمار عصر حاضر کے لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ یہ دس کتابوں کی مصنفہ ہیں۔ انہوں نے اپنی کہانیوں میں جدید معاشرے کی عورت کے مسائل کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ (گلابوں والی گلی) ان کی پہلی کتاب ہے جس میں ان کا یہ افسانہ "سفید بال" شامل ہے۔

سفید بال، نیلم احمد بشیر کا سماجی افسانہ ہے جو اردو ڈائجسٹ، جون ۲۰۱۸ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ عورت اپنی گھر داری اور بچوں کی پرورش کے ساتھ ساتھ اپنا مستقبل سنوارنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتی ہے، کبھی کوئی نوکری کرتی ہے اور کبھی کام سیکھنے کے لیے گھر سے باہر جاتی ہے، مگر جب وہ کہیں کام کے سلسلے میں گھر سے باہر رہتی ہے تو بچے گھر کا اس قدر بُرا حال کرتے ہیں کہ گھر کو درست کرنے کے بھی اچھا خاصا وقت درکار ہوتا ہے۔ ہر عورت کو بیک وقت تین قسم کی ذمہ داریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جس میں ایک گھر داری، باہر کی نوکری اور اس کے بچوں کی ذمہ داری۔ اتنی مصروفیات کے باعث اسے فرصت ہی نہیں ہوتی کہ وہ اپنی زندگی کی دیگر ذمہ داریوں پر توجہ دے سکے۔ جب وہ باہر سے تھکی ہوئی گھر

واپس لوٹتی ہے تو گھر آکر بچوں کی وجہ سے ہونے والے نقصان کو دیکھ رہی ہوتی تو اس کا تصور بھی نہیں ہوتا کہ گھر کو درست کرنے میں اتنا ٹائم لگ سکتا ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو ان کے گھر میں رہنے والے دوسرے افراد یا خواتین کے شوہر بھی اس سلسلے میں ان خواتین کی مدد نہیں کرتے کیونکہ ان کو کوئی احساس ہی نہیں ہوتا۔ وہ سوچ رہے ہوتے ہیں کہ گھر داری کا تمام کام عورتوں ہی کی ذمہ داری ہے۔ اس لیے عورتوں کو اپنے فرائض اور ذمہ داری انجام دینی چاہیے۔

ثمینہ کی کہانی بھی اِسی محور کے گرد گھومتی ہے۔ وہ اپنے مستقبل کے لیے کیلی گرافی سیکھنے جاتی ہے لیکن جب واپس آتی ہے تو بچے گھر کی وہ حالت کرتے ہیں کہ گھر کو سمیٹتے سمیٹتے اُسے اتنا غصہ آتا ہے کہ وہ اپنے پانچ سالہ بچے کو تھپڑ مار دیتی ہے۔ بچہ تھپڑ کھا کر سو جاتا ہے تو اس کو اتنا دکھ ہوتا ہے کہ اس نے بچے کو تھپڑ کیوں مارا۔ حالانکہ وہ خود جب بچی تھی تو اپنے گھر میں اس قدر نقصان کرتی تھی۔ کبھی برتن توڑ دیتی اور کبھی کوئی اور نقصان کر دیتی۔ پھر بھی اس کے ابو نے اس کو کبھی نہیں ڈانٹا تھا۔ بلکہ اس کو ڈانٹنے یا بُرا بھلا کہنے کی بجائے وہ اس کی شرارتوں پر ہنس دیا کرتے تھے۔ ثمینہ کے سر میں قدرتی طور پر ایک سفید بال تھا جو کہ اس کی نوجوانی کی عمر سے ہی اس کو نظر آرہا تھا مگر آج جب وہ بچوں کو سنبھال کر گھر داری کے دیگر معاملات کے بعد شیشے کے سامنے کھڑی ہوتی ہے تو اس کو اپنی ڈھلتی عمر کا احساس ہوتا ہے اور وہ سفید بال کو دیکھ کر پریشان ہو جاتی ہے کہ یہ سفید بال اس کی جوانی ختم ہونے کی علامت ہے۔ وہ سفید بال کا تذکرہ کرتے ہوئے یوں گویا ہوتی ہے:

> ”یہ وہی پرانا سفید بال تھا جو کئی سال سے اس کے سر میں موجود تھا۔ بلکہ بچپن سے ہی کہہ سکتے ہیں مگر ثمینہ نے کبھی اس کی پروا نہیں کی تھی۔ اسے وہ کبھی چبھا نہیں تھا کیونکہ اسے پتا تھا کہ وہ بے عمر کا بال ہے۔ وہ بچپن سے جوانی تک آگئی تھی اور وہ بال اس کی خود اعتمادی میں فرق نہیں ڈال سکا۔ آج اسے یہ سفید بال بہت برا لگ رہا تھا لگتا تھا۔ جیسے اس کی بڑھتی عمر کی بری خبر سنانے چلا ہو۔ کل صبح اس کی تیسویں سالگرہ تھی اور وہ کچھ پریشان سی تھی“۔[۱۰]

لیکن اسی لمحے اس دن اسے خیال آتا ہے کہ آج تو اس کی سالگرہ ہے۔ اس کا میاں اس کے لیے پھولوں کا تحفہ لے کر آتا ہے۔ وہ پھولوں کے تحفے کو دیکھ کر خوش ہو جاتی ہے اور اسے اپنی ڈھلتی عمر اور جوانی کے گزرنے کا احساس تک بھی ختم ہو جاتا ہے۔ انسانی فکر کی یہ ایک ایسی سوچ ہے کہ اگر اسے کوئی دلاسہ دینے

والا یا ہمت بڑھانے والا ہو تو کبھی پریشان نہیں ہوتا۔ لیکن اگر اسے کوئی پریشان کرنے والا ہو تو انسان نہ صرف ظاہری بلکہ اپنے باطن میں بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس لیے یہ افسانہ ہمیں انسانیت کے ساتھ محبت کی فکر کا درس دیتا ہے۔ افسانے میں بتایا گیا ہے کہ ہم اپنا مستقبل سنوارنے کے لیے دل و جان سے محنت کر کے اونچا مقام حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اسی خواہش اور پریشانی میں ہماری ساری زندگی بسر ہو جاتی ہے اور وہ خواہش کبھی پوری نہیں ہوتی جو ہم اپنے دل میں بساتے ہیں۔ یہ کہانی ہمارے معاشرے کی عام سی کہانی ہے جس میں ایک عورت گھر داری میں مکمل طور پر اپنی ذات کو بھلا دیتی ہے۔

۹۔ کاغذی رشتہ ۔ کرشن چندر

کرشن چندر ۱۹۱۴ء کو وزیر آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ترقی پسند تحریک سے تھا۔ انہوں نے ۳۰۰ سے زیادہ افسانے لکھے اور ۴۵ ناولوں کے مصنف بھی ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعے خیال، نظارے نغمے کی موت شامل ہیں۔ کرشن چندر اپنی کہانیوں میں سارے معاشرے کی بات کرتے نظر آتے ہیں۔

کاغذی رشتہ، کرشن چندر کا افسانہ ہے جو ماہنامہ اردو ڈائجسٹ اپریل ۲۰۱۹ء میں شائع ہوا ہے۔ اس افسانے میں دو چچازاد بھائیوں کی سبق آموز کہانی بیان کی گئی ہے جنھیں لالچ کی ہوس نے اندھا کر دیا ہے۔ وہ لالچ میں آ کر ایک دوسرے کو قتل کر دیتے ہیں۔ کہانی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ سونو اور مونو دونوں آپس میں بھائی ہیں اور وہ مل کر چوریاں کرتے ہیں۔ چوری کر کے وہ اپنے اپنے حصّے کا مال تقسیم کر لیتے ہیں۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ وہ کسی گراوسری کی دکان (جنرل سٹور) سے چوری کرتے ہیں۔ جب سامان بانٹنے کی باری آتی ہے تو دونوں سمندر کے کنارے پہنچ کر ایک دوسرے کا سامان بانٹنے لگتے ہیں۔ جب رقم بانٹنے کی باری آتی ہے تو ان کے درمیان جھگڑا ہو جاتا ہے اور ایک دس کے نوٹ پر ایک دوسرے کو چاقو کے وار کر کے قتل کر دیتے ہیں۔ اس وقت رات کے تین بج رہے تھے۔ جب صبح ۶ بجے پولیس کی گاڑی وہاں سے گزرتی ہے تو وہ دیکھتے ہیں کہ سمندر کے کنارے دو لاشیں پڑی ہوئی ہیں۔ لاشوں کے ساتھ کچھ سامان بھی بکھرا پڑا ہے۔ اس پر پولیس والوں کو شبہ ہوتا ہے کہ ان دونوں میں مال کی تقسیم پر کوئی جھگڑا ہوا ہو گا۔ سونو مونو سے کہتا ہے کہ میں یہ دس روپے نہیں لوں گا۔ مونو کہتا ہے کہ میں بھی یہ دس کا نوٹ نہیں لیتا ہوں اور یہی بات جھگڑے کی بنیاد بنتی ہے۔ ان کے مکالمات کو مصنف یوں بیان کرتا ہے:

"سونو غصے سے بولا آج میں نے کمند لگائی تھی حساب سے جو کمند لگاتا ہے اسے حصّہ زیادہ ملتا ہے۔ میں اس پر بھی چپ ہوں پر تم بے ایمانی کیے جا رہے ہو۔ زبان سنبھال کے بات کرو میں نے پچھلی چوری میں کمند لگائی تھی بھول گئے تو تم نے پانچ روپے بھی تو زیادہ لیے تھے تو آج تم بھی پانچ روپے لے لو اور بک بک بند کرو۔ میں بک بک کرتا ہوں۔ سونو کے سارے جسم میں غصے کی پھریریاں دوڑنے لگیں۔ میں نہیں لیتا یہ پانچ روپے کا نوٹ بدل کے دو۔ نہیں بدلا جائے گا سونو نے طیش میں آکر کہا اس کی آنکھوں کے سامنے چنگاریاں ناچنے لگیں۔ ہاں نہیں بدلا جائے گا نوٹ۔ مونو غصے سے بولا سونو نے چاقو نکال لیا پھر مونو نے بھی"۔ (۱۱)

اس پر دونوں ایک دوسرے کو بے دردی سے قتل کر دیتے ہیں۔ جب پولیس کا صبح ادھر سے گزر ہوتا ہے تو وہ دونوں کی لاشوں کو دیکھ کر اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں۔ جب ان کو پہچانتے ہیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ پہلے بھی چوری کے جُرم میں قید کاٹ چکے ہیں۔ پولیس والوں کو پتا چلتا ہے کہ یہ دونوں آپس میں بھائی تھے اور یہ مل کر چوری کرتے تھے۔ اس بات سے پولیس والوں کو پتہ چل گیا۔ ایک پولیس والا کہتا ہے کہ بھائی کا رشتہ ایسا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ یہ سب کاغذی رشتے ہیں۔ دنیا میں ایک دوسرے کو جب پیسے کی لالچ اور ہوس پیدا ہو جائے تو کوئی کسی کا بھائی ہوتے ہوئے بھی اس کا خون کر دیتا ہے۔ اس کہانی سے یہ سبق ملتا ہے کہ لالچ انسان کو موت کے منہ تک پہنچا دیتی ہیں۔ لالچ کی ہوس میں انسان اس قدر اندھا ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے حقیقی رشتوں کی پہچان تک بھول جاتا ہے۔ افسانے کی یہ کہانی ہمیں رشتوں تقدس کے حوالے سے غور و فکر کی دعوت دیتی ہے کہ لالچ میں آکر انسان کو اس قدر بھی اندھا نہیں ہونا چاہیے کہ ہم یہ تک بھی بھول جائیں کہ ہمارے تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟

حکایت کے افسانے

۱۰۔ ایک حقیقت ایک فسانہ—واماندگی شوق، فرخندہ لودھی

فرخندہ لودھی ۱۹۳۷ء میں ساہیوال ہوشیار پور میں پیدا ہوئیں۔ ان کو شہرت پارنتی افسانہ سے ملی جو اوراق میں شائع ہوا۔ یہ سال ان کی ادبی زندگی کا اہم سال ثابت ہوا اور اس افسانے کی وجہ سے انہیں ادبی دنیا میں جانا جانے لگا۔ ان کے افسانوں کی پہلی کتاب "شہر کے لوگ" ہیں۔ اس کے علاوہ بھی آرسی، خوابوں کے

کھیت، رومان کی موت اور ناول حسرت، عرضِ تمنا لکھے۔ ۲۰۰۶ء میں ان کو صدارتی تمغہ برائے حسن کار کردگی سے نوازا گیا۔

ایک حقیقت ایک فسانہ، واماندگی شوق، فرخندہ لودھی کا افسانہ ہے۔ یہ افسانہ ماہنامہ حکایت، مئی ۲۰۱۸ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ اس افسانے میں ایک گھر کے سربراہ کی کہانی بیان کی گئی ہے، جس کے تین چار بچے ہیں اور وہ سب شادی شدہ ہیں اور اپنے اپنے کمروں میں رہتے ہیں۔ جس مکان میں وہ رہائش پذیر ہیں اُس کی چار منزلیں ہیں جن میں ہر منزل پر ایک بیٹا اپنی فیملی کے ساتھ رہتا ہے۔ ان میں سے ایک سب سے بڑا بیٹا جو کہ بیمار ہے اور اس کی ایک بیٹی ہے جس کا نام گوری ہے۔ ان چاروں بھائیوں کی ایک بہن بھی ہے جو غیر شادی شدہ ہے۔ ان کی والدہ فوت ہو چکی ہیں۔ ان کا باپ دوسری شادی کر لیتا ہے اور سب سے اوپر والے فلور پر اپنی دوسری بیوی کے ساتھ رہتا ہے۔ سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوتے ہیں۔ کسی بچے کو بھی اپنی بہن بانو کی شادی کی کوئی فکر نہیں ہوتی۔ بہن کی شادی نہ ہونے کی وجہ سے بڑا بھائی گوری کا والد تشویش میں مبتلا رہتا ہے۔ وہ سوچتے ہیں کہ اپنی بہن کی شادی کر دے لیکن اس کا کوئی رشتہ نہیں ملتا کیونکہ وہ اتنی خوبصورت نہیں ہے کہ جو اِسے دیکھے اس کا رشتہ مانگ لے۔ بہت سوچ بچار کے بعد گوری کا والد رشتے کروانے والی کو بلا کر اپنی بہن کی جگہ گوری کو دکھا دیتا ہے۔ رشتے والے گوری کو پسند کرتے لیکن وہ گوری کی بجائے اپنی بہن کی شادی اُس جگہ کر دیتا ہے۔ جب گوری اور بانو کی شادی ہوتی ہے تو اس کا منظر کچھ یوں بیان کیا گیا ہے:

> ”دونوں براتیں ایک روز ہی اتریں اور دونوں کی رخصتی بھی ایک ساتھ ہوئی جیسے دو جنازے اٹھ گئے ہوں۔ مہمانوں کے باوجود گھر خالی خالی تھا۔ سب سوگوار تھے ماں کیسے بین کر کر کے روئی تھی۔ بھائی اس رات کو نہ سو سکا، سینے میں درد دوچند تھا اور سوچوں نے یلغار کر رکھی تھی۔ ادھر بانو سسرال کے گھر میں نئی زندگی کے حادثے سے دوچار ہونے کے لئے گم سم بیٹھی تھی۔ مہندی لگے نازک ہاتھ نے گھونگٹ کا کنارا تھام رکھا تھا، ہر آہٹ پر کان لگائے تھے۔ سراج آیا صورت دیکھنے کے لیے جھکا مگر بانو نے چہرہ گھٹنوں میں دے دیا۔ سراج نے دیکھا وہ کانپ رہی ہے اور گورے کان کی لو میں جھمکا پڑا جھومتا ہے اور چاندی جیسی گردن پر کالی چوٹی کا ناگ پھن پھیلائے بیٹھا ہے۔ سراج کے سینے میں یکبارگی پیار اُمڈ آیا“۔ (۱۲)

ان کی بہن اپنے گھر (سسرال) چلی جاتی ہے وہاں اس کا شوہر اسے ناپسند کرتا ہے اور اس کو کہتا ہے کہ میں اس کو طلاق دے دوں گا۔ بانو طلاق سے خوفزدہ ہو جاتی ہے تو اس کا ذکر اپنے بھائی سے کرتی ہے۔ اس کا بھائی اس کے میاں کے پاس جاتا ہے اور منت سماجت کر کے اپنی بہن کا گھر بسانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بانو کا بھائی اُس کے شوہر کو کہتا ہے کہ اس وقت طلاق نہ دیں۔ میں نے اس کو اپنی بیٹی بنا رکھا ہے۔ بڑا بھائی منت سماجت کے بعد بانو کا گھر بسا دیتا ہے لیکن خود اپنی جان کی بازی ہار جاتا ہے۔ انسان گھر بسانے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔ فکری تجزیہ کے بعد افسانے سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ جو لوگ دوسروں کی بھلائی کے لیے سوچتے ہیں، اللہ تعالیٰ خود اُن کی مدد کرتا ہے اور ان کے کام سنوارتا ہے۔ اس لیے زندگی میں ہمیشہ دوسروں کے لیے اچھا سوچنا چاہیے تاکہ آپ کے لیے بھی اچھے اسباب پیدا ہو سکیں۔

۱۱۔ ادھوری کہانی-سیدہ شاہدہ شاہ

سیدہ شاہدہ شاہ اُردو اور پنجابی زبان کی شاعرہ بھی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی کہانیاں ڈائجسٹوں میں شائع ہوتی ہیں۔

ادھوری کہانی، سیدہ شاہدہ شاہ، کی لکھی ہوئی کہانی ہے جو ماہنامہ حکایت، جون ۲۰۱۸ء کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔ یہ کہانی ایک تاجر کے بیٹے شکیل کی ہے جو جہلم کا رہنے والا ہے۔ شکیل نے بی اے تک تعلیم حاصل کی اور جہلم شہر میں اپنے باپ کی الیکٹرانکس کی دکان پر بیٹھنا شروع کر دیا۔ اس طرح شکیل کے والد سلیم نے الیکٹرانکس کی دکان اپنے بیٹے کے سپرد کر دی۔ ایک دن ایک بیکارن دکان پر آتی ہے، جس کا نام عنبرین تھا اور اس نے پوسٹر پر کچھ لکھ رکھا تھا کہ اس کے والد کو کینسر ہے۔ وہ پہلی نظر میں شکیل کے دل کو اچھی لگی۔ شکیل اس نے اسے کولڈ ڈرنک پلائی اور ایک ہزار روپے بھی دیے۔ دو ایک دن بعد وہ دوبارہ آ جاتی ہے۔ اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ شکیل کو اس کے ساتھ محبت ہو جاتی ہے اور وہ دونوں اب شہر کے ہوٹلوں میں ملاقات کا سلسلہ شروع کرتے ہیں اور دوسرے شہروں میں ملتے رہتے ہیں۔ آخر شکیل اس کے ساتھ شادی کر لیتا ہے۔ وہ ڈکیتوں کے گروہ سے تعلق رکھتی تھی۔ شادی کے بعد شکیل کا والد سلیم اپنی بیگم شکیلہ کو لے کر حج پر چلا جاتا ہے۔ ساس سسر کی عدم موجودگی میں عنبرین اپنے گروہ کے چار بندوں کو بلاتی ہے اور جو شکیل کے گھر میں ڈاکا ڈالتے ہیں۔ سارا مال و اسباب، دولت اور نقدی لوٹ کر فرار ہو جاتے ہیں۔ شکیل کا والد سعودی عرب سے اپنے گھر فون کرتا ہے مگر کوئی اٹینڈ نہیں کرتا تو اسے تشویش ہوتی ہے۔ وہ اپنے رشتے

داروں کو اطلاع دیتا ہے۔ جب اس کے رشتہ دار آکر دیکھتے ہیں تو شکیل اور اس کے ملازموں کو رسیوں سے باندھا گیا تھا جبکہ اس کی اہلیہ عنبرین کو ڈاکو اغوا کر کے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ واقعے کا پرچہ درج کروایا جاتا ہے تو کچھ دن بعد شکیل کو انسپکٹر تھانے بلاتا اور بتاتا ہے کہ عنبرین نے یہ سارا پلان کیا تھا اور آپ کی تمام جمع پونجی، آپ کے گھر بار سے واقف ہونے کی بنا پر اس نے اپنے گروہ کے بندوں کو اطلاع دی اور انھوں آکر آپ کا سارا مال و اسباب لوٹا ہے۔ شکیل کے دل میں عورت کے لئے ہمیشہ سے نفرت ہو جاتی ہے اور اب جبکہ اس وقت اس کی عمر پچاس برس ہو گئی ہے تو یہ شادی کے نام سے بھی ڈرتا ہے۔ اب کوئی بھی شادی کرتا ہے تو شکیل اس کو بھی مشورہ دیتا ہے کہ شادی نہ کریں۔ شکیل کو تھانے بلا کر جب انسپکٹر عباس علی یہ کہانی بتاتا ہے کہ:

> ”آپ کی عنبرین اس وقت حوالات میں بند ہے۔ شکیل کو یوں لگا جیسے اس کے قریب ہی کوئی بم پھٹا ہو۔ کیا؟ وہ اچھل کر اضطراری انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔ آیئے پہلے میں آپ کو آپ کی عنبرین کا دیدار کرا دوں، پھر آفس میں آکر تفصیل سے بات کرتے ہیں۔ انسپکٹر عباس علی نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا اور شکیل کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے حوالات کی طرف چل پڑا۔ وہ حوالات کے ٹھنڈے ٹھار فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے بکھرے ہوئے بال اور سرخ متورم آنکھیں اس کے رتجگے کی چغلی کھا رہی تھیں۔ عنبرین شکیل نے تڑپ کر اسے حوالات کی سلاخیں تھامتے ہوئے پکارا۔ عنبرین نے چونک کر سر اٹھایا، چند لمحے اجنبی نگاہوں سے شکیل کو دیکھا اور دوبارہ سر جھکا لیا“۔ (۱۳)

اب شکیل اپنے کیے پر پشیمان ہوتا ہے اور سوچتا ہے کہ ہمیں ہر کسی پر بلا سوچے سمجھے اعتماد نہیں کر لینا چاہیے بلکہ کسی پر بھروسہ کرتے وقت پوری تحقیق کر لینی چاہیے تاکہ بعد میں پچھتاوا نہ ہو۔ فکری لحاظ سے کہانی میں یہ سبق پوشیدہ ہے کہ بظاہر نظر آنے والی ہر چیز سونا نہیں ہوتی بلکہ اس کے پیچھے چھپی ہوئی ایک مکمل کہانی ضرور ہوتی ہے۔ جب ہمیں وہ کہانی معلوم ہوتی ہے تو اصل حقیقت کھل کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہ ہمارے معاشرے کا المیہ ہے۔ اس لیے ہمیں کسی بھی معاملے میں جلد بازی نہیں کرنی چاہیے بلکہ تحقیق کے بعد ہی کسی فیصلے پر پہنچنا چاہیے کیونکہ ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی۔

۱۲۔ متر آدمی۔ بلونت سنگھ

بلونت سنگھ ۱۹۲۱ء میں سکھ خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کا افسانوی مجموعہ طلسم خیال ۱۹۴۷ء کو منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے میں بارہ افسانے موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے افسانوی مجموعوں میں جگا، پہلا پتھر، تار و بود، ہندوستان ہمارا شامل ہیں۔ ان کے ہاں ہمیں پنجاب کے دیہاتوں اور خاص کر سکھوں کی معاشرت اور ماحول کا گہرا مشاہدہ نظر آتا ہے۔

افسانہ نگاری میں بلونت سنگھ کا نام بہت اہم ہے۔ متر آدمی ان کا ایک سماجی افسانہ ہے جو حکایت دسمبر ۲۰۱۹ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ اس افسانے میں بتایا گیا کہ مارگلہ کے علاقے میں میگن نامی ایک چھوٹا سا غیر معروف گاؤں ہے۔ وہاں پہ عشق و محبت کی بہت سی داستانیں بکھری پڑی ہیں، وہاں ایک حسین لڑکی گورنام کے وجود کا ظہور ہوتا ہے جس کے حسن کے چرچے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ بہت سے نوجوان اس پر عاشق ہو جاتے ہیں۔ اس کے قصّے علاقے میں ہر خاص و عام کی زبان پر تھے۔ بہت سے نوجوانوں نے اسے اپنا حق سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ ایک دفعہ سرکار حسن نے اعلانیہ کچھ نوجوانوں کے جھرمٹ میں بیٹھ کر یہ کہہ دیا کہ وہ گورنام پر عاشق ہے اور اس سے محبت کرتا ہے۔ لیکن اس مجمع میں کوئی دوسرا نوجوان تھا اس نے اس کو بُری طرح سے مارا اور گھر میں قید کر دیا کہ آئندہ وہ کبھی گورنام کا نام بھی نہ لے۔ وقت گزرتا رہا، ایک دن گورنام پانی بھرنے کے لیے کنویں پر گئی تو وہاں ایک نوجوان اونٹنی پر سوار ہو کر آیا اور اس نے گورنام کے ساتھ گھر جانے کے لیے اصرار کیا۔ جب وہ گورنام کے گھر پہنچا تو اس نے گورنام کے باپ سے کہا کہ وہ ان کے گھر میں ایک رات قیام کرنا چاہتا ہے۔ رات کو جب اس نے ان کے گھر قیام کیا تو جاتے ہوئے گورنام کو بہت سے سونے چاندی کے زیورات دیے جنھیں لے کر گورنام خوش ہو گئی۔ گورنام نے یہ زیورات اپنے ہاں چھپا لیے۔ اگلے روز جب نوجوان ان کے گھر سے جانے لگا تو گورنام کا دل خفا ہونے لگا۔ گورنام چاہتی تھی کہ وہ یہیں رُک جائے لیکن ایسا نہ ہو سکا اور وہ چلا گیا۔ اس کے بعد کبھی کبھار وہ ان کے گھر آتا اور بہت سے تحفے تحائف گورنام کو دے کر چلا جاتا۔ ایک دن گورنام نے اس سے کہا کہ وہ کوئی ڈاکو تو نہیں ہے۔ کیونکہ ڈاکوؤں سے اس کو سخت نفرت تھی۔ وہ رات قیام کرنے کے بعد جانے لگا تو گورنام نے پوچھا کہ میں اپنے مہمان کا نام پوچھ سکتی ہوں۔ اس پر مہمان نے بتایا کہ میرا نام "سردار جگت سنگھ" ہے اور میں جگا کے نام سے مشہور ہوں۔ وہ کئی ایک ڈاکے ڈال چکا تھا۔ اس نے بتایا کہ اگر آپ نے کسی کو بتایا کہ میں یہاں آکر رہتا ہوں تو میں آپ کے پورے

خاندان کو مار ڈالوں گا۔ گورنام چاہتی تھی کہ جگا اس سے شادی کر لے۔ لیکن اس کے گھر والوں نے اس کا رشتہ دلیپ سنگھ سے طے کر رکھا تھا۔ گورنام دلیپ سنگھ سے شادی کے لیے رضامند نہیں تھی۔ سردار جگت سنگھ گورنام سے اس قدر محبت کرتا تھا کہ وہ اس کے بغیر ایک پل بھی نہیں جینا چاہتا تھا۔ اس کی گورنام سے محبت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے:

> "ایک دن غروب آفتاب کے بعد وہ بھیکن میں داخل ہوا۔ گھر پہنچ کر پتہ چلا کہ گور نام ساتھ والے گاؤں میں جلاہوں کو سوت دینے کے لیے گئی ہوئی تھی۔ جگے نے آئینے میں اپنی صورت دیکھی۔ اس نے پگڑی ذرا کج کی، شملہ ذرا اور بلند کیا۔ پھر اس نے سب سے نظریں بچا کر چراغ میں سے سرسوں کا تیل ہتھیلی پر ڈالا الٹ لیا اور اپنی گھنی اور کھردرے بالوں والی گرد آلود داڑھی پر خوب اچھی طرح مل لیا/ پھر وہ مونچھوں کو بل دیتا ہوا گھر سے باہر نکلا اور آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا پانچ فرلانگ تک چلا گیا۔ ہر طرف دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ چاند کی ملگجی روشنی میں وہ ایک بھوت کے مانند دکھائی پڑتا تھا۔ دور سے ایک صورت دکھائی دی۔ اسے غور سے ٹکٹکی باندھ کر دیکھا۔ کوئی عورت تھی اور یقیناً تھی بھی گورنام۔ جگا اصیل مرغ کی طرح تن کر کھڑا ہو گیا۔ قریب آتے ہی مسکرا دی لیکن مسکراہٹ میں کچھ متانت جھلکتی تھی۔ سر پر ایک بھاری گٹھری تھی میری تو گردن ٹوٹ گئی"۔ (۱۴)

گورنام سے شادی کرنے کی خواہش میں سردار جگت سنگھ کا خیال تھا کہ وہ دلیپ سنگھ کو قتل کر دے گا۔ اس مقصد کے لیے وہ گاؤں کے قریب ایک نہر کے خونی پل پر، یہاں بہت سے قتل پہلے بھی ہو چکے تھے، جا کر چھپ گیا۔ وہ دلیپ سنگھ کا انتظار کرنے لگا۔ اُسے معلوم تھا کہ دلیپ سنگھ یہاں سے ضرور گزرے گا کیونکہ دلیپ سنگھ جو کہ سنار کا کام کرتا تھا اور اس کی گاؤں میں ایک معمولی سی دکان بھی تھی۔ وہ شہر سے اپنا سودا لے کر آرہا تھا جبکہ جگت سنگھ اس کو مارنا چاہتا تھا۔ وہ اپنی طرف سے اس کو مار کر پھینک دیتا ہے۔ جب وہ اُسے قتل کر کے بڑے اطمینان سے گورنام کے گھر چلا گیا تا کہ گورنام کو بتائے کہ وہ دلیپ سنگھ کو قتل کر چکا ہے۔ لیکن عین اسی وقت دلیپ سنگھ بھی وہاں پہنچ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ شکر ہے رات خونی پُل پر جو لڑائی ہوئی تھی میں اس میں بچ گیا۔ کیونکہ عین موقع پر میری مدد کے لیے ایک آدمی وہاں پر آ گیا، جس نے ڈاکوؤں کو مار دیا اور مجھے بچا لیا تھا۔ اس پر سردار جگت سنگھ شرمندہ ہوتا ہے۔ اس طرح سے گورنام کی شادی دلیپ سنگھ سے

ہو جاتی ہے۔ دلیپ سنگھ اور گورنام اس واقعے سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔ اس افسانے کا فکری پہلو یہ ہے کہ انسان جو کچھ سوچتا ہے وہ شاید پورا نہیں ہوتا مگر جو اللہ کی طرف سے ہونا ہوتا ہے وہ کسی کو معلوم نہیں ہوتا۔ جس کے حصے میں جو لکھا گیا ہے وہ اِسے ہر حال میں مل کر رہتا ہے۔ تقدیر اللہ لکھتا ہے، انسان بے شک لاکھ کوششیں کرتا رہے ہوتا وہی ہے جو اللہ چاہے۔

سیارہ ڈائجسٹ

۱۳۔ زلیخا-احمد ندیم قاسمی

احمد ندیم قاسمی کا یہ افسانہ ان کے افسانوی مجموعے "بازارِ حیات" میں شامل ہے۔ ۱۹۵۹ء میں یہ افسانوی مجموعہ منظرِ عام پر آیا۔ اس میں ۱۳ افسانے موجود ہیں۔

ان کا افسانہ زلیخا معاشرتی افسانہ ہے جو ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ، جنوری ۲۰۱۷ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ اس افسانے میں امیر اور غریب کے فرق کو واضح کیا گیا ہے۔ افسانہ میں زلیخا جو ایک گھر میں نوکرانی ہے اور اس کے ہاں بچے کی ولادت متوقع ہے جس کے باعث وہ پریشان ہے۔ جس گھر میں وہ کام کرتی ہے وہاں کا مالک ان کو کہتا ہے کہ ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ زلیخا کا آپریشن ہو گا۔ لیکن زلیخا کہتی کہ ڈاکٹر کو بے شک ڈبل فیس دے دو لیکن وہ آپریشن کی بات نہ کرے۔ نارمل ڈلیوری سے بچے کی پیدائش ہو تو اچھا ہے۔ زلیخا درد کے باعث بہت زیادہ تکلیف میں ہے۔ وہاں ایک بلی بھی ہے جو کہ شور مچاتی ہے مگر زلیخا کی چیخ و پکار بلی سے بھی زیادہ ہے۔ زلیخا نے ڈاکٹر سے پوچھا کہ بیگم صاحبہ! آپ کے ہاں کبھی بچہ پیدا ہوا ہے؟ ڈاکٹر بتاتی ہے کہ ہم شریف لوگ ہیں شادی سے پہلے ہمارے ہاں بچہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ لوگوں کا کیا خیال ہے کہ شادی سے پہلے بچہ ہو سکتا ہے؟ انور خالد اور سجاد تینوں دوست مل کر زلیخا کو تسلی دیتے ہیں کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اس طرح کے معاملات میں چھوٹی موٹی پریشانیاں ہو جاتی ہیں۔ تم بیوقوف نہ بنو اور اتنی پریشانی نہ دکھاؤ۔ اللہ کرے کہ زچہ و بچہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جب درد زیادہ ہوتا ہے تو اس کی وجہ سے تھوڑی بہت پریشانی تو ہوتی ہے۔ اس کا نقشہ افسانے میں کچھ اس طرح سے کھینچا گیا ہے :

> "زلیخا اس زور سے چیختی ہے اور اتنی دیر تک چیختی ہے جیسے یہ چیخیں قیامت تک نہیں رکیں گی جیسے ان چیخوں کی شدت سے زلیخا کا جسم پھٹ کر اور بوٹی بوٹی ہو کر فضا میں بکھر جائے گا۔ اس کی چیخوں میں وحشت ہے، آسیب ہے، موت ہے"۔ (۱۵)

دنیا میں جسے کوئی پریشانی ہوتی ہے۔ اُس کا ذہن اسی پریشانی کی طرف لگا رہتا ہے۔ جب دوسرے لوگ مل کر اس کی پریشانی کا ذکر کرتے ہیں اور اس کو تسلی دیتے ہیں تو اس کا حوصلہ بلند ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے دل کو کچھ تسلی دے لیتا ہے۔ اس افسانے میں انسان کی فکری نفسیات کا تذکرہ بھرپور انداز میں کیا گیا ہے جس سے انسانی جذبات کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ انسان کو صرف اپنی تکلیف اور پریشانی کا ہی نہیں سوچنا چاہیے بلکہ دوسروں کے جذبات کو بھی محسوس کرنا چاہیے۔ کیونکہ جب اُسے خود یہی تکلیف ہوتی ہے تو وہ کس قدر شور کرتا ہے۔ زچگی کے دوران ہونے والی تکلیف سب ماؤں کو ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے ماں کے قدموں تلے جنت رکھی ہے۔

۱۴۔ چاندنی کا سفر - کوثر چاندپوری

کوثر چاندپوری ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۹۰ء میں ان کا انتقال ہوا۔ یہ معروف افسانہ نگار، ناول نگار، ماہرِ غالبیات، مزاح نگار اور حکیم تھے۔ ۱۳۷ کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کے ۱۱۴ افسانوی مجموعے اور ۱۷ ناول میں ان کی شعر گوئی اور مضامین پریم چند کے فوراً بعد سامنے آئی۔ ان کا نام آتے ہی پریم چند کا تصور ذہن میں آجاتا ہے۔

چاندنی کا سفر، کوثر چاندپوری کا افسانہ ہے۔ یہ افسانہ ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ، مئی ۲۰۱۷ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ اس میں سعیدہ نامی ایک خاتون کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ سعیدہ نے اپنے سپنوں کا محل تعمیر کیا تھا کہ وہ شادی کے بعد پُرسکون زندگی بسر کرے گی لیکن خدا کو یہ منظور نہ تھا۔ سعیدہ کا میاں تنویر ایک انجینئر تھا۔ وہ کسی سائیٹ پر کام کرتا تھا رات کو اپنی گاڑی پر واپس آرہا تھا تو اس کی گاڑی کسی گہری کھائی میں گر جاتی ہے اور اس کو گہری چوٹ کے باعث ایک ہسپتال میں داخل کرادیا جاتا ہے۔ سعیدہ اس کی تیمارداری میں مصروف ہو جاتی ہے لیکن تنویر دنیا والوں سے بے خبر ہو کر ہسپتال میں پڑا ہے۔ سعیدہ اس کو دوائی وغیرہ پلاتی ہے اور اس کی خدمت میں اس قدر مصروف رہتی ہے کہ اسے دنیا کا کوئی ہوش نہیں ہے۔ لیکن خدا کی قدرت کہ وہ فوت ہو جاتا ہے۔ جس کے ساتھ ہی وہ نیم پاگل ہو جاتی ہے اور وہ اپنی خالہ کے ہاں منتقل ہو جاتی ہے مگر اس کی بیٹی سعیدہ اپنے منگیتر کی موت کا صدمہ برداشت نہیں کر سکتی اور وہ پاگلوں جیسی حرکتیں کرنا شروع کر دیتی ہے۔ ایک روز جب جمیل اپنی خالہ کے گھر ملنے جاتا ہے تو وہ خالہ کے گھر کی منظر کشی کچھ یوں کرتا ہے:

"خالہ جان کے یہاں ایک نئی عورت نظر آئی مجھے کون ہے وہ۔ اچھا سروری بیگم کی بات کر رہے ہو تم جانتے نہیں انہیں دیکھا تو ہو گا کبھی سیدوں والے محل میں رہتی تھیں۔ آنگن میں بیری تھی بڑے میٹھے بیر آتے تھے۔ وہ مرزا فضل کی بڑی بیگم ہیں اور اب دوسرا سوال یہ کرو گے تم کہ وہ لڑکی کون ہے؟ میں آپ ہی بتائے دیتی ہوں وہ سروری بیگم کی لاڈلی بیٹی سعیدہ ہے جسے انہوں نے بڑے ناظم سے پرورش کیا ہے۔ پچھلے دنوں اس کے ساتھ بہت بڑی ٹریجیڈی ہو گی بہت بڑی۔ اس کے سننے کو پتھر کا کلیجہ چاہیے۔ آپی کی آنکھوں میں بگولے سے ناچنے لگے غبار سا چھا گیا۔ بتایئے آخر کیا ہوا اس غریب کے ساتھ۔ سروری بیگم اسی کی وجہ سے ان کے یہاں آگئی ہیں کچھ دنوں کے لیے۔ سب کا خیال ہے کہ سعیدہ کو کچھ ہو گیا ہے اور میں کہتی ہوں یہ سب پرانی باتیں ہیں۔ جب سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی تھی اور چاند تک انسان نہیں پہنچا تھا اس وقت ضرور توہمات کی اہمیت تھی۔ اب کون یقین کر سکتا ہے ایسی باتوں پر۔ بہر حال اسے کچھ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو اس کے دماغ پر صرف تنویر کی موت کا بھوت سوار ہے وہ اس صدمے سے اپنے حواس کھو بیٹھی ہے"۔ (۱۶)

ایک بیڈ پر فرضی تنویر کو لٹا کر اس کی تیمار داری کرتی رہتی ہے لیکن اس کو کوئی افاقہ نہیں ہوتا۔ اس کے گھر والے سمجھتے ہیں کہ اس پر شاید کوئی جنات وغیرہ کا سایا ہو گیا ہے جس کے باعث یہ ایسی حرکتیں کر رہی ہے لیکن سب کہتے کہ اس پر سایہ وغیرہ کچھ نہیں ہے۔ اس کو کوئی ذہنی پریشانی ہے جس کی وجہ سے یہ ایسی حرکتیں کر رہی ہے اور یہ اُس ذہنی پریشانی سے باہر نہیں آرہی ہے۔ ایک دن جمیل یہ سوچ کر اُسی جگہ لیٹ جاتا ہے اور وہ جمیل کی تیمار داری میں مصروف ہو جاتی ہے۔ وہ جب جمیل کو اچھا ہوتے ہوئے محسوس کرتی ہے تو وہ بہت خوش ہو جاتی ہے کہ تنویر اچھا ہو گیا ہے اور اب یہ صحت یاب ہو جائے گا۔ اس طرح وہ کسی حد تک اپنے ذہن کو مطمئن کر کے اُس پریشانی سے نکل آتی ہے۔ افسانے کا فکری تجزیہ بڑی خوبصوتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ انسان اپنے مستقبل کے خواب دیکھتا ہے۔ جب ان کی تعبیر کو نہیں پاتا تو وہ اندر سے کتنا ٹوٹ جاتا ہے، وہ یہ بات کسی کو بتانے کے قابل بھی نہیں رہتا۔ جب وہ اپنی خوشیاں واپس آتی دیکھتا ہے تو اس کے دل کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ کسی کی موت کا صدمہ دوسرے انسان کو نیم پاگل کر دیتا ہے۔

۱۵۔ جگر گوشے۔ کرشن چندر

جگر گوشے، کرشن چندر کا ایک عوامی افسانہ ہے جس سے معاشرے میں ہر فرد کو ایسے کئی مسائل سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ یہ افسانہ ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ، جولائی ۲۰۱۷ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ اس افسانے میں ایک کامیاب میاں بیوی کی زندگی کا احوال بیان کیا گیا ہے کہ پہلے لوگ ان پر انگلیاں اٹھاتے تھے لیکن جب اُن کی عملی زندگی شروع ہوتی ہے تو لوگ اس سے سبق حاصل کرتے ہیں۔ اس افسانے میں بتایا گیا ہے کہ شادی کے بعد ہر جوڑے کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کے ہاں بچہ پیدا کیوں نہیں ہوتا۔ لیکن اس افسانے میں ایک ایسے شادی شدہ جوڑے کی کہانی بیان کی گئی ہے کہ ان کو اگر کوئی کہتا ہے کہ ان کے ہاں بچہ پیدا کیوں نہیں ہوتا تو وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ یہ خدا کی دین ہے۔ اس کے بعد انھیں ہر کوئی مشورہ دیتا ہے اور بچوں کی اہمیت کے بارے میں بتاتا ہے مگر جب وہ دیکھتے ہیں کہ کسی کے دس بچے ہیں، کسی کے بارہ اور کسی کے چودہ بچّے ہیں تو وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ یہ سراسر آبادی پر بوجھ ہے اور وہ اس بات کا ادراک بھی کرتے ہیں کہ اگر زیادہ بچے پیدا ہوئے تو سائنسدانوں نے اس بات کا خدشہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ زمین پر اتنا زیادہ بوجھ ہو جائے گا کہ یہ خود بخود تباہ ہو جائے گی۔ وہ بچوں کے فوائد اور نقصان کے بارے میں خوب جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے زیادہ بچوں کے بہت سے فوائد اور نقصانات دیکھے ہوئے ہیں۔ وہ اس طرح کا واقعہ بیان کرتے ہوئے اپنے ایک جاننے والے کی مثال دیتے ہیں اور دولت رام کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں ان کا ایک دوست ہے جو ان کو ہر وقت بچوں کی اہمیت کے بارے میں بتاتا رہتا ہے کہ بچوں کی حفاظت کی جائے۔ جب اس کو یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ خدا کی دین ہیں تو اس بات پر اس نے بتایا کہ انسان کو خود بھی کوشش کرنی چاہیے۔ ڈاکٹر کے پاس جانا چاہیے اپنا علاج کروانا چاہیے، اپنی بیوی کا علاج کروانا چاہیے اور اس طرح سے بچوں کی پیدائش کرنی بہت ضروری ہے۔ بچوں کی اہمیت کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے افسانے میں بتایا گیا ہے:

> ”اکثر کہا گیا ہے کہ بچے قوم کی دولت ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو ہندوستان کا شمار دنیا کی امیر ترین قوموں میں کرنا چاہیے۔ زندگی کے کسی اور شعبے میں ہم دولت پیدا کریں یا نہ کریں۔ بچے پیدا کرنے میں ہمارا کوئی ثانی نہیں۔ ہمارے محلے میں ایک صاحب رہتے ہیں، نام ان کا دولت رام ہے اور واقعی بچوں کی دولت کے اعتبار سے وہ ہمارے محلے کے رئیس سمجھے جاتے ہیں۔ اب تک دس بچے تصنیف فرما چکے ہیں۔ جب ان

کے ہاں پہلا بچہ ہوا تو ان کے گھر میں موٹر گاڑی تھی، ریفریجریٹر، تھا ریڈیو گرام تھا، غالیچہ تھا، صوفہ تھا، بجلی کا پنکھا تھا، غرض یہ کہ آرام و آسائش کی ہر چیز مہیا تھی پھر جب دوسرا بچہ پیدا ہوا تو موٹر گئی، تیسرا بچہ ہونے پر ریڈیو گرام گیا، چوتھے پر ریفریجریٹر، پانچویں پر غالیچہ، چھٹے پر صوفہ، ساتویں پر پنکھا، اب دسویں بچے کی پیدائش پر چند ہفتے ہوئے ان کے گھر کی بجلی کٹ گئی ہے"۔ (۱۷)

اس جوڑے کے گھر ان کے پڑوس سے ایک دن ان کو ملنے والا دوست دس بچوں کو لے کر آجاتا ہے۔ سب بچے الگ الگ کوئی نہ کوئی کام خراب کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ کوئی ایک چیز خراب کر دیتا ہے تو دوسرا دوسری، سارے گھر کا سامان تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ اس سے تنگ آکر وہ توبہ کرتے ہیں اور ان بچوں سے بڑی مشکل سے جان چھڑاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں ایک بچہ دے۔ جب ان کے گھر بچہ پیدا ہو جاتا ہے تو اس کی پرورش اس حساب سے کرتے ہیں کہ وہ بھی جب بڑا ہو گا اور اس کو بھی کسی کے گھر لے کر جائیں گے اور گھر والوں کا کسی نہ کسی طرح خوب نقصان کروائیں گے۔ افسانے میں غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے کہ جس چیز کی ہم کمی محسوس کرتے ہیں اگر وہ ہمارے پاس آجائے تو ہم اس کا استعمال کیسے کریں گے؟ یہ ایک دلچسپ سوال ہے۔

۱۶۔ احسان-احمد ندیم قاسمی

احسان احمد ندیم قاسمی کا افسانہ ہے جو ان کے مجموعہ "نیلا پتھر" میں شامل ہوا۔ یہ مجموعہ ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں کل (۹) افسانے شامل ہیں۔

احسان، احمد ندیم قاسمی کا ایک معاشرتی افسانہ ہے۔ اس میں انھوں نے قریشی صاحب، ان کی بیٹی اور اویس صاحب جو ان کے پڑوسی ہیں، ان کے بارے میں ایک دلچسپ کہانی بیان کی ہے۔ یہ افسانہ ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ، نومبر ۲۰۱۷ء میں شائع ہوا ہے۔ قریشی صاحب ایک مریض آدمی ہیں جو اکثر و بیشتر بیمار رہتے ہیں۔ ان کی ایک جوان بیٹی ہے جو ان کی تیمار داری کرتی ہے۔ اس کے علاوہ قریشی صاحب کے دو بیٹے جو بیرون ملک رہتے ہیں۔ ان کی بیٹی اس لیے ان کی تیمار داری کرتی ہے کہ قریشی صاحب کی بیگم وفات پا چکی ہیں۔ گھر میں ان دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ اویس صاحب ان کے پڑوس میں نئے کرائے دار آتے ہیں تو ایک دن جب قریشی صاحب کی طبیعت زیادہ خراب ہوتی ہے۔ اویس صاحب اپنے مکان کی چھت پر آسمان کا نظارہ کر رہے

تھے۔ قریشی صاحب کی بیٹی اویس صاحب سے مخاطب ہوتی ہے کہ میرے والد صاحب بیمار ہیں ان کے لیے آپ میڈیکل اسٹور سے یہ دوائی لادیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔ اویس صاحب اس لڑکی کے کہنے پر میڈیکل سٹور سے دوائی لینے چلے جاتے ہیں۔ دوائی لے کر واپس آتے ہیں تو کچھ دن کے بعد وہ لڑکی اویس صاحب کو پھر بلاتی ہے کہ آج میرے والد کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔ ذرا ڈاکٹر کو بلوادیں گے تو آپ کی مہربانی ہوگی۔ اویس صاحب لڑکی سے استفسارات شروع کر دیتے ہیں اور اس لڑکی سے اپنے دل کی بات کرنا چاہتے ہیں مگر وہ ہر بار جب اس سے ملتے ہیں تو شرما جاتے ہیں، اپنے دل کی بات کیے بغیر واپس آجاتے ہیں اور پھر دل میں سوچتے ہیں کہ یہ لڑکی مجھ سے محبت کرتی ہے لیکن اس کا اظہار نہیں کرتی۔ وہ اپنے دل کی بات کرنا چاہتی ہے لیکن ہر بار محبت کا ذکر کرنے سے کتراتی ہے۔ اس لیے اویس صاحب سوچتے ہیں کہ اس بار جب اُس سے ملوں گا تو اپنی طرف سے اظہار محبت ضرور کروں گا۔ ایک دن جب لڑکی اویس صاحب کو اپنے گھر بلا کر چائے کی دعوت دیتی ہے تو اس طرح سے اظہار محبت کرتی ہے:

> ”اس نے چائے بنا کر پیالی میرے ہاتھ میں تھمائی اور بالکل میرے سامنے چارپائی پر بیٹھ گئی۔ ”اویس صاحب“ وہ بولی۔ اس کی آواز میں ایک ایسی کپکپی تھی جو چھپائی جا رہی تھی مگر چھپ نہیں رہی تھی۔ ”اویس صاحب“ میں نے آج ابھی ابھی اپنی زندگی کے بارے میں فیصلہ کیا ہے“۔ مگر فیصلہ تو میں نے بھی کر رکھا ہے، میں نے سوچا۔ ”اویس صاحب“ چارپائی کو ذرا سا گھسیٹ کر میرے اور قریب آگئی۔ ”میں دُنیا کی شاید وہ واحد لڑکی ہوں جس کی سہیلی ایک مرد ہے اور وہ آپ ہیں“۔ (۱۸)

اب وہ اپنی روداد اویس صاحب کو سناتے ہوئے اپنے دل کی بات کرتی ہے کہ میرے دو بھائی تھے جو بیرون ملک ہیں۔ وہ کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ وہاں انھوں نے مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی ہے۔ اس لیے آپ میرے لیے کوئی شریف لڑکا تلاش کریں تاکہ میں اُس سے شادی کر کے اپنی زندگی پر سکون طریقے سے بسر کر سکوں۔ میرے والد تو ہمیشہ میرے ساتھ نہیں رہیں گے۔ اس لیے میں سوچتی ہوں کہ اس دنیا میں میرا کوئی بھی نہیں ہے۔ میں آپ کو اپنا دوست سمجھتی ہوں اور اس لیے میں آپ سے یہ بات کر رہی ہوں۔ اس طرح اویس صاحب ہمیشہ سوچتے ہی رہ جاتے ہیں کہ انھوں نے اس سے پہلے اس سے اظہار محبت کیوں نہیں کیا۔ اویس صاحب افسانے کے آخر تک سوچتے ہی رہتے ہیں مگر وہ لڑکی اویس صاحب کے ساتھ اظہار محبت میں سبقت لے جاتے ہوئے ان کو اپنے دل کی بات اور مدعا کھل کر بیان کر دیتی ہے۔ اس طرح یہ افسانہ انسان

کی فکری سوچ کا آئینہ دار ہے اور خوبصورت طور پر عکاسی کرتا ہے۔ جب ہم کسی پر مکمل اعتماد اور بھروسہ کر لیتے ہیں تو پھر ہم یہ نہیں سوچتے کہ وہ مرد ہے یا عورت۔ اپنی شادی کی بات کرنا لڑکی کے لیے کوئی معیوب بات نہیں ہونی چاہیئے اس کا حق ہمارے اسلام نے بھی ہمیں دیا ہے۔

۱۷۔ نئی آنکھیں۔ کنول مشتاق

نئی آنکھیں، کنول مشتاق کا ایک کرشماتی افسانہ ہے جو ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ، مارچ ۲۰۱۸ء میں شائع ہوا ہے۔ اس میں ایک عورت کی زندگی کی کہانی بیان کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ وہ پُر مسرت ازدواجی زندگی بسر کرنا چاہتی ہے لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس کی زندگی کی ناقابل یقین کہانی پر لکھا گیا افسانہ ہے۔ یہ گلنار خان کی بیوی خانم کی کہانی ہے اور وہ اپنے میاں گلنار خان کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہی ہے۔ گلنار خان کا ایک دوست الیاس جو گلنار خان کو بہت عزیز ہے۔ وہ ایک غریب آدمی ہے جس کا کوئی روزگار نہیں۔ گلنار خان اسے ڈرائیونگ سکھا کر ایک کمپنی میں ڈرائیور بھرتی کروا دیتا ہے جہاں وہ اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا ہوتا ہے۔ اس کا گلنار خان کے گھر آزادانہ طور پر آنا جانا رہتا ہے۔ گلنار خان اس سے بہت محبت کرتا اور جواباً الیاس بھی وقتاً فوقتاً اس کے لیے تحفے تحائف لے کر آتا۔ ان کی محبت کی ایک جھلک ملاحظہ ہو :

> ”گلنار خان اس کے ساتھ نیکی کرتا ہے تو اس طرح سے خانم کو سمجھاتا ہے کہ بچہ ہے پیر کا بھوکا بیچارہ آوارہ پھرتا تھا۔ میں نے اسے دو ایک ماہ میں ڈرائیونگ سکھا کر اسی ماہ سے ایک ڈرائیور کی حیثیت سے ملازمت دلوائی ہے۔ میں چپ چاپ اس کے ساتھ چلتے ہوئے سب کچھ سنتی رہی میں اسے کیسے بتاتی کہ یہ تو گزشتہ کئی ہفتوں سے میرا تعاقب کر رہا ہے۔ مجھے تو یہ کوئی گہری سازش کا منصوبہ معلوم ہوتا ہے۔ ایک شام گلنار خان نے گھر آکر پوچھا الیاس تو نہیں آیا میں نے کہا وہ بھلا یہاں کیوں آئے گا۔ گلنار خان نے بتایا دوپہر کو اسے تنخواہ ملی تو اس وقت چھٹی لے کر شہر چلا گیا تھا کہتا تھا شام کو گھر آؤں گا“۔ (۱۹)

گلنار خان کی بیوی الیاس کو اتنا پسند نہیں کرتی اور اس سے نفرت کرتی ہے، آخر وقت گزرتا رہتا ہے اس طرح گلنار خان کے دوست الیاس کی شادی ہو جاتی ہے۔ اپنی بیوی کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ شومئی قسمت سے ایک ایسا واقعہ پیش آتا ہے کہ گلنار خان اچانک وفات پا جاتا ہے۔ الیاس بھی کسی

حادثے میں آنکھوں سے محروم ہو جاتا ہے اور اس کی بینائی چلی جاتی ہے۔ گلنار خاں مرتے وقت یہ وصیت کر دیتا ہے کہ مرنے کے بعد اس کی آنکھیں اس کے دوست الیاس کو عطیہ کر دی جائیں۔ جب گلنار خان کی آنکھیں الیاس کو لگا دی جاتی ہیں تو ان آنکھوں سے وہ ارد گرد کے ماحول کو دیکھنا شروع کرتا ہے تو گلنار خان کی بیوی خانم کو بھی اس کے نام سے پکارنا شروع کرتا ہے اور پوچھتا ہے کہ خانم کہاں ہے۔ اس طرح اس کی محبت گلنار خان کی بیوی سے بہت بڑھ جاتی ہے اور آخر کار گلنار خان کی بیوی خانم سے اس کی شادی ہو جاتی ہے اور وہ ہنسی خوشی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کے ہاں بچے بھی پیدا ہوتے ہیں۔ ایک ناقابل یقین اور کرشماتی کہانی ہے جو انسان کے اندر سوچ اور فکر پیدا کرتی ہے۔ مصنف نے اسے خوبصورت پیرائے میں بیان کرتے ہوئے انوکھا رنگ بھرا ہے اور ایک عام فہم زبان میں یہ ایک حقیقت کا روپ دھار گئی ہے۔ اور اس کی کہانی بھی ایسی جڑی گئی ہے جو کہ حقیقت کا رنگ اپنے اوپر اوڑھے ہوئے ہے۔

۱۸۔ مومل رانو-شریف آرپن

مومل رانو، شریف آرپن کی وادی سندھ میں ہونے والی محبت کی ایک تاریخی داستان ہے۔ یہ داستان ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ، جون ۲۰۱۸ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس کہانی میں ایک بادشاہ کی بیٹیوں کی محبت کا قصّہ بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ محبت کی یہ لازوال داستان جس میں ایک بادشاہ کی بیٹی مومل کی محبت اور اس کی زندگی کے نشیب و فراز کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ قصّہ یوں شروع ہوتا ہے کہ ایک بادشاہ وادی سندھ میں شکار کی غرض سے جاتا ہے تو وہ تلاش کے بعد خنزیر کو دیکھ کر اس کا تعاقب کرتا ہے۔ وہ خنزیر ایک جھیل میں کود جاتا ہے۔ بادشاہ جھیل کے پاس کھڑا ہو جاتا تو کیا دیکھتا ہے کہ جھیل اس کے گزرنے کے لیے راستہ بنا دیتی ہے اور وہ اس جھیل کو پار کر کے دوسرے کنارے پر پہنچ جاتا ہے۔ بادشاہ اس جانور کو ہلاک کر کے اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے پانی میں پھینکتا ہے۔ گوشت کا آخری حصّہ دانتوں پر مشتمل ہے جو بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ بادشاہ اسے کرشماتی نمونہ سمجھ کر اپنے ساتھ لے آتا۔ بادشاہ کے گھر میں ایک فقیر آتا ہے جو مومل کے ذریعے اس جبڑے کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ جب بادشاہ نے دیکھا کہ وہ جبڑا اپنی جگہ پر نہیں ہے تو وہ سب پر ناراض ہوتا ہے لیکن جب اسے پتہ چلتا ہے کہ مومل شہزادی کی غلطی کی وجہ سے بیکاری اس جبڑے کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہے تو وہ غصّے میں آکر شہزادی کو اپنے محل سے نکال دیتا ہے۔ شہزادی کی بہن کہتی ہے کہ اے بادشاہ تیرا جو بھی نقصان ہوا وہ ہم پورا کر دیں۔ لیکن بادشاہ اس کی بات

نہیں مانتا اور وہ مومل کو محل سے نکال کر ہی رہتا ہے۔ وہ کہیں دور جا کر ایک جنگل میں مکان تعمیر کرتی ہے اور وہاں پر مومل اور اس کی بہن تجارت شروع کر دیتی ہیں۔ ایک تاجر جس کا نام رانو ہے، وہ مومل کے ساتھ تجارت کرتا ہے اور ان دونوں میں تجارت کی وجہ سے کافی زیادہ ہم آہنگی اور دوستی ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ:

> "رانو چونکہ بادشاہ کا سب سے زیادہ وفادار وزیر تھا اور رشتے اس کا سالا بھی تھا لہٰذا اس کے ساتھ یہ نرمی برتی گئی کہ وہ آئندہ مومل سے کبھی نہیں ملے گا/ رانو کو اس کی طاقت کا اندازہ تھا لہٰذا اس کے لیے یہ شرط تسلیم کرنے کے سوا اور چارہ بھی کیا تھا۔ وہ چپ ہو گیا لیکن وہ خود کو مومل جیسی حسین دوشیزہ سے محبت کرنے سے کیسے روک سکتا تھا۔ لہٰذا وہ ہر وقت مومل کو یاد کر کے روتا رہتا۔ اپنے جذبات پر قابو نہ پاتے ہوئے اس نے مومل کے ایک محافظ کو اعتماد میں لیا اور یوں وہ ہر اندھیری رات میں اپنے اونٹ پر سوار ہو کر مومل کے کاک محل پہنچ جاتا اور علی الصبح واپس آ پہنچتا اور یوں وصل کا یہ سلسلہ چل نکلا"۔ (۲۰)

رانو، مومل کے عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے اور دن رات جان و مال اس پر لٹا دیتا ہے۔ دونوں کے عشق کے چرچے عام ہو جاتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کا انتظار کرتے ہیں۔ ایک دفعہ رانو کسی بات پر ناراض ہو کر کافی عرصہ مومل سے ملنے نہیں آیا۔ تو مومل اس کی تلاش میں نکلتی ہے۔ جب مومل کو رانو نہیں ملتا تو دونوں محل میں وقت گزاری کے لیے شطرنج کھیلنے لگتے ہیں۔ مومل جوگی بھیس بدل کر اس کے ساتھ شطرنج کھیل رہی تھی۔ مومل رانو کو کسی طرح سے پہچان لیتی ہے۔ رانو اس سے سخت ناراض ہوتا ہے کہ اس نے اس کو پہلے کیوں نہیں بتایا کہ وہ مومل ہے۔ افسانے کی کہانی انسان کے اندر گہری سوچ اور فکر پیدا کر کے انسانی یقین کو مستحکم کرتی ہے۔ کہانی پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو کچھ قسمت میں لکھا وہ ضرور مل کر ہی رہے گا بس اس میں کسی وقت ذرا حالات غیر یقینی سے ہو جاتے ہیں۔ کوشش کرنی چاہیے کہ انسان کا ایمان متزلزل نہ ہو۔

۱۹۔ میرے گناہ کم نہیں۔ محمد سلیم اختر

میرے گناہ کم نہیں، محمد سلیم اختر کا افسانہ ہے جس میں جرائم پیشہ لوگوں کے انجام کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ یہ افسانہ ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ، جون ۲۰۱۹ء میں شائع ہوا ہے۔ افسانے کی کہانی میں یہ سبق دیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص چھوٹا جرم کرنے سے پہلے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش نہیں کرتا تو اس کے بعد وہ بڑا

جرم کرتا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ جرائم کی دلدل میں پھنستا چلا جاتا ہے مگر جب اسے ہوش آتا ہے تو وقت گزر چکا ہوتا ہے۔ پھر پچھتاوے کے سوا اس کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آتا۔ اس افسانے میں بھی ملزم بنارس عرف چھوٹے سردار کی کہانی بڑی خوبصورتی سے بیان کی گئی ہے۔ چھوٹے سردار اپنی ابتدائی زندگی سے لے کر بڑے ہونے تک ہر قسم کی برائی میں مبتلا ہیں۔ کہانی کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ بنارس عرف چھوٹے سردار بہت چھوٹی عمر سے اسکول کے زمانے میں ہی پشہ ور لوگوں اور رسہ گیروں کے گروہ میں شامل ہو گیا اور طرح طرح کی برائیاں اس کے اندر جمع ہونا شروع ہو گئیں۔ دن بدن اس کے جرائم کی عادت ایسی پکی ہو گئی وہ پوری طرح جرائم میں ملوث ہو گیا۔ جرائم کی دنیا میں اس کے حوصلے اور ہمت کو دیکھتے ہوئے علاقے کے ایم پی اے نے اِسے اپنے گروہ میں شامل کر لیا تھا کہ وہ مخالف پارٹی کو ڈرا دھمکا کر لوگوں سے ووٹ حاصل کرے گا۔ اس کی شہرت اس وقت دوگنا ہو جاتی ہے جب وہ مخالفین کے ایک جلسے میں دستی بم سے حملہ کرتا ہے اور بہت سے لوگوں کو زخمی کر دیتا ہے۔ جلسے میں بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ اس طرح ایم پی اے صاحب اس کی کارکردگی سے مطمئن ہو جاتے ہیں اور اس کی بہادری پر اس کو انعام بھی دیا جاتا ہے۔ وہ بازار جاتا ہے تو جو بھی سودا سلف خریدتا ہے کسی کو پیسے نہیں دیتا بلکہ اپنی دھونس کے بل بوتے پر ہر ایک سے جو چاہے منوا لیتا ہے۔ وہ ایک بیوہ بڑھیا کی غیر قانونی طریقے سے زمین حاصل کرتا ہے اور وہاں پلازہ تعمیر کرواتا ہے۔ غریب بڑھیا اس کو زمین دینے پر رضامند نہیں ہوتی لیکن یہ افسروں کی ملی بھگت سے یہ زمین حاصل کر کے اس پر قبضہ کر لیتا ہے۔ اس کے جرم کی داستان مصنف نے یوں بیان کی ہے:

> ”جوں جوں وقت گزرتا رہا میں ناجائز طریقے اختیار کر کے اپنی دولت اور جائیداد میں اضافہ ہی کر رہا تھا۔ میں لاکھوں نہیں کروڑوں میں کھیلنے لگا میرے لیے ہر دن عید اور ہر رات شب برات بن گئی۔ شراب، کباب اور شباب میری زندگی کا لازمی جزو بن گیا۔ ہر طرف میری واہ واہ ہونے لگی۔ حکومتی حلقوں میں میری ایک پہچان بن گئی۔ میں نے اپنے ضلع میں پارٹی کو اتنے بہترین طریقے سے منظم کیا کہ دوسری جگہ میری مثال دی جانے لگی۔ بہت سی دوسری پارٹیوں کے لوگ ہماری پارٹی میں شامل ہو گئے“۔ (۲۱)

یہی تھوڑی سی زمین اس بیوہ بڑھیا کی آمدن کا واحد ذریعہ اور سہارا تھا۔ سردار بنارس نمبردار کی بیٹی پر عاشق ہو جاتا ہے اور اسے شادی کا پیغام بھجواتا ہے لیکن جب نمبردار اور اس کے بیٹے سخت الفاظ میں اس کی

مذمت کرتے ہیں تو اس کی حویلی کو آگ لگا کر اس کے پورے خاندان کو زندہ جلا کر تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ اسی طرح وہ ایک کالج کی لڑکی فری پر عاشق ہو جاتا ہے اور اس کو شادی کا پیغام دیتا ہے۔ جب وہ شادی کے لیے رضا مند نہیں ہوتی تو وہ اس کے باپ کو اغواء کر لیتا ہے۔ غریب لڑکی اسی صدمے میں اپنے باپ کی جدائی میں اپنی جان دے دیتی ہے۔ بنارس خان اس کے گھر والوں سے اُلٹا لڑائی کرتا ہے کہ انھوں نے بلاوجہ فری کو مارا ہے۔ چنانچہ وہ اس کی چھوٹی بہن راحیلہ سے شادی کرنے کے لیے اس کے گھر والوں کو پیغام دیتا ہے۔ جب وہ راحیلہ سے شادی کرنے لگتا ہے تو اس وقت تک اس کی پارٹی کی حکومت ختم ہو جاتی ہے اور اس طرح بے چاری راحیلہ کی جان بچ جاتی ہے۔ جب اگلی حکومت آتی ہے تو وہ سردار بنارس کو ٹھیکیدار سے رشوت لینے کے جرم میں جیل میں ڈال دیتے ہیں۔ جب وہاں سے رہا ہوتا تو پھر نمبردار کے پورے خاندان، اس کے بعد فری اور اس کے باپ سے معافی مانگنے کے لیے قبرستانوں کے چکر لگاتا ہے۔ اس میں ظلم و بربریت کی ایک پوری داستان سمیٹ دی گئی ہے۔ افسانے میں اس فکر کو دعوت دی گئی ہے کہ انسان اپنی طاقت کے بل بوتے پر جہاں مرضی پہنچ جائے لیکن اسے بہر حال واپس آنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد اسے اپنے گناہوں کی تلافی کرنا پڑتی ہے۔

۲۰۔ آٹھ سو نوے۔ عذرا اصغر

عذرا اصغر ۱۹۴۰ء میں پیدا ہوئیں۔ ۱۹۶۲ء میں ان کا پہلا افسانہ اُردو ڈائجسٹ میں شائع ہوا۔ ۷۰ء کی دہائی تک ادبی حلقوں سے دور رہیں۔ عذرا اصغر مختلف ادبی رسائل کے ساتھ منسلک رہیں جن میں تخلیق، تجریدِ نو ادب، ادب لطیف شامل ہیں۔ یہ با مقصد ادب کی قائل بھی رہیں جو بھی دل میں اُتر جائے۔ اسی حوالے سے اپنی کہانیاں لکھتی رہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ۸۰ء کی دہائی میں "پت جھڑ کا آخری پتہ" کے نام سے سامنے آیا۔ اس کے علاوہ کئی اور افسانوی مجموعوں اور ناولوں کی مصنفہ ہیں۔

آٹھ سو نوے، عذرا اصغر کا تنخواہ دار طبقہ کے مسائل اور مشکلات کو اُجاگر کرتا ہوا ایک افسانہ ہے جو ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ، جولائی ۲۰۱۹ء میں شائع ہوا ہے۔ اس افسانے میں یہ بتایا گیا ہے کہ تنخواہ دار طبقہ اپنی محدود آمدنی کے سبب ہمیشہ اسی پریشانی میں مبتلا رہتا ہے کہ اگلے مہینے کی تنخواہ ملنے تک اس پورے مہینے میں اخراجات کو کیسے منضبط کیا جائے گا۔ لیکن اس کے مقابلے میں کاروباری طبقے کو ایسی پریشانیاں لاحق نہیں ہوتیں۔ اگر دوسری جانب دیکھا جائے تو جس کے پاس زیادہ دولت ہوتی ہے وہ اتنا ہی کنجوس ہوتا ہے مگر جس کے پاس پیسے کم ہوتے ہیں، جیسا کہ خاص طور پر تنخواہ دار طبقے میں ہوتا ہے ان کا دل اتنا ہی بادشاہ ہوتا ہے۔

افسانے میں ایک نوکرانی ریشم کی کہانی بتائی گئی ہے۔ ریشم مختلف گھروں میں چھوٹے موٹے کام کاج کر کے اپنی زندگی کی گزر بسر کرتی ہے اور اس کا میاں شوروم پر گاڑیوں کی خرید و فروخت کا دھندا کرتا ہے اس کا کام اکثر و بیشتر مندے کا شکار رہتا ہے۔ اس طرح ریشم گھروں میں مزدوری کر کے اپنے بچوں کا پیٹ پالتی ہے۔ اس کو اپنا گھر چلانے کے لیے بہت سے گھروں میں کام کرنا پڑتا ہے اور ہر گھر کے ماحول کو دیکھتی ہے تو اسے اندازہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے پاس بہت زیادہ دولت ہوتی ہے وہ اتنا ہی اس کو سنبھال کر رکھتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں عام طور پر سرکاری افسران جن کی لگی بندھی تنخواہ ہوتی ہے جن کے اکاؤنٹ میں مہینے کے آخر تک ۸۹۰ روپے سے زیادہ کا بیلنس نہیں ہوتا، وہ مہمانوں کے ساتھ بھی اچھا برتاؤ کرتے ہیں، اپنے نوکروں کے ساتھ بھی حسن سلوک سے پیش آتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر ان کی مالی مدد بھی کر دیتے ہیں۔ ریشم اپنی مالکن کو ایسے لوگوں کے حالات سے آگاہ کرتے ہوئے بتاتی ہے:

> ”باجی نوکروں کو بھی آپ اپنے جیسا کھانا دیتی ہیں تو اس پر آخر کچھ خرچ ہی ہوتا ہے۔ پھر ہر آنے والے کی خاطر داری پر بھی آپ کے ہاں بہت اہتمام ہوتا ہے۔ وہ بٹ صاحب کی بیگم تو بس چائے کی ایک پیالی ہاتھ میں پکڑا دیتی ہیں اور وہ ہر آنے والے کو نہیں بس کسی کسی کو۔ جو بہت ہی خاص ہوتے ہیں صرف انہی کے سامنے ٹرالی سج کر جاتی ہے اور آپ کی ٹرالی تو ہر آئے گئے کے آگے دوڑتی پھرتی ہے۔ اس نے ناگواری سے کہا“۔ (۲۲)

ریشم پوری تندہی سے مزدوری کر کے اپنے بچوں کی اس حد تک مدد کرتی ہے کہ وہ جن کے گھروں میں کام کرتی تھی ان سے بھی زیادہ دولت اس کے گھر آجاتی ہے۔ جب وہ اپنی بیٹی کی شادی کرنے لگتی ہے تو اُس افسر کی بیگم کو جس کے گھر وہ کام کرتی تھی، شادی کا پیغام دینے آتی ہے اور تاکید کرتی ہے کہ اس کی بیٹی کی شادی میں ضرور شرکت کریں۔ ریشم اتنی دولت مند ہو جانے کے باوجود بھی اپنے آپ کو عاجزی اور کسمپرسی کی حالت میں ظاہر کرتی ہے۔ اس افسانے میں فکری سوچ کے ساتھ ساتھ دوسرے اظہار تشکر کے منفرد انداز کو خوبصورتی سے اُجاگر کیا گیا ہے کہ جو اللہ پر توکل کرتے ہیں، انھیں کبھی کسی کا محتاج نہیں ہونا پڑتا۔ اللہ تعالیٰ خود ان کی مدد فرماتے ہیں۔

ناول

ناول اردو زبان و ادب کی ایک اہم اور بہت خوبصورت صنف ہے جو اردو کی دیگر اصناف سے تھوڑی مختلف ہے۔ ناول میں ایک فرضی قصّہ یا کہانی نثر کی صورت میں بیان کیا جاتا ہے۔ اس کہانی میں حقیقی زندگی سے متعلق کرداروں کا عکس دکھایا جاتا ہے۔ ناول میں معاشرے اور افراد کے جذبات خوبصورتی اور ترتیب کے ساتھ اس مہارت سے پیش کیے جاتے ہیں کہ جن پر بالکل حقیقی زندگی کا گمان ہوتا ہے۔ گویا تمام تر واقعات زندگی کے حقائق سے متعلق معلوم ہوتے ہیں۔ اگر ناول کی تفصیلی تعریف کی جائے تو معلوم ہو گا کہ اس صنف میں کسی انسان کی پوری زندگی بیان کر دی گئی ہے۔ ناول میں باقاعدہ طور پر ایک ترتیب ہوتی ہے، پلاٹ، کردار، مکالمے ہوتے ہیں اور اس کی کہانی کا باقاعدہ ایک اسلوب ہوتا ہے۔ یہ سب عناصر ترکیبی ایک موضوع کی عمارت پر کھڑے ہوتے ہیں۔ مقالے میں شامل ناولوں کا فکری تجزیہ پیش کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ اس میں صرف ایسے ناول شامل کیے گئے ہیں جن کا تعلق (۲۰۱۷ء تا ۲۰۱۹ء) تک کے شماروں سے ہے۔ ان میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ بہت سے ناول قسط وار شائع ہونے کی وجہ سے ان کے تسلسل کو سمجھنے میں دقت پیش آسکتی ہے لیکن کوشش کی گئی ہے کہ کہانی کو سیاق و سباق کے ساتھ جوڑ کر اس طرح سے وضاحت کر دی جائے کہ قارئین اسے آسانی سے سمجھ سکیں۔ لہٰذا مذکورہ ناولوں کا فکری تجزیہ پیش ہے:

ا۔ لاش کا فرار۔ ریکس سٹاؤٹ

سلسلہ وار ناول "لاش کا فرار" ریکس سٹاؤٹ ایک ایسے وہمی شخص جین ڈومیری کی داستان ہے۔ یہ ناول ماہنامہ اردو ڈائجسٹ، فروری ۲۰۱۷ء کے شمارے میں قسط وار شائع ہوا ہے۔ جین ڈومیری کو شک ہوتا ہے کہ کوئی شخص اسے قتل کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے قتل کے خوف سے ایک ایسا ڈرامہ کرتا ہے جس سے وہ دشمن کے وار سے زندہ بچ کر اپنی زندگی بسر کر سکے۔ وہ کچھ اس طرح سے روپوش ہوتا ہے کہ لوگ اسے تلاش کرتے رہتے ہیں لیکن وہ لوگوں کے درمیان نہیں آتا۔ جب وہ غائب ہو جاتا ہے تو پولیس اس بات کی تحقیق شروع کر دیتی ہے کہ کہیں اسے کسی نے قتل تو نہیں کر دیا ہے، پھر قیاس آرائیاں ہوتی ہیں اور تفتیش شروع ہو جاتی ہے۔ پولیس تفتیش کا دائرہ وسیع کرتی اور اس بات کا سراغ لگاتی ہے کہ اس سے ملنے کون لوگ کس وقت اس کے دفتر میں آئے، جس وقت اسے قتل کیا گیا تھا۔ مختلف حیلوں بہانوں سے ہر وقت اس کے دفتر کی نگرانی کی جاتی ہے۔ دفتر کا ہر ملازم اپنے آپ کو مشکوک سمجھنے لگتا ہے۔ ہر کوئی اپنی اپنی جگہ صفائی بیان کرتا ہے۔ اس

کی تلاش کے سلسلے میں اس کے دفتری ساتھی آپس میں چہ مگویاں کرتے ہیں۔ ناول نگار ان کی گفتگو کا کچھ اس طرح سے نقشہ کھینچا ہے:

> " برنارڈ اس سے کہہ رہا تھا سنتھیا تم یقین کرو میں جو بھی کہوں گا وہ سچ ہے۔ جین ڈومیری نے مجھے بتایا کہ کوئی اس کی جان لینا چاہتا ہے۔ لہذا وہ اپنی موت کا ڈراما رچائے گا تاکہ دشمن کے وار سے بچ سکے۔ چونکہ انکل کی زندگی خطرے میں تھی لہذا میں ان کی مدد کرنے کو تیار ہو گیا۔ انہوں نے انکل پال کے متعلق کچھ نہیں کہا اور نہ ہی میرے دماغ میں ان کا خیال آیا، وہ تو مر چکے تھے۔ سنتھیا یقین جانو یہی سچ ہے۔ میرے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ انکل جین جھوٹ بول رہے ہیں"۔ (۲۳)

کبھی اس کے بھتیجے کی سنگت پر شک کیا جاتا ہے کہ کہیں اس نے دولت حاصل کرنے کے لیے تو اپنے چچا کو قتل نہیں کیا اور کبھی کسی ایسے شخص کے بارے میں کہا جاتا ہے جسے دفتر میں آخری بار اس کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ اس طرح کسی نتیجے پر بھی نہیں پہنچا جا سکا۔ یہ ناول ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے کہ جب کوئی شخص کسی بات کا شبہ اپنے دل و دماغ میں بیٹھا لیتا ہے تو لاکھ کوشش کے باوجود اُس کے دل سے وہ بات نکالی نہیں جا سکتی چاہے کتنے ہی لوگ مل کر اس کا دل صاف کرنے کی کوششیں کریں۔

۲۔ اصلی چہرہ- انجم فاروق ساحلی

اصلی چہرہ، انجم فاروق ساحلی کا لکھا ہوا ناول ہے جس میں دو دوستوں رابرٹ اور گاروک کی کہانی بیان کی گئی ہے جو حسد کی وجہ سے ایک دوسرے سے جلتے ہیں۔ یہ ناول ماہنامہ اردو ڈائجسٹ، اپریل ۲۰۱۹ء کے شمارہ میں قسط وار شائع ہوا ہے۔ رابرٹ مینڈلین کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے تو ایک دن اچانک مینڈلین لاپتہ ہو جاتی ہے، جس کی اطلاع پولیس کو دی جاتی ہے۔ رابرٹ اور گاروک دونوں اسے اپنے طور پر خود بھی ادھر ادھر تلاش کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں، لیکن انہیں ہر جگہ سے ناکامی ہوتی ہے۔ وہ کبھی ہوٹلوں کے ویٹروں سے پوچھتے ہیں تو کبھی دکانداروں سے اس کا پتہ دریافت کرتے ہیں، کبھی مختلف لوگوں کو اس کی تصویر دکھاتے ہیں تاکہ اس کے بارے میں کوئی آتا پتا لگایا جا سکے۔ پھر گاروک کے گھر سے مینڈلین کو تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دونوں طرح طرح کے وسوسوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ کسی نے میڈلین کو مار کر کہیں چھپا دیا ہو۔ اس لیے وہ سراغ رساں کتوں کی مدد لینے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ رابرٹ اپنے

فوجی دوست میجر آرتھر کو بھی اس صورتحال حال سے آگاہ کرتا ہے۔ پھر وہ مینڈلین کی تلاش میں ووٹنگ روانہ ہوتے ہیں۔ وہاں پر ایک قصاب کی دکان پر بھی شبہ ہوتا ہے کہ شاید اس نے میڈلین کو اغوا کیا ہے اور اس کے بعد اسے مار دیا ہو۔ وہ مینڈلین کی تلاش میں گلِ نرگس میں بھی جاتے ہیں جو ایک قدیم غار تھی جس کے اندر قدیم زمانے کے آثار ملتے ہیں۔ رابرٹ بھی اس بات سے واقف تھا کہ اس غار تک پہنچنے کے لیے انہیں بہت سی مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے کیونکہ غار کے آخری حصّے میں ایک ندی بہتی ہے یہاں بہت اندھیرا ہوتا ہے۔ وہاں ایک کتارابرٹ کی مدد کرتا ہے۔ رابرٹ سرنگ سے گزرتا ہوا غار کے مزید تنگ حصّے میں داخل ہو جاتا ہے اور اس جگہ پہنچنے کے بعد وہ دیکھتا ہے کہ غار کے پتھروں پر کچھ لکیریں لگی ہوئی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ غار بہت قدیم ہے۔ وہاں پر نوکیلے پتھروں کی وجہ سے ان کے پاؤں بھی زخمی ہو جاتے ہیں۔ سڑک سے گزر کر وہ ایک جھیل میں گر جاتا ہے۔ اسے سخت بھوک لگی ہوتی ہے۔ اس کے پاس صرف ایک سگریٹ تھا جو اس نے پینا چاہا مگر پھر اس نے یہ سوچ کر دوبارہ اپنے پاس رکھ لیا کہ بعد میں جب اسے تیز بھوک لگے گی تو وہ اسے پی لے گا۔ رابرٹ نے ایک پودے کی جڑ نکالی اور اس میں اپنے دانت پیوست کر دیے اور اس سے نکلنے والے رس کو پینے لگا۔ اتنی مشکلات کے باوجود کسی نے پولیس کو اطلاع دے دی تو وہ اس کی لاش کو لینے کے لیے آجاتے ہیں جس پر برہم ہو جاتا ہے۔ اس کی لاش کے بارے میں پولیس والوں کو کس نے بتایا۔ ایک لاش لے کر پولیس والے کاروک کی رہائش گاہ پر آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ لاش کا معائنہ کر لیا جائے۔ لاش کا معائنہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لاش کی کھوپڑی جگہ جگہ سے زخمی ہو چکی تھیں۔ پولیس آفیسر نے آگے بڑھ کر لاش کے چہرے سے پردہ اٹھایا تو رابرٹ کا سر چکرا گیا۔ رابرٹ کے تاثرات کچھ یوں بتائے گئے ہیں:

> رابرٹ دھاڑا ڈاکٹر میری طرف دیکھو میں وہ شخص ہوں جس کی موت کا سرٹیفکیٹ جاری کرنے کے لیے تم لاش کا معائنہ بھی نہیں کرنا چاہتے۔ اب ذرا میری لاش کا معائنہ تو کر کے دیکھو۔ یہ کہتے ہوئے رابرٹ نے لاش کے چہرے پر ریوالور کا دستہ دے مارا۔ چہرے سے مٹی اڑی اور چہرے کی سطح جگہ جگہ سے تڑخ گئی اور پھر فوراہی رابرٹ نے گاروگ کے ہاتھ پر زوردار ہاتھ مارا۔ گاروک کی انگلیوں میں دبا ہوا کیپسول دور جا گرا۔ کیپسول محفوظ کر لو ڈاکٹر اس میں انتہائی سریع الاثر زہر ہے اور

ساتھ ہی میری لاش کے تڑخے ہوئے حصے کو الگ کر لو۔ تمہیں علم ہو جائے گا کہ لاش کس کی ہے"۔(۲۴)

اس نے دیکھا کہ واقعی اس کی لاش اسٹریچر پر پڑی ہے۔ رابرٹ چلا رہا تھا کہ میری طرف دیکھو۔ میں وہ شخص ہوں جس کی موت کا سرٹیفکیٹ جاری کرنے کے لیے تم لاش کا معائنہ بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یہ کہتے ہوئے رابرٹ نے لاش کے چہرے پر زور سے پستول کا دستہ دے مارا تو لاش کے چہرے پر پڑتی ہوئی مٹی جگہ جگہ سے ٹوٹ گئی۔ رابرٹ کو یقین تھا کہ یہ لاش مینڈلین کی ہے جسے پرانی چیزوں کا لالچ دے کر غارِ نرگس میں لے جایا گیا تھا تاکہ وہاں سے چند انتہائی قدیم پینٹنگ ملیں گی اور رابرٹ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کے دوست نے اس کی محبوبہ کو محض اس لیے قتل کر دیا کہ وہ اس سے محبت کرتی تھی۔

ناول کی اس کہانی میں جو دعوت فکر دی گئی ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ انسان جس کی محبت میں گرفتار ہوتا ہے اس کے لیے اپنی جان تک قربان کرنے کو تیار ہوتا ہے۔ رابرٹ جب اپنی محبوبہ مینڈلین کو ڈھونڈنے کے لیے نکلتا ہے تو بہت سی مشکلات کے اُسے بعد ایک ایسی لاش ملتی ہے جو مینڈلین سے مشابہت رکھتی ہے لیکن حقیقت میں وہ اس کی محبوبہ کی لاش نہیں تھی۔ اس کا صرف چہرہ بدلا گیا تھا۔ اب کہانی میں آخری فکر یہ پیدا ہوتی ہے کہ اس کی محبوبہ مینڈلین کہاں ہے؟

۳۔ پشیمان۔ ریاض عاقب کوہلر

ریاض عاقب کوہلر کا ناول بہترین کہانی پر مبنی ہے۔ اس ناول کی کہانی سماجی اور رومانوی طرز پر محیط ہے جو ایک جوڑے کی محبت کو بیان کرتی ہے۔ لڑکے کا تعلق ایک متوسط طبقے سے تھا اور اس نے امیر لڑکی کو پروپوز کیا اور اُس نے اُسے خاندانی پس منظر کی وجہ سے مسترد کر دیا۔

اس ناول کی کہانی میں ایک غریب لڑکے عمار اور ایک امیر لڑکی اُسوہ کی محبت کے بارے میں بڑی خوبصورتی سے بتایا گیا ہے۔ یہ ناول ماہنامہ حکایت، دسمبر ۲۰۱۷ء، فروری، مارچ، مئی اور جون ۲۰۱۸ء کے شماروں میں قسط وار شائع ہوا ہے۔ عمار دولت کی تفاوت کے باعث اُسوہ کو حاصل کرنے میں نہ صرف ناکام رہتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اسے بہت سی دشواریوں کا بھی سامنا کرتا پڑتا ہے۔ دونوں کی محبت کے تمام حالات و واقعات کی تصویر کشی اس ناول میں بھرپور انداز میں کی گئی ہے۔ ناول کی کہانی کا مرکزی خیال یہ ہے کہ جب انسان خلوص دل سے کسی چیز کو حاصل کرنے کا مصمّم ارادہ کر لیتا ہے تو پھر وہ اس کی راہ میں آنے والی

ہر رکاوٹ اور مشکل کو نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہے اور مشکلات کو دور کرنے کی بھی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ عمار بھی اپنے آپ کو مالی طور پر مستحکم کرنے اور اُسوہ کی دولت میں برابری کرنے کے لیے اپنی جان جوکھوں میں ڈالتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اُسوہ کے معیار پر پورا اترے اور اپنے آپ کو اس قابل بنائے کہ اُسوہ اُسے اپنانے کے لیے رضامند ہو جائے۔ ایسے ہی حالات کی آپ بیتی ناول میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

> " عمار پچھلے ایک سال سے کراچی سے زنانہ و مردانہ کپڑے کے سوٹ چھوٹے شہروں کے دکانداروں تک پہنچا رہا تھا اس مقصد کے لئے وہ پہلے مختلف شہروں میں جاکر وہاں کپڑے کی مارکیٹ میں خوار ہوتا رہا تھا یہاں تک کہ اسے چھوٹے موٹے دکانداروں کی طرف سے آرڈر ملنے شروع ہو گئے تھے۔ کپڑے کی ترسیل کے لیے اس نے ایک سیکنڈ ہینڈ ڈانسن بھی خرید لی تھی بہت زیادہ محنت اور کوشش کے بعد وہ ماہانہ ساٹھ ستر ہزار سے زیادہ منافع نہیں کما سکا تھا۔ شروع شروع میں دس پندرہ ہزار سے شروع ہونے والا منافع ساٹھ ستر ہزار کی بلندی کو چھو کر جامد ہو گیا تھا"۔ (۲۵)

انسان کے ہاتھ میں جب دولت آجاتی ہے تو وہ غریب کو خاطر میں نہیں لاتا۔ دولت اس میں غرور، تکبر اور گمنڈ پیدا کر دیتی ہے۔ دولت کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو ایک اعلیٰ مخلوق تصور کرنے لگتا ہے جبکہ غریبوں کو ادنیٰ مخلوق تصور کرتا ہے۔ عمار اس بات کا گمان کرتا ہے کہ اگر اُسوہ اس کو ناپسند کرتی ہے تو اس کی وجہ صرف اور صرف یہی ہے کہ وہ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر اُسوہ اس سے شادی کرنے کے لیے رضامند ہو جاتی ہے تو معاشرے میں اس کا رُتبہ کم ہو جائے گا۔ اس لیے عمار دن رات محنت کر کے دولت اکٹھی کرنے کے چکر میں رہتا ہے۔ عمار کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ جب اس کے پاس دولت کی فراوانی ہو گی تو اُسوہ خود بخود اس کے آگے جھک جائے گی اور شادی کے لیے رضامند جائے گی۔ عمار اُسوہ سے شادی پر راضی نہ ہونے کی وجہ سے بہت غصّے میں رہتا ہے اور وہ اپنے گھر والوں سے اس انداز میں گفتگو کرتا ہے :

> "عمار زہریلے لہجے میں بولا ڈیڈی میں بے چینی سے اس دن کا انتظار کر رہا ہوں جب اس کی اکڑی ہوئی گردن میرے سامنے جھکے گی اور وہ گڑگڑا کر رحم کی بھیک مانگے

گی۔ کل یا زیادہ سے زیادہ پرسوں تک تیار رہنا۔ آج اس کا وکیل منظر عام سے غائب ہو رہا ہے میں بھی اپنے پارٹنر سے مشورہ کر کے اسلم کو اصلیت بتانے والا ہوں۔ اسے بھی پتہ چل جائے گا کہ اس نے کس سے پنگا لیا تھا"۔ (۲۶)

عمار اُسوہ کا غرور توڑنے کی کوشش کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ اُسوہ سے اُس وقت تک نہیں ملے گا جب تک کہ وہ اس قدر دولت اکٹھی نہ کر لے جتنی اُسے اُسوہ کو اپنے سامنے زیر کرنے کے لیے کافی ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور بھی ہے۔ کیونکہ جب کسی کے دل میں کسی کی محبت راسخ ہو جائے تو وہ ہر وقت اُس سے ملاقات کے بہانے تلاش کرتا رہتا ہے۔ یہی حال عمار کا بھی ہے۔ اُس کا دل اُسوہ سے ملنے کو نہیں چاہتا لیکن نہ چاہنے کے باوجود اس کی محبت کی کشش اتنی ہے کہ وہ اُسوہ کی جانب کھینچا چلا جاتا ہے۔ ناول نگار نے اس کی منظر کشی اس طرح سے کی ہے :

"تھوڑا سا آگے جاتے ہی نہ جانے کیوں اس کے دل میں اُسوہ کی یاد ہلکورے لے کر بیدار ہوئی اور اس نے اپنی کار کا رخ اس کے گھر کی طرف کر دیا۔ یہ مشکل تھا کہ رات کی اس وقت وہ گھر سے باہر نکلتی یا گیٹ پر کھڑی ہوتی کہ عمار صاحب آ کر اس کا دیدار کر لے مگر وہ خود کو روک نہ پایا۔ محبوب نہ سہی اس کے گھر کا دیدار بھی ایک سعادت ہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اُسوہ کے دل میں اس کے لیے محبت نہیں ہے مگر یہ بات اسے اسوہ کی محبت سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ گزرے سالوں نے اسوہ کی محبت میں ذرا سی بھی کمی نہیں آنے دی تھی۔ وہ آج بھی شروع دن کی طرح اس کے دل پر قابض تھی۔ آج بھی وہ اسے اتنی ہی پیاری تھی جتنی پہلی نظر میں لگی تھی بلکہ اگر وہ اپنی محبت کا موازنہ گزشتہ دنوں سے کرتا تو آج اسوہ کی محبت کا پلڑا پہلے سے بھی زیادہ وزنی دکھائی دیتا تھا"۔ (۲۷)

انسان کسی کی محبت میں دنیا کی پریشانیاں اور ستم اُٹھاتے اُٹھاتے محبت میں ایک مقام ایسا بھی آتا ہے کہ جب محبوب کو احساس ہوتا ہے کہ عاشق نے میرے لیے کتنے دکھ اُٹھائے ہیں تو اس کا دل پتھر سے موم ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اسے یہ احساس ہونا شروع ہو جاتا ہے اور اس کا ضمیر اس کو ملامت کرتا ہے کہ وہ اپنے چاہنے والے اور محبت کرنے والے کے ساتھ زیادتی کا مرتکب ہو رہا ہے۔ جب محبت اس منزل تک پہنچ جاتی

ہے تو عاشق کو بھی قدرے صبر آجاتا ہے اور شکوہ و شکایت کرنے کی بجائے صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتا ہے۔ عمار اور اُسوہ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ پیش آتا ہے۔ اب اُسوہ کی محبت پکار پکار کر عمار سے کہہ رہی ہے:

> ”میری وجہ سے بھی تو کوئی بے گناہ ایسی ہی اذیت سے گزرا تھا۔ اچانک اس کی آنکھوں میں عمار کا مغموم چہرہ لہرایا۔ دولت کے زعم، امارت کے گمنڈ، خوبصورتی کے غرور اور انوکھے پن کے خیال نے اس سے یہ احساس چھین لیا تھا کہ وہ کسی پر ظلم و زیادتی کی مرتکب ہو رہی تھی۔ آج اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی پر وہ چیخ اٹھی تھی۔ اس کا انگ انگ زخم بن گیا تھا لیکن وہ تو اس وقت خاموش رہا تھا۔ کچھ بھی تو نہیں کہا تھا اس نے۔ نہ اس وقت کوئی شکوہ کیا اور نہ بعد میں کوئی شکایت کی تھی“۔ (۲۸)

مذکورہ ناول کے تجزیے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انسان کو دنیا میں اپنے سے حقیر کسی کو نہیں سمجھنا چاہیے کیونکہ ہر ایک انسان کو اللہ تعالیٰ نے کوئی نہ کوئی خوبی دے کر اس دنیا میں بھیجا ہے۔ کسی کو دولت دی ہے تو کسی کو غربت، کسی کو عقل و شعور دیا ہے تو کسی کو اس کے بدلے میں کوئی اور نعمت عطا کی ہے۔ اس لیے ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے اس پر فخر اور تکبر ہر گز نہیں کرنا چاہیے بلکہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے ہمیں بہت سی نعمتوں سے نوازا ہے۔

ناول کی کہانی ہمیں یہ دعوتِ فکر دیتی ہے کہ دولت آنی جانی چیز ہے۔ اصل قیمت ہمارے رشتوں کی ہوتی ہے۔ دولت تو زندگی میں کسی وقت کم زیادہ ہو سکتی ہے۔

۴۔ مہاراجہ- سردار بہادر سر گورنام سنگھ پٹیالہ

محمد ابراہیم طاہر صحافی، کالم نگار اور ایڈیٹر ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا شمار ان شخصیات میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے اپنی یادداشتوں کا ورثہ نئی نسل کو منتقل کرنے کے لیے کتابیں لکھیں۔ اِن کی دس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

ناول مہاراجہ، سردار بہادر سر گورنام سنگھ پٹیالہ کا لکھا ہوا ناول ہے جسے ترمیم و اضافوں کے بعد میاں محمد ابراہیم طاہر نے تحریر کیا ہے۔ یہ ناول ماہنامہ حکایت فروری، مارچ، جولائی، اگست، ستمبر ۲۰۱۸ء اور فروری، مارچ اور جون ۲۰۱۹ء کے شماروں میں قسط وار شائع ہوا ہے۔ اس میں ناول میں تاریخی حوالوں کے ساتھ پرانے

بادشاہوں مہاراجہ کے رہن سہن، عادات و اطوارِ زندگی اور ان کی عیاشیوں کے بارے میں داستان سرائی انتہائی شفاف اور حقیقی انداز سے کی گئی ہے۔ یہ مہاراجے مختلف حیلے بہانوں کو جواز بنا کر طرح طرح کی برائیوں اور غلط کاریوں میں ملوث ہوتے اور اپنے غنڈوں کے ذریعے وہ کام کراتے ہیں جن کی ایک مہذب معاشرے میں توقع بھی نہیں کی جاسکتی۔ مذکورہ ناول میں ایسے ہی واقعات کی جھلکیاں ناول نگار نے پیش کی ہیں:

> "سال ۱۹۳۷ء میں جب نظام اپنی سلور جوبلی منا رہا تھا، انگریزوں نے خواہش ظاہر کی کہ وہ نظام کے اعزاز میں چوبیس ہزار فوجیوں کی سلامی پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ابھی نظام کے چبوترے کے سامنے سے ایک ہزار انگریز سپاہی سلامی دیتے ہوئے گزرے تھے کہ نظام نے انگریز کمانڈر کو بلا کر کہہ دیا کہ وہ مزید سپاہیوں کی سلامی کے لیے کھڑے نہیں رہ سکتے۔ لہٰذا یہ سلسلہ ختم کر دیا جائے۔ انگریزوں کے خلاف نظام کی طرف سے اظہار ناپسندیدگی اور نفرت تھا جس نے وائسرائے کی کالی کتاب میں نظام کے خلاف ایک اور جرم کا اضافہ کر دیا"۔ (۲۹)

مہاراجا کی شان و شوکت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب کسی تقریب یا تہوار کے موقع پر سلامی دینے یا اس کی پذیرائی کرنے کے لیے اسے دعوت دی جاتی تو اس کے ناز نخروں کو برداشت کرنا عام آدمی کے بس کی بات نہیں ہوتی تھی۔ مہاراجہ کو محض کھڑے ہو کر سلامی لینے یا کچھ دیر لوگوں کے سامنے آنے پر بھی بڑی کوفت ہوتی۔ اس سے مہاراجا کے ناز نخروں اور بدمزاجی کے بارے میں سوچا جاسکتا ہے۔ ایسے ہی ایک واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ناول نگار نے لکھا ہے کہ:

> "اس امر کا اظہار دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ دسہرے کے تہوار کے موقع پر ریاستی روایات اور رواج کے مطابق مہاراجا بذات خود اپنی آرمی کے جلو میں بڑی سج دھج اور شان و شوکت کے ساتھ شری رام چندر، ہند کے دیوتاؤں کے شہنشاہ کا روپ دھار کر میلے میں شامل ہوتا تھا اور سری لنکا کے شہنشاہ راون، جس کے ساتھ شری رام چندر کی چھ ہزار سال قبل گھمسان کی جنگ ہوئی تھی اور جیسے بالآخر شیری رام چندر نے قتل کر دیا تھا، کے بہت بڑے پتلے کو اپنے ہاتھ سے آگ لگا کر تہوار کا افتتاح کیا کرتا تھا"۔ (۳۰)

دوسرے ممالک کے شہزادے، شہزادیوں سے مہاراجہ بہت اچھے تعلقات رکھتا تھا اور اُنھیں اپنے ہاں سیر کرنے کے لیے بھی دعوت دیتا رہتا تھا۔ وہ خود دوسرے ملک کی پارٹیوں میں جا کر فخر محسوس کرتا تھا۔ ناول میں شہزادی جرمینے اور مہاراجا کی ملاقاتوں کا ذکر کیا گیا ہے، جیسے بہت سی ملاقاتوں کے بعد مہاراجا اور جرمینے گہرے دوست بن گئے اور ان کے درمیان گھنٹوں سیاسی، سماجی، معاشی، کلچر اور دیگر موضوعات پر بحث مباحثہ ہوتا رہتا اور مہاراجہ اس کے علم، بالغ نظری، وسعت مطالعہ، قابلیت، ہوشیاری، دانائی اور معاملہ فہمی سے بہت متاثر ہوتا۔ ان کی ملاقات کے حوالے سے ایک واقعہ میں بیان کیا گیا ہے :

> ”ایک روز ہوٹل کی بالکونی میں بیٹھ کر موسم اور اردگرد کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مہاراجا نے جرمینے سے پوچھا کہ وہ ہندوستان کی ریاست میں آنا پسند کرے گی؟ اسے ایک ایسے ملک کے بادشاہ کی طرف سے دعوت پا کر جو اس کے خوابوں کی سرزمین تھا، بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ اس نے فوراً کہا۔ عزت پناہ! میں آپ کی دعوت قبول کرتی ہوں۔ بشرطیکہ ریجنالڈ فورڈ کو کوئی اعتراض نہ ہو“۔ (۳۱)

بھیڑ اور بھیڑیا کا کھیل مہاراجا کا مرغوب مشغلہ تھا جس میں ایک مہاراجا کا قصّہ بڑی ہنرمندی سے بیان کیا گیا ہے۔ ریاست نابعہ کا مہاراجا ریپودامن سنگھ ”جنگ اور محبت میں سب جائز ہے“ کا صحیح عکاس تھا۔ وہ عورتوں کو اپنے فریب محبت میں پھانسنے کے لیے عجیب و غریب طریقے اختیار کرتا تھا۔ وہ بیک وقت انتہائی نرم اور انتہائی غیر مہذب اور دریدہ ذہن تھا۔ جب کبھی کوئی عورت اس کی نفسیاتی خواہش کے سامنے سپر انداز نہیں ہوتی تھی تو وہ جنگل میں کسی مذہبی تقریب کا ڈھونگ رچایا کرتا تھا جس میں ریاست کے مرد و خواتین پر ارتھنا اور دعا کے لیے جمع ہوتے تھے۔ ایسی تقریبات میں شمولیت کے لیے مہاراجا کی طرف سے کسی دعوت کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ ایسی تقریبات کے انعقاد کے لیے وسیع و عریض جنگل میں خیمے نصب کر دیئے جاتے تھے تاکہ یاتری اور زائرین ان میں شب بسری کر سکیں۔ کچھ خیمے بالکل ویران اور تقریب کی جگہ سے کافی فاصلے پر لگائے جاتے تھے۔ ایک ایسی کنواری کنیا (دوشیزہ) کو جس نے مہاراجا کی حیوانی خواہشات کی تکمیل سے انکار کیا تھا، اس کے والدین کے ہمراہ ایک ایسے ہی دورافتادہ نصب خیمے میں ٹھہرایا گیا۔ مہاراجا کے منصوبے کے مطابق رات کے وقت چند کرائے کے غنڈوں اور بدمعاشوں نے خیمے پر دھاوا بول دیا۔ لڑکی کے والدین کو مارا پیٹا اور انہیں بے بس کر کے چارپائیوں سے باندھ دیا اور لڑکی کو اغوا کر کے ایک قریبی گاؤں میں لے گئے اور اسے بھی باندھ دیا اور لڑکی کو اغوا کر کے ایک مکان کے اندر پھینک دیا۔ لڑکی چیختی چلاتی اور التجائیں کرتی

رہی کہ اسے چھوڑ دیا جائے اور اس کے ہاتھ پاؤں کھول دیئے جائیں لیکن کسی غنڈے پر کچھ اثر نہ ہوا۔ کچھ غنڈے مظلوم، بے گناہ اور کنواری کنیا کے کپڑوں کو تار تار کرنے میں مصروف تھے جبکہ دوسرے اس کی عزت سے کھیلنے کی کوشش کر رہے تھے اور یہ تمام ڈراما مہاراجا کی ہدایات کے عین مطابق کھیلا جا رہا تھا۔ اب اچانک مہاراجا ایک عام کسان کے لباس میں لڑکی کی چیخ و پکار سن کر، اس کی مدد کے لیے سامنے آ گیا اور غنڈوں کو مار مار کر بھگا دیا اور لڑکی کو ان کے چنگل سے نجات دلا دی۔ اس طرح مہاراجا نے لڑکی کے دل میں اپنے لیے ہمدردی اور احسان مندی کے جذبات پیدا کر لیے اور لڑکی نے اپنا سب کچھ اپنے بہادر شجاع اور عزت و ناموس کے محافظ کے سپرد کر دیا۔ بعد ازاں مہاراجا نے لڑکی کو بتایا کہ وہ عام لباس میں حالات کا جائزہ لینے کے لیے اتفاقاً ادھر سے گزر رہا تھا کہ اس نے لڑکی کی چیخ و پکار اور بدمعاشوں کے قہقہے سنے تو اسے کسی گڑبڑ کا شبہ ہوا۔ اس طرح مہاراجا نے لڑکی کو اپنی ہمدردی کی کہانی سناتے ہوئے یوں دلاسہ دیا:

> ”اس نے اپنا انسانی فرض سمجھتے ہوئے اپنی جان خطرے میں ڈال کر لڑکی کو غنڈوں کے چنگل سے بچانا اپنا فرض سمجھا۔ بعد میں ان بدمعاشوں کو پکڑ کر بظاہر بھاری سزائیں دینے اور جیل میں ڈالنے کا حکم دیا لیکن اس حکم پر عمل درآمد کی کبھی نوبت ہی نہیں آئی بلکہ الٹا ان بدمعاشوں کو خفیہ طور پر سونے چاندی کے سکوں اور دوسرے انعامات سے نوازا گیا اور ان کی عمدہ کارکردگی کی تعریف کی گئی“۔ (۳۲)

مہاراجا کے عشق کے قصوں کے حوالے سے ایک اہم واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ مہاراجہ کو اپنی مہارانی کی خادمہ سے عشق ہو گیا۔ وہ اسے کولھاپور سے اپنی شاہی ٹرین میں دیواس لے آیا۔ پہلے تو اسے محل میں ایک خادمہ ہی کی حیثیت سے رکھا لیکن بعد میں اسے اپنی دوسری بیوی بنا لیا۔ اس سے مہاراجہ اور مہارانی کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو گئی جس کے نتیجے میں مہارانی، مہاراجہ اور اس کے بیٹے کو دیواس میں چھوڑ کر اپنے والد کے پاس کولھاپور لوٹ گئی۔ مہارانی کا باپ اکا صاحب بھی بڑا تیز طراز اور عقلمند آدمی تھا، گھڑ سواری، تیر اندازی اور سیر شکار کا بڑا ماہر تھا۔ اس حوالے سے مہاراجا کو کتنی دولت خرچ کرنا پڑی اس کا اندازہ لگانا کتنا مشکل ہے۔ اس واقعہ کو ناول نگار نے اس طرح بیان کیا ہے:

> ”باہمی رنجش، تعلقات میں سرد مہری اور کشیدگی کی وجہ سے مہارانی نے کولھاپور میں بیٹھ کر مہاراجا کے خلاف سیاسی جنگ شروع کر دی اور تکوراؤ کو مختلف سیاسی مشکلات میں پھنسانے اور الزامات میں ملوث کرنے کی مہم کا آغاز کر دیا جس سے

مہاراجہ بہت گھبرایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے خلاف ہونے والی ریشہ دوانیوں کے دفاع اور الزامات کی صفائی کے لیے اسے بے حساب دولت خرچ کرنی پڑی"۔ (۳۳)

مہاراجا اپنے سے بڑوں کو مل کر انتہائی خوشی محسوس کرتا تھا۔ ایک دفعہ اسے حسب معمول مہاراجا لندن میں اپنی سالانہ چھٹیاں گزار رہا تھا کہ شہنشاہ انگلستان جارج پنجم اور ملکہ میری نے اسے ضیافت پر برمنگھم پیلس بلا لیا جس میں مہاراجا نے اپنا معمول کا شاہی لباس اور چوڑی دار ریشمی پاجامہ اور بروکینڈ کی اچکن پہن کر شرکت کی۔ اس کی نیلی پگڑی پر ہیرے جواہرات لٹک رہے تھے اور گلے میں قیمتی موتیوں کے ہار تھے۔ ان کے اوپر اس نے وہ نایاب اور قیمتی کمربند پہنا ہوا تھا جو مہاراجا کے دادا کو نادر شاہ نے بطور تحفہ دیا تھا۔ جب مہاراجا کسی ایسی تقریب میں جاتا تو اس کا انداز قابل دید ہوتا تھا۔ اس کے ناز نخروں کے بارے میں بتاتے ہوئے ناول نگار نے لکھا ہے:

"برمنگھم پیلس آمد پر وزیر دربار نے مہاراجا کا استقبال کیا اور اسے شہنشاہ اور ملکہ کے روبرو لے گیا۔ مہاراجا ایسی پارٹیوں میں بڑے شوق سے شریک ہوا کرتا تھا جن میں اندر کی اعلیٰ سوسائٹی کے مرد و خواتین شاہی خاندان کے افراد اور حکومت کے اعلیٰ ترین افسران شریک ہوتے تھے"۔ (۳۴)

ناول کے آخر میں بتایا گیا ہے کہ مہاراجا کے ملک کی سرحدیں تو بہت وسیع تھیں لیکن اس کو صرف اپنی عیاشیوں سے ہی سروکار ہے۔ ملکی نظم و نسق اس کے لیے ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ جیسا کہ ہندوستان کے نقشے پر کشمیر ایک دفاعی نقطۂ نظر سے دنیا کا اہم ترین علاقہ دکھائی دیتا ہے۔ ہندوستان شمال مغرب میں واقع ہونے کی وجہ سے ریاست جموں و کشمیر کئی طاقتوں کا نقطہ اتصال ہے۔ اس کی سرحدیں شمال میں پنجاب کے میدانوں سے اور دوسری اطراف میں ہندوستان کے اردگرد واقعہ دوسری بڑی طاقتوں سے ملتی ہیں۔ ان کو نقشے پر دیکھیں تو یوں نظر آئیں گی:

"یہ شمال میں قراقرم بشمول چینی ترکستان اور روسی ترکستان، مشرق میں سطح مرتفع، تبت، مغرب میں شمال مغربی صوبے اور آزاد ملک افغانستان میں گھرا ہوا ہے۔ جنوب میں پنجاب واقع ہے۔ جو اب مشرقی اور مغربی پنجاب میں تقسیم ہو چکا ہے۔ اس طرح یہ ریاست روس، چین، انڈیا، پاکستان، تبت اور افغانستان میں گھری ہوئی ہے"۔ (۳۵)

غرض کہ مہاراجا میں ایسے سرداروں کی عیاشیوں کی ایک لمبی چوڑی داستان بیان کی گئی جس میں ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں سے پردہ اُٹھایا گیا ہے ناول میں فکر کا پہلو کچھ اس طرح نمایاں ہے کہ جب اختیار اور دولت کا نشہ انسان پر حاوی ہو جاتا ہے تو بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اس کو برداشت کرتے ہوئے اپنے آپ کو راہ راست پر رکھتے ہیں۔ اس ناول کی کہانی ہمیں ایسے عیاش پرست مہاراجوں کے بارے میں سوچنے کی دعوت فکر دیتی ہے۔

۵۔ دھوپ چھاؤں-عطیہ زہرا

ناول دھوپ چھاؤں، عطیہ زاہرا کا لکھا ہوا اہم معاشرتی ناول ہے جس کی کہانی ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ فروری، اپریل اور مئی ۲۰۱۷ء کے شماروں میں قسط وار بیان کی گئی ہے۔ ناول میں معاشرے میں پنپنے والی بکھری ہوئی مختلف کہانیوں کے بارے میں حیرت انگیز انکشافات کا اظہار بڑی خوبصورتی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عطیہ زہرا کی کہانیوں کے کردار بڑے جاندار اور پُر اثر ہوتے ہیں جو پڑھنے والے کی دلچسپی کا باعث بنتے ہیں۔ وہ نہ صرف معاشرے کے خاص طبقہ کے لیے لکھتی ہیں بلکہ ان کی کہانیاں معاشرے میں رہنے والے تمام طبقوں میں یکساں طور پر مقبول ہوتی ہیں۔ ان کی کہانی زندگی کے تمام شعبوں میں ہماری رہنمائی کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان کے لکھنے کا انداز ملاحظہ ہو:

> "جب وہ بولتی تھیں تو ان کے الفاظ میں ایک ایسا عجیب و غریب ردھم ہوتا تھا کہ وہ الفاظ بڑی آسانی سے اطہر کے دماغ میں بیٹھ جاتے تھے۔ ایسے صاف ستھرے اور مزے دار ہوتے تھے وہ جیسے پھول ہوں، جب وہ مسکراتی تھیں تو ان کی آنکھوں کی سیاہ جھیلیں جیسے اور بھی وسیع ہو جاتی تھیں اور ان میں ایک ناقابل بیان نور جھلکنے لگتا تھا۔ مضبوط اور چمکتے ہوئے سفید دانت مسکراہٹ میں جیسے کھل پڑتے تھے۔ چہرے پر موجود جھریوں کے باوجود ان کے پورے چہرے پر اک خوبصورتی تھی۔ اسی وجہ سے ان کے چہرے پر بڑھاپے کی بجائے دوشیزگی کی شاداب کیفیت نظر آتی تھی"۔ (۳۶)

عطیہ زہرا کے لکھنے کا انداز جذباتی نہیں بلکہ اخلاقی ہے۔ وہ اپنے ناولوں میں اخلاقیات کا سبق کچھ اس طرح سے دیتی ہیں کہ معاشرے کی ایک پوری جیتی جاگتی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے، جس میں

کسی قسم کا ابہام دل و دماغ میں باقی نہیں رہتا۔ زیرِ نظر ناول میں ایسی ہی برائیوں سے پردہ اُٹھایا گیا ہے جن سے ہمیں معاشرے میں رہتے ہوئے عام طور پر واسطہ پڑتا ہے۔ وہ ہمیں معاشرے میں ہونے والی برائیوں سے دور رہنے کا مشورہ دیتی ہیں۔ ان کی کہانیاں ہمیں بتاتی ہیں کہ جرائم پیشہ لوگ پہلے شریف لوگوں کو اپنا دوست بناتے ہیں اور پھر ان کی مجبوریوں سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے انھیں غلط راستوں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے ہمیں معاشرے میں دوست بناتے وقت اچھی طرح سے غور و فکر کر کے دیکھ لینا چاہیے کہ ہم جس سے اپنے ذاتی خیالات کا تبادلہ کرتے ہیں آیا وہ اس قابل ہے بھی کہ اس پر اعتماد کیا جا سکے۔ ناول کا مذکورہ پیرا گراف ہماری اس سمت راہنمائی کرتا ہوا نظر آتا ہے :

> ”دراصل میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ایسے دوستوں سے دور رہنا چاہیے جو خود غلط راہوں کے مسافر ہوں اور وہ اپنی سہیلیوں کو بھی ایسی راہوں پر چلنے پر مجبور کریں۔ عابی آپ کی دوست ہے وہ جانتی ہے کہ عاشر نت نئی لڑکیوں سے دوستی کرنے کا شوقین ہے اور اس سلسلے میں وہ اس طرح سے لڑکیاں بدلتا ہے کہ کوئی لباس بھی اتنی جلدی نہیں بدلتا ہو گا جبکہ عاشر کو اس کی پرواہ بھی نہیں ہوتی ہے۔ اس لیے میں جانتا تھا وہ آپ سے بھی دوستی کر لے گا اور آپ بھی دوسری لڑکیوں کی طرح جذباتی ہو کر اپنے بہت سے سپنے اس سے جوڑ لو گی جبکہ وہ آپ کے اس پاگل پن سے فائدہ اٹھائے گا“۔ (۳۷)

کسی بھی انسان کی زندگی کا سفر اتنا آسان نہیں ہوتا۔ جب ہم کسی شخص کو کامیاب ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ہمارے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کاش یہ کامیابی میرا مقدر ہوتی اور میں اپنی زندگی پُر سکون طریقے سے گزار لیتا۔ یہ سوچنے سے پہلے اگر ہم اس شخص سے تبادلۂ خیال کریں تو ہمیں اندازہ ہو گا کہ اسے یہ کامیابی نہ تو ورثے میں ملی ہے اور نہ ہی بیٹھے بٹھائے اس نے حاصل کی ہے۔ اس کامیابی کے پیچھے اس کی برسوں میں رات دن کی گئی محنت، اَن تھک کوشش اور کئی ایک مشکلات سے گزر کر اس نے یہ سب کچھ حاصل کیا ہے۔ عطیہ زاہرا اپنے ناول میں ہماری توجہ ایک ایسے شخص کی زندگی کی جدوجہد کی جانب مبذول کراتی ہیں جس نے اپنی اوائل عمری میں دن رات ایک کر کے اَن تھک محنت کے ساتھ اپنا مقام بنایا تھا:

> ”جب میں چھوٹا تھا تو سارا سارا دن ریلوے لائن پر آنے والے مسافروں کا سامان اٹھا اٹھا کر کچھ پیسے کماتا۔ صبح سورج نکلنے سے لے کر رات تاروں کے ظاہر ہونے تک۔

میں نازک کندھوں پر سامان اٹھاتا۔ کبھی کبھی سورج کی روشنی تیز ہوتی تھی کہ مجھے
یوں محسوس ہوتا کہ میرا دماغ کسی ہنڈیا کی طرح کھدبد کھدبد کر رہا ہو"۔ (۳۸)

اس شخص کی کہانی بیان کرتے ہوئے ناول نگار نے جو حالات بتائے ہیں اس سے اس کی کسمپرسی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس کی زندگی میں ایسے حالات بھی نہیں آئے کہ وہ اپنی پریشانیاں اور تکالیف کسی کے ساتھ بانٹ سکے۔ ہمیشہ اپنے دل و دماغ کے ساتھ سوچتا رہتا اور پریشان ہوتا رہتا۔ وہ اپنی زندگی میں بہت سے کام بدل بدل کر کرتا ہے لیکن اس کی ہمت میں کبھی کمی نہیں دیکھی گئی۔ ہمیشہ اپنے اوپر ظلم کر کے کام کرتا رہا۔ اپنی محنت کے حالات اور اوقعات بتاتے ہوئے ان الفاظ کا سہارا لیتا ہے:

"کمر کسی کمان کی طرح جھکائے جھکائے ہڈیاں چٹخنے لگتیں۔ دل فریاد کرتا۔۔۔ لب فریاد کرتے۔۔۔ پر کوئی بھی سننے والا نہ تھا۔ بس اسی طرح لوگوں کا سامان اٹھاتے رہنا ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ تھک کر طاقت کی طنابیں ٹوٹ جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ میں اوندھے منہ زمین پر گر جاتا۔۔۔ اس وقت مجھے اتنی خوشی ہوتی کہ میں بیان بھی نہیں کر سکتا۔ میں سوچتا کہ چلو جان چھوٹ گئی۔ جتنا بوجھ اٹھا سکتا تھا اٹھالیا۔ پھر تمہیں یقین نہیں آئے گا کہ میں اسی طرح پڑا رہتا۔۔۔ دل چاہتا کہ اب کبھی بھی نہ اٹھ سکوں۔ مگر میں پھر اٹھتا اور بوجھ اٹھالیتا۔ زندگی کی گاڑی چلتی رہی۔ میں نے دن رات کی تفریق کے بغیر کام کیا۔ بہت سارے کام۔۔۔ ان سب کاموں کی نوعیت بدلتی چلی گئی۔ میری محنت میں کوئی کمی نہیں آئی"۔ (۳۹)

عطیہ زہرا کے ناول دھوپ چھاؤں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمیں مشکل حالات سے کبھی گھبرانا اور پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ حالات کیسے بھی ہوں، وقت کیسا بھی مشکل ہو آخر کار گزر جاتا ہے۔ انسان کو ہمت اور حوصلے کا دامن نہیں چھوڑنا۔ زندگی میں کبھی دھوپ ہے تو کبھی چھاؤں، بُرے دنوں کے بعد اچھے حالات ضرور آتے ہیں۔

ماہنامہ اردو ڈائجسٹ، حکایت اور سیارہ کا تقابل:

گزشتہ ساٹھ برسوں سے اردو قارئین کا سب سے بڑا ہالہ (گھیرا) اردو ڈائجسٹوں کے گرد ہے۔ کافی کمی بیشی، نشیب و فراز اور حالات موافق نہ ہونے کے باوجود بھی صورتحال جوں کی توں ہی نظر آتی ہے۔ اس کے

ساتھ ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ ڈائجسٹوں کا عروج اب کہیں پیچھے رہ گیا ہے۔ ان تینوں ڈائجسٹوں میں شامل تحریروں کو ادبِ عالیہ، مقبول عام افسانوی ادب اور پلپ فکشن کے تناظر میں رکھ کر ان کا فکری رجحان کا تقابل کیا جارہا ہے۔ پاکستان میں شاید ہی کوئی ایسا ادبی جریدہ ہو جو باقاعدگی سے کلاسیک ادیبوں یا کلاسیک شاعروں کی تحریریں میں شائع کرنے کا دعویٰ رکھتا ہو اور ایسی نازک صورتحال میں بھی ان ڈائجسٹوں نے اپنے اپنے حصے کی کوششیں جاری رکھی ہوئی ہیں اور باقاعدگی سے ان کی تحریریں شائع کرتے ہیں تاکہ نئے پڑھنے والوں کو بھی ادب سے لگاؤ ہو۔

اردو ڈائجسٹ نے (۲۰۱۷ء-۲۰۱۹ء) نے اپنے شماروں میں ایسے افسانہ نگاروں کو جگہ دی جن کا ادب میں اپنا الگ مقام ہے اور ادب سے تعلق رکھنے والے سب ان کو جانتے ہیں۔ قیام پاکستان کے وقت چونکہ ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی اور اس وقت لکھنے والوں کی ایک کثیر تعداد اس سے وابستہ تھی اور اس تحریک نے نہ صرف موضوعات کو جگہ دی بلکہ حقیقت نگاری میں بھی متنوع تجربات کئے۔ افسانے میں شہری زندگی کے ساتھ دیہاتوں اور کسانوں کے مسائل کی عکاسی کی انھی میں ایک بڑا نام احمد ندیم قاسمی کا بھی ہے۔ ان کی افسانہ نگاری میں جو پہچان بنی وہ حقیقت نگاری پر مبنی تھی اور ان کا تعلق ترقی پسند تحریک سے تھا۔ اردو ڈائجسٹ میں شامل ان کے افسانے جوتا، سونے کا ہار شامل ہیں جن میں ہمارے معاشرے کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے بعد دوسرا بڑا نام اشفاق احمد جن کو قیام پاکستان کے بعد شہرت ملی اور انہوں نے ادب میں اپنا مقام بنایا ان کا افسانہ بندر ابندر کی کج گلی ہے جو کہ مڈل کلاس طبقے کی کہانی ہے۔ خواجہ حسن نظامی ان کے نام کو کون نہیں جانتا ان کا افسانہ " تاج محل کا خانسامہ " یہ کہانی بھی ہمارے معاشرے کی کہانی ہے کہ جیسے بھی حالات ہوں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اگلا افسانہ "انوکھا ڈرائیور" کے نام سے حجاب امتیاز علی تاج کا ہے یہ بھی ہمارے سماج کے وفادار ملازم کی کہانی ہے جو وفاداری میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ "دل کا قرار" رفیع احمد قدائی کا افسانہ ہے یہ ایسے افسانہ نگار ہیں جن کو اتنی پذیرائی نہ مل سکی جس کے وہ حقدار تھے لیکن ان کی تحریر پڑھ کر ادب عالیہ جیسی تحریر کا احساس ہوتا ہے۔ یہ سماجی کہانی ہے جس میں دولت کا نشہ انسان کو غلطیاں کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ "کاغذی رشتہ " کرشن چندر کا افسانہ ہے یہ بھی ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے ان کا یہ افسانہ ہندوستانی زندگی کے گرد گھومتا ہے۔

حکایت کا شمار بھی ان ادبی ڈائجسٹوں میں ہوتا ہے کہ جنہوں نے قیام پاکستان کے بعد اپنی خوب پہچان بنائی۔ اس ڈائجسٹ نے بھی آغاز سے اپنا معیار بلند رکھنے کی بھرپور کوشش کی حکایت نے اردو ادب کے درخشندہ ستاروں کو ڈائجسٹ کی زینت بنایا اور ان کے مشہور افسانوں کو جگہ دی۔ ادب عالیہ میں جس افسانے کو جگہ دی ہے۔ وہ "متر آدمی" بلونت سنگھ کا ہے چونکہ بلونت سنگھ نے بھی سکھوں کی معاشرت اور ماحول پر لکھا ہے اور یہ سکھ کی کہانی ہے ایسی کہانی ہے کہ انسان جو چاہے کرے لیکن ہونا وہی ہے جو اللہ چاہتا ہے۔

اردو ڈائجسٹ اور حکایت کی طرح سیارہ ڈائجسٹ نے بھی ایسے موضوعات کو جگہ دی جن کو قارئین پسند کرتے ہیں اور اپنا آپ ان کہانیوں میں تلاشنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ادب عالیہ میں سیارہ نے بھی احمد ندیم قاسمی جیسے بڑے نام کو شامل کیا اور ان کا افسانہ "زلیخا" شامل کیا جس کا موضوع ہمارے معاشرے کی ہی عورت ہے جو زچگی کے دوران تکالیف برداشت کرتی ہے۔ اگلا افسانہ کوثر چاند پوری کا ہے ان کا اسلوب پریم چند جیسا ہے ان کا یہ افسانہ "چاندنی کا سفر" ہے جس کا موضوع بھی حقیقت سے قریب تر ہے۔ کسی کی موت کا صدمہ کسی کو بھی نیم پاگل کر دیتا ہے۔ کرشن چندر ایسا نام ہے جن کا تعلق بھی ترقی پسند تحریک سے تھا ان کے موضوعات بھی معاشرے پر ہیں۔ "جگر گوشے" ان کا افسانہ ہے جس میں وہ بچوں کی پرورش کس انداز میں ہونی چاہیے اس پر بات کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اگلا افسانہ احمد ندیم قاسمی کا ہے "احسان" کسی بھی لڑکی کو اپنی شادی کی بات کرنے کا پورا حق ہے یہ اس افسانے کا موضوع ہے۔ "میرے گناہ کم نہیں" محمد سلیم اختر کا افسانہ ہے انسان چھوٹے جرائم سے بڑے جرائم کا مرتکب ہوتا ہے۔ یہ بھی ہمارے سماج کی کہانی ہے۔

اردو ڈائجسٹ نے جہاں ادب عالیہ سے تعلق رکھنے والے یا ادب عالیہ جیسی تحریروں کو جگہ دی وہاں مقبول عام ادب کو بھی پروان چڑھانے کی کوشش کی۔ گو کہ اس عرصے میں ۲۰۱۷_۲۰۱۹ تک کے شماروں میں زیادہ مصنف شامل نہیں ہیں۔ ان میں افسانہ "مہمان" رضیہ بٹ کا افسانہ ہے اور رضیہ بٹ پاکستانی معاشرے میں بہت مقبول مصنفہ رہیں۔ ان کے موضوعات عورتوں کے متعلق ہیں اور یہ افسانہ بھی عورت کی نفسیات پر شامل ہے۔ اگلا افسانہ نیلم احمد! شیر کا ہے۔ "سفید بال" جیسے عنوان سے ہی ظاہر ہے کہ یہ بھی عورت کی نفسیات پر اور اس کی سوچ پر مبنی ہے۔

حکایت نے ادب عالیہ کے حوالے سے اپنے بھی شماروں میں اردو ڈائجسٹ اور سیارہ کی نسبت بہت کم لوگوں کو شامل کیا گیا ہے لیکن حقیقت ایک افسانہ فرخندہ لودھی کا افسانہ ہے۔ ہمارے معاشرے کی ایسی کہانی

ہے جو اپنی بہن بیٹی کا گھر بسانے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔ "ادھوری کہانی" سید شاہدہ شاہ کی ہے ان کے افسانے کا موضوع ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی۔

سیارہ نے اپنے ان شماروں (۲۰۷_۲۰۱۹) میں زیادہ ادب عالیہ جیسی تحریروں کو شائع کیا۔ مقبول عام ادب میں کنول مشتاق کا افسانہ نئی آنکھیں شامل کیا گیا ہے۔ یہ ایسی کہانی ہے جس میں حقیقت کا رنگ نہیں ہے۔ سیارہ نے ایک مقبول داستان کو مل رانو بھی شامل کی ہے جو کہ محبت کی کہانی ہے اور جس کا حقیقت سے شاید کوئی واسطہ نہیں "عذرا اصغر" کا افسانہ "آٹھ سو نوے"، "تنخواہ دار" طبقے کی کہانی ہے۔

پلپ فکشن چونکہ ایسا ادب ہے جو کہ سطحی قسم کا ادب ہے اور ہمارے ہاں ایسا ادب تخلیق نہیں کیا جاتا جس میں جنسیت کو ابھارا جائے یا ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں جس سے کمتری کا احساس ہو اس میں کوئی شک نہیں یہ ڈائجسٹ ہر طرح کے موضوعات کو اپنا حصہ بناتے ہیں لیکن ان کی تحریروں میں عریانی اور بے باکی دکھائی نہیں دیتی۔

اردو ڈائجسٹ میں جو بھی ناول شامل کیے ہیں ان کو ادب عالیہ کے ترازو میں نہیں تولا جا سکتا کیونکہ ان کی تحریریں پائیدار نہیں ہیں اور ایسی کہانیاں جن میں حقیقت کا رنگ نظر نہیں آئے وہ ادب عالیہ کی تحریر نہیں ہو سکتی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سیارہ میں بھی ناول شامل کیے گئے ہیں لیکن یہ ناول بھی ادب عالیہ کے زمرے میں نہیں آتے۔

حکایت نے ہمیشہ سے ناولوں کو اپنے شماروں میں جگہ دی ہے لیکن ایسے ناولوں کو جو کہ ادب عالیہ کے اصولوں پر پورا نہیں اترتے۔

اردو ڈائجسٹ مقبول عام افسانوی ادب اور ایسی کہانیاں جن کو لوگ شوق سے پڑھتے ہوں اور ان کی زبان بھی لوگوں کو آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہو ان کو مقبول عام ادب کا نام دیا جاتا ہے۔ "لاش" ریکس سٹاؤٹ یہ ایک سنسنی خیز کہانی ہونے کے باوجود بھی پلپ فکشن کے معیار پر پورا نہیں اترتی اور اس کو مقبول عام افسانوی ادب میں رکھا گیا ہے۔ اس کا موضوع بھی نفسیاتی کشمکش ہے۔ دوسرا ناول انجم فاروقی ساحلی کا ناول "اصلی چہرہ" کے نام سے ہے جو کہ جاسوسی ناول ہے۔ جو ختم ہو جانے کے بعد بھی کافی سوالات لیے کھڑا ہے۔

ریاض عاقب کوہلر کو آج کے دور میں کون نہیں جانتا۔ ان کے بہت سارے ناول منظر عام پر آ چکے ہیں جن کو لوگوں نے پسند کیا اور ان کو پذیرائی ملی۔ "پشیمان" ان کا ناول ہے جس کا موضوع سماج کا عام موضوع ہے۔ "محبت میں ناکامی" اور جس کی وجہ خاندانی پس منظر اور مڈل کلاس ہے، اس کے علاوہ حکایت میں محمد ابراہیم ظاہر کا ناول "مہاراجہ" سردار بہادر سر گور نام سنگھ پٹیالہ ہے۔ ان کے زیادہ تر موضوعات تحریک پاکستان اور دیگر علمی و تاریخی کتابیں ہیں۔ قیام پاکستان کے وقت کے موضوعات کو انہوں نے اپنے قلم کے ذریعے لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی۔ اس میں بھی پلپ فکشن کی جھلک نظر نہیں آتی۔

سیارہ ڈائجسٹ میں ایک ناول "دھوپ چھاؤں" عطیہ زہرا کا ہے اس ناول کا موضوع معاشرتی ہے۔ برے دنوں کے بعد اچھے دن بھی ضرور آتے ہیں۔ یہ ناول ان کا مقبول عام افسانوی ادب کی نسبت رکھتا ہے۔ سیارہ میں بھی پلپ فکشن کے حوالے سے کوئی تحریر نظر نہیں آتی۔ اردو ڈائجسٹ جس کا آغاز ۱۹۶۰ء میں الطاف حسین قریشی نے کیا تھا اس میں کوئی شک نہیں بذات خود ان کا بڑا نام تھا۔ حکایت جیسے ادبی ڈائجسٹ کو بھی کون نہیں جانتا۔ عنایت اللہ جنہوں نے سیارہ ڈائجسٹ کی جب مجلس مشاورت سنبھالی اور بے شمار کہانیاں اور مضامین لوگوں کے لیے پیش کیے اور بعد میں انہوں نے اپنا ذاتی ڈائجسٹ حکایت کے نام سے شروع کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان تینوں ڈائجسٹوں نے اپنے شماروں میں ہر طرح کے موضوعات کو جگہ دی۔ ہمارے ہاں یہ تصور کیا جاتا رہا ہے کہ ڈائجسٹوں میں چھپنے والی کہانیاں ان کے موضوعات صرف خاندانوں کے جھگڑوں، خاندانی سازشوں پر ہی مبنی ہیں لیکن ان موضوعات سے ہٹ کر بھی اور موضوعات ملتے ہیں۔

اردو ڈائجسٹ کے شماروں نے ادب عالیہ سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگاروں کو جگہ دی اور یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ انہوں نے اپنا معیار برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ انہوں نے انہی افسانوں کا انتخاب کیا جن کے موضوعات ہمارے معاشرے سے میل کھاتے ہیں۔ جن کو پڑھ کر ہمیں اجنبیت کا احساس نہ ہو اور سیارہ کے شماروں میں بھی اردو ڈائجسٹ جیسے ہی موضوعات سامنے آئے اور انہوں نے بھی کچھ ایسے اہم لوگوں کا انتخاب شامل کیا جن کو اردو ڈائجسٹ نے اپنے شماروں کی زینت بنایا۔

افسانوں کے حوالے سے دیکھا جائے تو اردو ڈائجسٹ اور سیارہ دونوں نے تقریباً ایک جیسے موضوعات کے افسانوں کو ہی اپنے شماروں میں شائع کیا ہے جبکہ ان کے مقابلے میں حکایت کی شماروں میں ایسے لوگ شامل ہیں جن کا سرمایہ کم نظر آتا ہے ان کا تعلق ادب عالیہ سے بھی ہے لیکن جس طرح باقیوں کو پذیرائی ملی اس

طرح ان کو نہیں ملی اور ان کے موضوعات بھی ان سے الگ ہیں۔ افسانوں کے لحاظ سے دیکھا جائے تو سیارہ اور اردو ڈائجسٹ کا معیار بہتر ہے اور ان کے موضوعات میں تنوع ہے۔ ان ڈائجسٹوں نے چونکہ مقبول عام افسانوی ادب کو بھی شماروں میں شامل کیا ہے تو اردو ڈائجسٹ نے مقبول عام افسانوی ادب سے تعلق رکھنے والی دو خواتین رضیہ بٹ اور نیلم شبیر کو شامل کیا ہے جن کی کہانیاں لوگوں میں بہت مقبول ہیں۔ دونوں کا موضوع عورت ہے حکایت نے بھی اپنے شماروں میں ایسے لوگوں کو شامل نہیں کیا کہ جو لوگوں میں مقبول ہیں اور سیارہ نے بھی جو افسانے شامل کیے ہیں ان کے موضوعات نسبت ہے اسے اندر کم کشش رکھتے ہیں۔ اردو ڈائجسٹ کے شامل کردہ افسانے اور موضوعات باقی دونوں ڈائجسٹوں کی نسبت زیادہ مقبول اور اہم ہیں۔

اردو ڈائجسٹ سیارہ اور حکایت میں جو ناول شامل کیے گئے ہیں وہ بھی مقبول عام افسانوی ادب میں آتے ہیں ان کے موضوعات بھی سنسنی خیز واقعات اور سسپنس، محبت میں ناکامی، تحریک پاکستان، معاشرتی کہانی پر مشتمل ہیں اور لوگ اسی طرح کے موضوعات کو پسند کرتے ہیں جن میں سسپنس اور سنسنی خیز واقعات ہوں تو ناولوں کے حوالے سے دیکھا جائے تو اردو ڈائجسٹ کے موضوعات لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں پلپ فکشن کے حوالے سے دیکھا جائے تو ان ڈائجسٹوں میں کوئی بھی تحریر پلپ فکشن میں نہیں آتی۔ ان تینوں ڈائجسٹوں کے فکری رجحانات کے تقابل میں یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ سب سے زیادہ موضوعات کی وسعت اور تنوع اردو ڈائجسٹ میں ملتا ہے اس کے بعد سیارہ اور آخر میں حکایت سامنے آتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد خان اشرف، ڈاکٹر، اردو تنقید کا رومانوی دبستان، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۱۶۲، ۱۲۳

۲۔ احمد ندیم قاسمی، جوتا، مشمولہ، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۷، شمارہ ۷)، لاہور، ۳۲۵- جی تھری، جوہر ٹاؤن، جولائی ۲۰۱۷ء، ص ۸۶

۳۔ اشفاق احمد، بندر ابن کی کج کلی میں، ایضاً، ص ۱۴۲

۴۔ خواجہ حسن نظامی، تاج محل کا خانسامہ، مشمولہ، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۷، شمارہ ۸)، لاہور، اگست ۲۰۱۷ء، ص ۱۴۴

۵۔ حجاب امتیاز، انوکھا ڈرائیور، مشمولہ، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۷، شمارہ ۹)، لاہور، ستمبر ۲۰۱۷ء، ص ۹۸-۱۹۹

۶۔ رضیہ بٹ، مہمان، مشمولہ، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۸، شمارہ ۱)، لاہور، جنوری ۲۰۱۸ء، ص ۲۰۳

۷۔ رضیہ بٹ، مہمان، مشمولہ، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ، ایضاً، جنوری ۲۰۱۸ء، ص ۲۰۳

۸۔ احمد ندیم قاسمی، سونے کا ہار، مشمولہ، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۸، شمارہ ۲)، لاہور، فروری ۲۰۱۸ء، ص ۵

۹۔ رفیع احمد قدوائی، دل کا قرار، مشمولہ، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۸، شمارہ ۶)، لاہور، جون ۲۰۱۸ء، ص ۱۹۹-۲۰۰

۱۰۔ نیلم احمد بشیر، سفید بال، مشمولہ، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ، ایضاً، ص ۲۰۷

۱۱۔ کرشن چندر، کاغذی رشتہ، مشمولہ، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۹، شمارہ ۴)، لاہور، اپریل ۲۰۱۹ء، ص ۱۵۶

۱۲۔ فرخندہ لودھی، واماندگی شوق، مشمولہ، ماہنامہ حکایت (جلد ۴۸، شمارہ ۸)، لاہور، ۲۶- پٹیالہ گراؤنڈ، لنک میکلوڈ روڈ، مئی ۲۰۱۸ء، ص ۱۴۳

۱۳۔ شاہدہ شاہ، سیدہ، ادھوری کہانی، مشمولہ، ماہنامہ حکایت (جلد ۴۸، شمارہ ۱۰)، لاہور، جون ۲۰۱۸ء، ص ۱۲۶

۱۴۔ بلونت سنگھ، متر آدمی، مشمولہ، ماہنامہ حکایت (جلد ۵۰، شمارہ ۴)، لاہور، دسمبر ۲۰۱۹ء، ص ۲۰۰

۱۵۔ احمد ندیم قاسمی، زلیخا، مشمولہ، ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ (جلد ۴، شمارہ ۱)، لاہور، اللہ والا پرنٹرز، ریواز گارڈن، جنوری ۲۰۱۷ء، ص ۱۷۷

۱۶۔ کوثر چاندپوری، چاندنی کا سفر، مشمولہ، ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ (جلد ۴، شمارہ ۵)، لاہور، مئی ۲۰۱۷ء، ص ۱۲۶

۱۷۔ کرشن چندر، جگر گوشے، مشمولہ، ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ (جلد ۴، شمارہ ۷)، لاہور، جولائی ۲۰۱۷ء ص ۱۴۶

۱۸۔ احمد ندیم قاسمی، احسان، مشمولہ، ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ (جلد ۴، شمارہ ۱۱)، لاہور، نومبر ۲۰۱۷ء، ص ۱۸۶

۱۹۔ کنول مشتاق، نئی آنکھیں، مشمولہ، ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ (جلد ۵۵، شمارہ ۳)، لاہور، مارچ ۲۰۱۸ء، ص ۹۰

۲۰۔ شریف آرپن، مومل رانو، مشمولہ، ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ (جلد ۵۵، شمارہ ۶)، لاہور، جون ۲۰۱۸ء، ص ۱۲۶

۲۱۔ محمد سلیم اختر، میرے گناہ کم نہیں، مشمولہ، ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ (جلد ۵۶، شمارہ ۶)، لاہور، جون ۲۰۱۹ء، ص ۱۵۸

۲۲۔ عذرا اصغر، آٹھ سو نوّے، مشمولہ، ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ (جلد ۵۶، شمارہ ۷)، لاہور، جولائی ۲۰۱۹ء، ص ۱۳۸

۲۳۔ انجم فاروق ساحلی، اصلی چہرہ، مشمولہ، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۷، شمارہ ۲)، لاہور، فروری ۲۰۱۷ء، ص ۲۲۴

۲۴۔ انجم فاروق ساحلی، اصلی چہرہ، مشمولہ، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۹، شمارہ ۴)، لاہور، اپریل ۲۰۱۹ء، ص ۲۱۴

۲۵۔ ریاض عاقب کوہلر، پشمان، مشمولہ، ماہنامہ حکایت (جلد ۴۸، شمارہ ۱۰)، لاہور، دسمبر ۲۰۱۷ء، ص ۴۸

۲۶۔ ریاض عاقب کوہلر، پشیمان، مشمولہ، ماہنامہ حکایت (جلد ۴۸، شمارہ ۶-۷)، لاہور، فروری، مارچ، ۲۰۱۸ء، ص ۳۸

۲۷۔ ریاض عاقب کوہلر، پشیمان، مشمولہ، ماہنامہ حکایت (جلد ۴۸، شمارہ ۹)، لاہور، مئی، ۲۰۱۸، ص ۳۸-۳۹

۲۸۔ ریاض عاقب کوہلر، پشیمان، مشمولہ، ماہنامہ حکایت (جلد ۴۸، شمارہ ۱۰)، لاہور، جون، ۲۰۱۸ ص ۴۲

۲۹۔ سردار بہادر گورنام سنگھ پٹیالہ، مہاراجہ، مشمولہ، ماہنامہ حکایت (جلد ۴۸، شمارہ ۶-۷)، لاہور، فروری، مارچ ۲۰۱۸ء ص ۵۹

۳۰۔ ریاض عاقب کوہلر، پشیمان، مشمولہ، ماہنامہ حکایت (جلد ۴۹، شمارہ ۱۱)، لاہور، جولائی ۲۰۱۸ء، ص ۱۸۲

۳۱۔ ریاض عاقب کوہلر، پشیمان، مشمولہ، ماہنامہ حکایت (جلد ۴۸، شمارہ ۱۲)، لاہور، اگست ۲۰۱۸ء، ص ۱۵۸

۳۲۔ ریاض عاقب کوہلر، پشیمان، مشمولہ، ماہنامہ حکایت (جلد ۴۹، شمارہ ۱)، لاہور، ستمبر ۲۰۱۸ء، ص ۱۲۵

۳۳۔ ریاض عاقب کوہلر، پشیمان، مشمولہ، ماہنامہ حکایت (جلد ۴، شمارہ ۲)، لاہور، فروری ۲۰۱۹ء، ص ۱۰۹-۱۱۰

۳۴۔ ریاض عاقب کوہلر، پشیمان، مشمولہ، ماہنامہ حکایت (جلد ۴۹، شمارہ ۷)، لاہور، مارچ ۲۰۱۹ء، ص ۱۹۱

۳۵۔ ریاض عاقب کوہلر، پشیمان، مشمولہ، ماہنامہ حکایت (جلد ۴۹، شمارہ ۱۰)، لاہور، جون ۲۰۱۹ء، ص ۱۹۶

۳۶۔ عطیہ زاہرہ، دھوپ چھاؤں، سیارہ ڈائجسٹ (جلد ۴، شمارہ ۲)، لاہور، اللہ والا پرنٹرز، ریواز گارڈن، فروری ۲۰۱۷، ص ۹۳

۳۷۔ عطیہ زاہرہ، دھوپ چھاؤں، سیارہ ڈائجسٹ (جلد ۴، شمارہ ۴)، لاہور، اپریل ۲۰۱۷ء، ص ۱۲۵

۳۸۔ عطیہ زاہرہ، دھوپ چھاؤں، سیارہ ڈائجسٹ (جلد ۴، شمارہ ۷)، لاہور، مئی ۲۰۱۷، ص ۴۴-۴۵

۳۹۔ عطیہ زاہرہ، دھوپ چھاؤں، سیارہ ڈائجسٹ (جلد ۴، شمارہ ۷)، لاہور، مئی ۲۰۱۷، ص ۴۴-۴۵

باب سوم:

ماہنامہ ''اردو ڈائجسٹ''، ''حکایت'' اور ''سیارہ'' ڈائجسٹ میں ادب عالیہ، مقبول عام افسانوی ادب اور پلپ فکشن کے فنی رجحانات کا تقابل

مقالے کا باب سوم ماہنامہ ''اردو ڈائجسٹ''، ماہنامہ ''حکایت'' اور ماہنامہ ''سیارہ'' ڈائجسٹ میں ۲۰۱۷ء-۲۰۱۹ء کے شماروں میں شائع ہونے افسانوں اور ناولوں کے فنی رجحانات کے تقابل پر شامل ہے۔ اس باب میں ایسی تحریروں کو مقالے کا حصہ بنایا گیا ہے جن سے محقق مستفید ہو سکیں۔ اس باب میں شامل افسانوں اور ناولوں کا فنی تجزیہ کر کے ان کا تقابل پیش کیا گیا ہے۔

فن:

فن کیا ہے ؟ یہ ایک اہم سوال ہے فن کے کیا تقاضے ہیں ؟ ماہر فن کسے کہہ سکتے ہیں ؟ فن کن لوازمات اور عناصر سے تشکیل پاتا ہے ؟ فن اور زندگی کا آپس میں کیا تعلق ہے ؟ فنون لطیفہ اور انسانی زندگی آپس میں کیا ربط و ضبط رکھتے ہیں ؟ کیا فن سے انسانی زندگی پر مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں ؟ تعمیرات نقاشی کندہ کاری خطاتی موسیقی رقص کے علاوہ کیا ہے ؟ افسانہ، ناول، ڈرامہ، آپ بیتی، سوانح نگاری، شاعری، نثر اور تمام اسالیب جو انسان اپنے اظہار ذات کے لیے بروئے کار لاتا ہے۔ کیا یہ سب فن کا حصہ ہیں ؟ کہا جاتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بچوں نے کچھ الفاظ ایسے بیان کیے جو باوزن تھے اور وہ شاعری کہلائے۔ اگر انسانی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں جادو اور شعبدہ بازی بھی فنون نظر آتے ہیں۔ ان میں نجوم علم جفر بھی شامل ہے۔ صرف ماہرین ہی بیان کر سکتے تھے چنانچہ ان کو بھی فنون کا درجہ حاصل ہے۔ اجنتا کے غاروں میں ہزاروں سال پہلے کا انسان بہت کچھ سیکھ رہا تھا کیوں تصویر بنانے یا کچھ بھی غاروں میں لکھنے کا مقصد کیا تھا۔ دراصل انسان اظہار ذات چاہتا تھا۔ ہر وہ طریقہ، سلسلہ، انداز فکر طور طریقہ جس کے ذریعے، رنگ کے ذریعے یا پھر کسی بھی اور ذریعے سے انسان کا اظہار ذات فن ہے۔ مدت

مدید تک انسان تعمیرات کرتا آیا ہے۔ بھلے وہ ناروے میں ہیملٹ کا قلعہ ہو۔ ہسپانیہ کے شاہی محلات ہوں۔ ہسپانیہ کے محلات ہوں یا پھر وہ تمام تعمیرات جیسے ہندوستان کے اندر شاہی قلعہ ،لاہور کا بادشاہی قلعہ ، دلی کا لال قلعہ ہو، مینار پاکستان چوبرجی مسجد وزیر خان کتنے ہی محلات، کتنی عمارتیں فن تعمیر کا شاہکار ہیں اور یہ تعمیرات کیوں کی گئیں۔ اس لیے تاکہ آنے والے زمانوں تک ان کے نقوش باقی رہیں بلکہ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ اگر ہمیں تعمیر شدہ تاج محل ایک محبوب کی یاد میں تعمیر کیا گیا۔ گویا کہ تعمیرات فنون لطیفہ ہیں اور اس سے انسانی زندگیوں کو اظہار ذات کو بہت زیادہ فوائد ملتے ہیں فن جیسا کہ ذکر کیا گیا دراصل اظہار ذات کا ایک انداز ہے۔ اظہار ساتھ کے کئی طریقہ کار ہیں۔ اسی طرح سے نکاشی کندہ کاری ،بت تراشی اور اسی قبیل دیگر انسانی سرگرمیاں جن کی ذیل میں آتی ہیں کیونکہ یہ بھی اظہار ذات کا ایک انداز ہے۔ انسان نسل در نسل ارتقاءپذیر رہا ہے اور یہ آج بھی اپنے جوبن پر ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ جس دن انسان نے حرف لکھنا سیکھ لیا اور رنگ کا استعمال تعمیری مصالحہ جات کو بنانے کا ہنر پالیا دراصل وہ دن وہ زمانہ فن کے آغاز کا ابتدائیہ تھا۔ انسان نے دھیرے دھیرے فن کو ری فائن refine کرنے سے اظہار ذات کے نئے طریقے اپنا لیے۔ زمانہ صدیوں کی کروٹوں کے بعد لفظ و معنی کے سلاسل کے ذریعے اپنا اظہار ذات کا رشتہ استوار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یوں تسلسل کے نتیجے میں داستان، ناول، افسانہ، ڈرامہ اور تمام شعری تخلیقات وغیرہ وجود میں آگئیں۔ دیگر فنون کی مانند نثری اور شعری تخلیقات کے اصول و ضوابط تحریر کیے گئے۔

فن سیکھنے اور سکھانے کا عمل بھی ہے اور سیکھ رہے ہیں سکھانے کے لیے اصول جب تک متعین نہ کیے جائیں اس وقت تک اس سرگرمی کو روب عمل میں لایا گیا۔ آج اسی روش کے پیش نظر داستان ،ڈراما، ناول، افسانہ و دیگر تصانیف تخلیق کی جا رہی ہیں یہی نہیں غزل ، نظم ،مرثیہ، قصیدہ، گیت دیگر اصناف شعری جب وسیلہ اظہار ٹھہریں تو ان کے بھی اصول مقرر کیے گئے ہیں۔

فن اور زندگی کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ فنون لطیفہ اگر ایک طرف انسانی زندگی کے لیے اظہار ذات کا وسیلہ ٹھہرتے ہیں تو دوسری طرف فنون لطیفہ انسانی تشفی، سکون قلب اور اور روحانی طرفع کا باعث بنتے ہیں۔ اگر ایک افسانہ نگار ایک طرف افسانہ لکھنے کے بعد خط کشید کرتا ہے تو وہی افسانہ پڑھنے والا قاری بھی افسانے سے لذت کشید کرتا ہے جیسے ایک ماہر تعمیر، تعمیر مکمل کرنے کے بعد لذت محسوس کرتا

ہے اور اس تعمیر میں رہنے والا لذت کا خوگر بن جاتا ہے۔ ایسے جب داستان کہی جاتی ہے تو داستان کو اظہار ذات کے ساتھ ساتھ عجب طرح کی لذت سے گزرتا ہے اور داستان سننے والا ہمہ تن گوش ہو کر اس داستان کی جمالیات اپنے روح میں اتارتا ہے۔ اسی طرح ایک ناول لکھنے والا شخص جب ناول لکھتا ہے تو ایسے جیسے اترتے راہ سے گزر رہا ہو لیکن ناول مکمل کر لینے کے بعد بشاشت اور مسرت اس کے چہرے پر کھیل جاتی ہے۔ ناول پڑھنے والا قاری جب اس ناول کا مطالعہ کرتا ہے پڑھنے کے بعد تقریباً وہ بھی اسی تجربے سے گزرتا ہے اور اس کے چہرے پر بھی ایک پر مسرت بہار رواں ہو جاتی ہے ڈرامہ لکھنے والا ڈرامہ اداکار صدا کار گلوکار اور ڈرامہ کا ناظر تینوں ایک عجب لذت انگیز کیفیت سے گزرتے ہیں جس سے اس تمام سرگرمی سے پہلے وہ نابلد تھے شعر کی تخلیق ابن آدم کا بڑا کارنامہ تھا۔ شعر رومانی ہو یا غیر رومانی وہ ترقی پسند ہو یا کسی بھی موضوع پر وہ بنیادی طور پر انسان کا اظہار ذات ہے۔ وہ فنون لطیفہ ہے اور شعر کہنے والا اور شعر پڑھنے والا اور شعر کو گانے والا تینوں سرگرمی سے بے پناہ حظ محسوس کرتے ہیں گویا کہ فن لذت آمیز عمل ہے اور فن کا انسانی زندگی کے ساتھ گہرا ربط و ضبط ہے۔ انسان زمانوں سے تاریخ کی بھول بھلئیوں سے گزرنے کے بعد آج اس مقام پہ آن کھڑا ہوا ہے کہ وہ فنون لطیفہ کی منتہا پر نظر آتا ہے۔ اکبر جیسا عظیم مغل فرمارواجب معاملات زندگی سے گھبرا جاتا تھا۔ معاملات سلطنت سے گھبر آجاتا تھاتب وہ انارکلی کو بلاتا دل ارام کو بلاتا اور وہ رقص کے ذریعے اس کے اس کے ذہن اور دل کو سکون عطا کرتی گھنگروں کا بجنا، رقصاں تھرکتے ہوئے بدن کیا فن کے انتہا پر نہیں ہوتے بلاشبہ رقص ایک کمال کا فن ہے اور فنون لطیفہ کے اندر یہ انتہائی نفیس اور لطیف فن ہے۔

فنی رجحان:

کسی فن پارے کا فنی جائزہ لیتے ہوئے یہ دیکھا جاتا ہے کہ جو افسانہ یا ناول ہمارے سامنے ہے، اس افسانے یا ناول کا فنی جائزہ کیسے لینا ہے؟ اس افسانے یا ناول کا عنوان کیا ہے۔ جب کوئی افسانہ نگار یا ناول نگار اپنے افسانے یا ناول کا عنوان مقرر کرتا ہے یا نام رکھتا ہے تو وہ دریا کو کوزے میں بند کر دیتا ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی فن پارے کا عنوان رکھنا بھی ایک مہارت کا کام ہے۔ وہ پوری کہانی کو اس عنوان میں بیان کر دیتا ہے جس کے باعث قارئین فوری طور پر اس عنوان کی طرف یا اس نام کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور ناول نگار نے جو عنوان یا نام منتخب کیا ہے یہ کتنا دلچسپ ہے۔ کیا یہ قارئین کی توجہ اپنی طرف راغب کرتا ہے۔ اس کے

بعد پلاٹ کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ پلاٹ بنیاد کی ترتیب ہے۔ یعنی جب بھی قاری کوئی افسانہ یا ناول پڑھتے ہیں تو اس میں بہت سے واقعات اور کردار ہوتے ہیں۔ ہر کردار کے ساتھ کئی واقعات جڑے ہوتے ہیں اور یہ ایک افسانہ نگار یا ناول نگار کی مہارت کا کام ہوتا ہے کہ وہ ان واقعات کو کس طریقے سے ترتیب دیتا ہے اور بیان کرتا ہے۔ اگر افسانہ نگار یا ناول نگار نے ان واقعات کو اچھے طریقے سے ترتیب دیا ہے۔ ان میں کوئی خامی نہیں ہے تو پھر یہ پلاٹ منظم ہے لیکن اگر ان واقعات کی ترتیب اچھی نہیں تو یہ غیر منظم پلاٹ ہے۔ پلاٹ کے بعد کسی فن پارے میں کرداروں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ کسی بھی افسانہ یا ناول میں جو لوگ ہوتے ہیں وہ اس صنف کے کردار ہوتے ہیں۔ کرداروں کی مختلف اقسام ہوتی ہیں۔ جیسا کہ مرد کردار، عورت کردار، بچے کردار، جاگیر دار کردار، پیشہ ور کردار اور غریب کردار وغیرہ۔ اسی طرح کئی قسم کے کردار ہوتے ہیں۔ ان میں بہت سے کردار ایسے ہوتے ہیں جو مثالی ہوتے ہیں اور بہت سے کردار ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو بالکل عام کردار ہوتے ہیں۔ ان کرداروں کا جائزہ لینے کے بعد یہ جاننے کی کوشش کی جاتی ہے کہ مصنف نے جو کردار کیے ہیں وہ کیسے کردار ہیں؟ وہ عام کردار ہیں، دلچسپ کردار ہیں یا پھر مثالی کردار ہیں۔

کردار نگاری کے بعد پھر مکالموں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ مکالمے، دراصل وہ کہاوتیں ہیں یا وہ جملے ہیں جو کردار آپس میں بات چیت کرتے ہیں۔ مکالموں کے بارے میں یہ دیکھا جاتا ہے۔ کیا یہ بہترین مکالمے ہیں یا بالکل عام مکالمے ہیں یا پھر کم تر مکالمے ہیں۔ یہ بھی یاد رکھیں کہ بعض اوقات کسی فن پارے کے مکالمے ضرب المثل کی حد تک مشہور ہو جاتے ہیں۔ بڑے بڑے ناول نگاروں، افسانہ نگاروں کے مکالمے اقوال زریں بن جاتے ہیں۔ فن پارے کی زبان کا جائزہ لینا بھی فنی جائزہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ زبان کو پرکھتے ہوئے یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ مصنف نے آسان زبان استعمال کی ہے یا پھر پیچیدہ زبان استعمال کی ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بعض لکھنے والے بازاری یا غیر مہذب زبان استعمال کرتے ہیں۔ کسی فن پارے کی فصاحت و بلاغت بھی فنی جائزے میں شمار ہوتی ہے۔ فصاحت و بلاغت کا مطلب یہ ہے کہ کلام میں نامعلوم اور اجنبی الفاظ تو استعمال نہیں کیے گئے اور زمان و مکان کا خیال رکھا گیا ہے۔ زمان و مکان کا مطلب یہ ہے کہ کسی بچے سے بڑوں کی باتیں نہ کروائی جائیں یا پھر کسی جاہل سے فلاسفر کی باتیں نہ کروائی گئی ہوں یا ناول میں اجنبی الفاظ تو استعمال نہیں کیے گئے ہیں۔ اگر زمان و مکان کا خیال نہیں رکھا گیا ہے تو اس میں فصاحت و بلاغت نہیں ہے۔

فنی جائزہ لیتے وقت الفاظ اور جملوں کو بھی دیکھا جاتا ہے کہ مصنف نے کس زبان کے الفاظ زیادہ استعمال کیے ہیں۔ کیا ناول میں دوسری زبانوں، مثال کے طور پر عربی، فارسی اور انگریزی وغیرہ کے الفاظ

موجود ہیں یا نہیں۔ یہ بھی فنی جائزہ میں شمار ہوتا ہے کہ مصنف نے چھوٹے چھوٹے جُملے استعمال کیے ہیں یا پھر بڑے بڑے جُملوں کا استعمال کیا ہے۔ اس میں یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ مصنف نے علم بیان کے اُصولوں کی خلاف ورزی تو نہیں کی ہے۔ کسی تحریر یا فن پارے کے فنی رجحانات کا جائزہ لینے کے لیے مذکورہ اُصولوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ تینوں ڈائجسٹوں میں شامل اہم افسانوں اور ناولوں (۲۰۱۷ء تا ۲۰۱۹ء) کا فنی جائزہ تسلسل کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے۔

افسانے

۱۔ مردہ گھر۔ نجم الحسن رضوی

نجم الحسن رضوی کا کیریئر ۷۰ کی دہائی سے شروع ہوا۔ معروف ناول نگار اور افسانہ نگار ہیں۔ جدید اُردو افسانے کے حوالے سے اہم کام کیا ہے۔ جبکہ انگریزی میں بھی خاصا کام موجود ہے۔ افسانوں کے چھ مجموعے، ایک ناول، ایک خود نوشت، کئی قومی اور بین الاقوامی اعزازات سے بھی نوازا گیا۔

"باغِ تمنا" اُن کا بچوں کے لیے پہلا ناول "مردہ گھر" نجم الحسن رضوی کا حالات حاضرہ کے حوالے سے ایک شاہکار افسانہ ہے جو ماہنامہ اردو ڈائجسٹ، جولائی ۲۰۱۷ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ اس افسانے میں ایسے لوگوں کا ذکر ہے جن لوگوں کو ناحق قتل کر دیا جاتا ہے یا دہشت گردی کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے تو ان کی روحوں کو بھی چین نصیب نہیں ہوتا۔ ان کی روحیں بھی اس بات کو محسوس کرتی ہیں کہ آخر ان کا کیا قصور کیا تھا کہ ان کو ناحق نشانہ بنایا گیا اور قتل کر دیا گیا اور انھیں ان کی زندگی سے محروم کر دیا گیا۔ ان کی لاشوں کو اس قدر مسخ کر کے مردہ خانے میں پہنچا دیا گیا کہ ان کی شناخت بھی ان کے پیاروں کے لیے مشکل ہو گئی۔ اب ان کی لاشوں کو لاوارث قرار دے دیا گیا ہے۔ ان لاشوں میں عورتوں، مردوں، فقیروں، امیروں غرض ہر طبقے کے لوگوں کی لاشیں شامل ہیں۔ اب یہ لاشیں آپس میں گفتگو کرتی ہیں کہ فلاں نے اس بندے کو قتل کیا تھا اور اس کو اتنی گولیاں لگی تھیں۔ فلاں بندہ اس طرح سے جھلس گیا تھا کہ بعد میں اس کے جسم پوری طرح شناخت بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ دہشت گردوں نے کیسے کیسے جوانوں کو کس طرح برباد کر دیا۔ دہشت گردی میں کئی دوسرے لوگوں کی لاشوں کے بھی پرخچے اُڑا دیے گئے۔ ان ہی مناظر کو بیان کرتے ہوئے مصنف ایک واقعے کی تصویر کشی یوں کرتا ہے:

"اسی وقت موٹر سائیکل اسٹارٹ ہوئی اور پیچھے بیٹھے آدمی نے اپنے تھیلے میں سے کوئی چیز نکالی اور لڑکے کی طرف پھینک دی۔ میں سمجھا شاید کوئی پھل ہے۔ مگر جب وہ پھل لڑکے کے پاس گرا تو زور کی چمک ہوئی اور دھماکے کے ساتھ بے شمار چھریاں ہر طرف اچھل پڑیں۔ میں نے لڑکے کے ٹکڑے ہوا میں بلند ہوتے دیکھے۔ یہ شاید آخری منظر تھا جو میں نے اپنی آنکھیں بند ہونے سے پہلے دیکھا"۔ کالیا فقیر نے کہا: "اب فقیر کے پیالے میں پیسوں کے بجائے دستی بم ڈالا جاتا ہے۔ سب فقیر ہو گئے ہیں، کسی کے پاس کچھ دینے کے لیے نہیں بچا"۔ (۱)

اس طرح کسی نہ کسی کو کوئی نہ کوئی پریشانی ضرور ہے جس کا ذکر ایک لاش دوسری لاش سے کرتی ہے۔ ان میں سے ایک فقیر کی لاش ہے جس کو ناحق کسی نے دہشت گردی کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ وہ سب لاشوں سے پوچھتا ہے کہ آخر اس کا کیا قصور تھا؟ اس کو کیوں قتل کیا گیا؟ وہ اپنی زندگی کی کہانی بیان کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ اس نے کوڑے کے ڈھیر سے ایک لڑکے کو لے کر پالا تھا اور وہ دونوں اپنی روزی روٹی کے لیے بھیک مانگ کر گزارا کرتے تھے۔ ایک دن دو موٹر سائیکل سوار وہاں آئے۔ ان کی موٹر سائیکل خراب ہو گئی تو ان سے لڑکے نے بھیک مانگی تب انھوں نے اسے بھیک دینے کی بجائے اس کے کشکول میں بم ڈال دیا۔ اس بم سے لڑکے کے جسم کے چیتھڑے اڑ گئے۔ جب شہر کا پولیس کانسٹیبل اور مردہ خانے کا انچارج لاشوں کو دیکھنے آتے ہیں تو ان میں سے کسی کو کوئی پہچان نہیں سکتا اور یہ آپس میں گفتگو کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ سب لاوارث لاشیں ہیں۔ ان کا کوئی بھی شہر میں والی وارث نہیں۔ اس وقت شہر میں اطلاع نامہ شائع ہوتا ہے اس کے بعد وہ مردہ خانے کا دروازہ بند کر کے چلے جاتے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد مردے دوبارہ آپس میں گفتگو شروع کرتے ہیں کہ ظالموں نے ہمیں کس طرح سے قتل کیا ہے کہ ہمارا نہ کوئی قصور تھا پھر بھی دہشت گردوں نے ہم پر کوئی ترس نہیں کیا اور ہمارا نام و نشان تک مٹا ڈالا۔ اس افسانے سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ کسی کو ناحق مارنا کتنی بڑی زیادتی ہے۔ ہمیں ایسی حرکت نہیں کرنی چاہیے کہ جس سے کسی کی جان چلی جائے اور اتنا بڑا نقصان ہو۔ یہ افسانہ فنی رجحان کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ایسے جرائم پیشہ مجرم انسانیت کے نام پر ایک دھبہ ہیں۔

بنیادی طور پر یہ افسانہ ۹/۱۱ دہشت گردی کے نتیجے کے بعد بننے والی صورتحال کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ اس افسانے میں موضوع کا تنوع ملتا ہے۔ پاکستان اور عالمی سطح پر دہشت گردی سے ہلاک ہونے والے

افراد کی صورتحال بیان کی گئی ہے۔ مردہ گھر میں مردے گفتگو کرتے ہیں کہ انہیں کیوں قتل کر دیا گیا اور ان کا کیا قصور تھا کیا ان کی زندگیاں قیمتی نہ تھیں؟

نیز دہشت گردوں نے اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔ اس افسانے کی انوکھی بات یہ ہے کہ اس میں غیر مرئی کردار تخلیق کیے گئے ہیں جو مکالماتی گفتگو کرتے ہیں۔ اس کہانی کے اندر مکالماتی اسلوب بھی اپنا جلوہ دکھاتا ہے۔ افسانے کا اسلوب رواں اور سلیس ہے۔ اس کا پلاٹ گھٹا ہوا ہے اور اس کا موضوع اپنے عہد کے موضوعات سے لگا کھاتا ہے۔ یہاں زیادہ کردار موجود ہیں تاہم مرکزی کردار کی بجائے تمام کردار اپنا اپنا کردار نبھانے کے بعد ایک تاثر چھوڑ جاتا ہے۔ اسی طریقے سے یہاں کردار زندگی کے مختلف شعبہ ہائے حیات سے تعلق رکھتے ہیں یہاں تک کہ بھکاری کردار بھی موجود ہے۔ المختصر یہ ایک بھرپور افسانہ ہے جو شروع سے آخر تک قاری کو اپنی گرفت میں لیے رکھتا ہے۔

۲۔ اُصول کی خاطر--مرزا ادیب

مرزا ادیب ۴ اپریل ۱۹۱۴ء کو لاہور میں پیدا ہوئے اور ۳۱ جولائی ۱۹۹۹ء کو وفات پا گئے۔ پاکستان کے نامور ڈراما نویس اور ناول نگار ہیں۔ شروعات میں انہوں نے رومانوی کہانیاں لکھنا شروع کیں لیکن جلد ہی انھوں نے عام زندگی اور معاشرتی زندگی کے مسائل کو اپنا موضوع بنایا۔

اُصول کی خاطر مرزا ادیب کا ایک طرح دار افسانہ ہے۔ یہ افسانہ ماہنامہ اردو ڈائجسٹ، اگست ۲۰۱۷ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ اس افسانے میں معاشرے میں پائے جانے والے لالچی افراد کا قصّہ بڑی خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ افسانے میں بتایا گیا ہے کہ جب ہم کسی مجبوری کی بنا پر اپنے کسی خونی رشتے دار کا سہارا لینے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ ہمارا اپنا ہونے کے باوجود ہماری مجبوری سے اس قدر فائدہ اُٹھاتا ہے کہ غیروں سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔ مذکورہ افسانے میں ایسی ہی ایک سبق آموز کہانی بیان کی گئی ہے۔ ایک نوجوان جو اپنے حقیقی چچا سے بھی لالچ کی خاطر اس کی مجبوری کا ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے اس کا مکان فروخت کرنے کے لیے مارکیٹ سے بھی زیادہ کمیشن وصول کرتا ہے۔ اس افسانے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ آج کل خونی رشتوں پر دولت کو ترجیح دی جاتی ہے اور دولت کی خاطر خونی رشتوں کو فراموش کر دیا جاتا ہے۔ ایک آدمی جس کا نام جلال ہے اپنی بیٹی کی شادی پر زیادہ خراجات ہونے کی وجہ سے قرض لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ قرض کی رقم ادا نہیں کر پاتا تو فیصلہ کرتا ہے کہ وہ اپنا بڑا مکان فروخت کر کے کوئی چھوٹا مکان خرید لے گا اور

اس میں سے جو رقم بچے گی وہ قرضہ ادا کر دے گا۔ وہ اس بارے میں اپنی بیگم سے مشورہ کرتا ہے اور دونوں مشورے سے اپنا بڑا مکان فروخت کرنا چاہتے ہیں اس سلسلے میں وہ اپنے بھتیجے، جو پراپرٹی ڈیلر کا کام کرتا ہے، مدد طلب کرتا ہے۔ اپنے چچا کی مدد کرنے کو تیار ہو جاتا ہے اور اپنے چچا کا بہت زیادہ احترام کرتا ہے۔ وہ ان کا مکان فروخت کر کے ان کو چھوٹا کم قیمت مکان لے کر دیتا ہے تو ان کے پاس جو رقم بچتی ہے، چچا اس کا حساب لگاتا ہے کہ اس سے وہ قرض ادا کرنے کے علاوہ کچھ سیر و تفریح بھی کر لیں گے۔ اسی اثنا ان کا بھتیجا شام کے وقت ان کے گھر آتا ہے اور وہ انھیں مکان لینے اور فروخت کرنے کے معاملات میں کمیشن کا مطالبہ کر دیتا ہے ۔ اس وقت ان کے سارے ارمان اور پروگرام دھرے رہ جاتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نوجوان ان خونی رشتوں کی وجہ سے ان کی مدد نہیں کر رہا تھا بلکہ وہ صرف اپنے کاروبار اور اپنی کمیشن کے چکر میں ان کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ جب اس کا کمیشن کا معاملہ حل ہو جاتا ہے تو وہ گفتگو کو سمیٹتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ رشتوں کو ترجیح دیتا ہے لیکن صرف اُصول کی خاطر کمیشن لے رہا ہے۔ اس افسانے میں معاشرے کی بے حسی اور دکھ کا اظہار پایا جاتا ہے کہ کوئی انسان کسی کے ساتھ مخلص نہیں ہے۔ صرف اپنے لالچ کی خاطر اپنے مخلص پن کا لبادہ اوڑھ کر دوسروں کو اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ جیسا کہ اس افسانے سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

> ”فرط مسرت سے وہ رات کا کھانا ہی نہ کھا سکے۔ نو بجے کے قریب ارشد آ گیا۔ دونوں میاں بیوی نے اُس کا دلی شکریہ ادا کیا۔ شکریے کی بالکل ضرورت نہیں۔ آخر رشتے دار کس کام آتے ہیں اور میرا تو آپ کے ساتھ خونی رشتہ ہے۔ ہاں ایک ذرا زحمت کیجیے۔ کہیے بیٹا دونوں بیک وقت بول اٹھے۔ وہ میرے کمیشن کے چودہ ہزار دے دیں سارے اخراجات بھی اس رقم میں شامل ہیں۔ جی دونوں نے بیک آواز کہا ”میرا کمیشن زیادہ نہیں ہے۔ یہ رقم اُصول کی خاطر لے رہا ہوں ہوں، جلال ہکا بکا رہ گیا۔ فرخندہ نے بریف کیس خاموشی سے ارشد کی طرف بڑھا دیا“۔ (۲)

فرخندہ اور جلال جب ارشد کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ اس نے ان کا مسئلہ حل کر دیا تو ارشد آہستگی سے کہتا ہے کہ ہمیشہ مشکل وقت میں اپنے ہی کام آتے ہیں لیکن ایک چھوٹا سا کام ہے کہ میں اپنوں سے کمیشن نہیں لیتا لیکن کاروباری اُصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے آپ سے کمیشن وصول کروں گا۔ اس افسانے میں جس طرح ایک پلاٹ بنا کر اس میں موجود کرداروں کے ذریعے مکالموں کی پیش کش کی

گئی ہے، اگر اس افسانے کا فنی جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ کس طرح اپنے ہی اپنوں کو جال میں پھنسا کر قابو کرتے ہیں کہ انھیں انکار کرنے کی مجال ہی باقی نہیں رہتی۔

ان کا یہ افسانہ "اُصول کی خاطر" معاشرتی زندگی پر مبنی ہے۔ اس افسانے میں انہوں نے سادہ زبان کا استعمال کیا ہے۔ سادہ زبان کے استعمال کی وجہ سے مرزا ادیب کو عوام میں کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کے اس افسانے کے کردار اپنی حیثیت کے مطابق بولتے دکھائی دیتے ہیں۔ مرزا ادیب کو "داستانی افسانے" کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ ان کا افسانہ پڑھ کر داستان اور افسانے کا تال میل نظر آتا ہے۔

۳۔ سہرا۔ خدیجہ مستور

سہرا خدیجہ مستور کا ایک اہم افسانہ ہے۔ یہ افسانہ ماہنامہ اردو ڈائجسٹ، ستمبر ۲۰۱۷ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ اس میں ایک ماں کی پریشانیوں بھری داستان بیان کی گئی ہے کہ وہ اپنی اولاد کے سکھ کی خاطر اپنے آپ کو ہر طرح کے مشکل امتحان میں ڈال دیتی ہے۔ جب اولاد جوان ہو کر والدین کی خدمت کرنے کے قابل ہوتی ہے تو وہ اپنے مستقبل کو بہتر کرنے اور سنوارنے کے لیے اپنا وطن چھوڑ کر بیرون ملک ملازمت اختیار کر لیتے ہیں۔ وہیں پر شادیاں کر لیتے ہیں اور ماں کی اپنی اولاد کے سر پر سہرا سجانے کی آرزو ماند پڑ جاتی ہے۔ ایک ماں کی دو نرینہ اولادیں ہیں جن میں ساجد اور ماجد شامل ہیں۔ ان کا والد بچپن میں وفات پا جاتا ہے تو ان کی ماں ساری زندگی پریشانیوں اور دکھوں کے ساتھ محلے کے بچوں کو قرآن پڑھا کر ان کی پڑھائی مکمل کرواتی ہے۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے بچے پڑھاپے میں اس کا سہارا بنیں گے اور وہ ان کے سر پر سہرا سجا کر خوشیوں بھری زندگی بسر کرے گی۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہوتی ہے۔ اس کا بڑا بیٹا ماجد بیرسٹری کا امتحان اچھے نمبروں میں پاس کر کے ملک سے باہر چلا جاتا ہے۔ اس کی ماں اس کی شادی کی تیاری کر رہی تھی وہ اپنی ہونے والی بہو کے لیے زیور وغیرہ تیار کرتی ہے مگر ایک دن اچانک پتہ چلتا ہے کہ ماجد نے بیرون ملک شادی کر لی ہے اور اس نے شادی کے وقت اپنی ماں کو بہت یاد کیا۔ اب ان کی ماں کی ساری اُمیدیں دم توڑ جاتی ہیں اور اس کی اُمید کا واحد سہارا اب ساجد رہ جاتا ہے جس کے سر پر وہ سہرا سجانا چاہتی ہے۔ ساجد جو کہ ڈاکٹری کا امتحان پاس کر کے ڈاکٹر بننا چاہتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی ماں کا بہت خیال رکھتا ہے اور اپنی ماں کی خدمت کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ اس کی شادی کے لیے اس کی ماں فکر مند ہو کر سوچتی رہتی ہے۔ لیکن ساجد شادی پر اس لیے رضامند نہیں ہوتا کہ اس کے دل میں ماں کی محبت میں کمی ہو جائے گی۔ آخر

کار ماں اس کو شادی کے لیے رضامند کر لیتی ہے۔ ساجد روز رات کو اپنی ماں کے پاس سوتا تھا کہ اس کی ماں شادی کی رات بھی اٹھ کے اس کو دیکھتی ہے کہ وہ اس کے پاس ہے بھی کہ نہیں۔ وہ اپنے بیٹے سے یوں گویا ہوتی ہے اور ساجد کو شادی کے دن رخصت کرتے ہوئے کہتی ہے:

> "بیٹے وہ لوگ جن کا حال ان کی دسترس سے باہر ہوتا ہے اور مستقبل میں ان کا کوئی حصہ نہ ہو، ان کے مقابلے میں وہ لوگ جن کا مستقبل ان کا انتظار کر رہا ہو، انھیں آخر ایک دن ایک دوسرے سے جدائی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ میرا کیا ہے؟ آج ہوں، کل نہیں ہوں گی"۔ (۳)

ساجد دوسرے کمرے میں سونے کی وجہ سے اپنی ماں کے لیے پریشان ہوتا کہ ان کے پاس کیسے آئے گا۔ اس لیے وہ اپنی بڑی بہن کو کہتا ہے کہ وہ اس کے بستر پر ماں کے پاس سو جائے لیکن وہ نہیں مانتی۔ اسی طرح وہ چھوٹی بہن کو کہتا ہے تو وہ بھی اس کی بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ پھر وہ اپنی ماں کے قریب پڑے ہوئے بیڈ کے اوپر ایک تکیہ رکھ کر اس پر کمبل ڈال دیتا ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ اس کے پاس ہی سویا ہوا ہے۔ اس کی ماں کو ساجد پر بھروسہ ہوا تھا ایک تکیہ پر کمبل کو دیکھ یہ سمجھ رہی ہوتی ہے کہ ساجد میرے پاس ہی سویا ہوا ہے۔ جب رات کو اُٹھ کر اس کی ماں اسے دیکھتی ہے تو وہاں پر ساجد کی بجائے ایک تکیہ کے اوپر کمبل پڑا ہوتا ہے۔ ساجد اپنی ماں کا اس قدر فرماں بردار تھا کہ اس نے اپنی ڈاکٹری کا امتحان پاس کر کے محلے میں ایک ڈسپنسری کھول لی تھی تاکہ اس کو اپنی ماں کی جدائی میں کہیں دور نہ جانا پڑے۔ لوگوں کو ساجد پر اس قدر اعتماد تھا وہ بڑے بڑے ڈاکٹروں کو چھوڑ کر ڈاکٹر ساجد کی چھوٹی سی ڈسپنسری میں دوائی لینے کے لیے آتے تھے۔ اس طرح ساجد نے لوگوں کی یوں خدمت کی کہ اللہ نے اس کے ہاتھ میں شفا بھی رکھی تھی۔ اگرچہ اس ماں کی محبت میں اپنا مستقبل داؤ پر لگا کر اپنی ماں کی دعائیں لیں۔ اس کو احساس نہیں ہونے دیا کہ اس طرح سے بھی کسی کی خدمت کا حق ادا کیا جا سکتا ہے۔

خدیجہ مستور کا فنی لحاظ سے اچھا افسانہ ہے۔ بنیادی طور پر اس کی کہانی سماج کی نمائندگی کرتی ہے اور یہ کہانی دیگر خواتین کی کہانیوں جیسی ہے۔ عام طور پر خواتین افسانہ نگاری میں معاشرے میں خواتین کے استحصال ان کی تمناؤں کی عصمت دری اور ماں کے خواب کا لٹنا وغیرہ شامل ہے۔ فنی لحاظ سے یہ ایک جامع اور اپنی گرفت میں بسنے والی کہانی ہے۔ پلاٹ کی بنت خدیجہ مستور کے دیگر افسانوں کی مانند بہتر ہوئی ہے۔ اس افسانے میں منظر نگاری اور اس کے تناظر میں جذبات نگاری سحر کی سی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔

منظر نگاری، جذبات نگاری اور کرداروں کے مکالمے ایک ایسی جذباتی فضا بنا دیتے ہیں کہ قاری کہانی میں کھو جاتا ہے۔ اگر اس افسانے کو کرداری افسانہ قرار دیا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ دیگر ثانوی کرداروں کے علاوہ بنیادی طور پر تین بنیادی کردار ہیں۔ ماں کا کردار مرکزی حیثیت کا حامل ہے جبکہ ماں کے بعد ساجد کا کردار ماجد کے کردار کی بنسبت زیادہ دیر تک اپنا تاثر قائم کرنے میں کامیاب رہتا ہے۔ ساجد کے بعد ماجد کا کردار بھی اپنی اہمیت کے لحاظ سے اہم کردار ہے۔ ماں کا کردار ایک ایسی مشرقی خاتون کا کردار ہے جو اپنے خاوند کی موت کے بعد اپنی تمام جوانی کے خوبصورت دن اپنی اولاد کو پروان چڑھانے اور ان کی تربیت کرنے میں گزار دیتی ہے۔ اور پھر وہ ماں جو اپنے تمام بچوں کو سنبھالتی ہے بچے اس طرح سے اس کا خیال رکھنے میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔

افسانے کا عنوان کہانی سے مناسبت رکھتا ہے۔ ماں کا سہرا اجڑ جاتا ہے وہ اپنے بیٹوں کا سہرا سجانا چاہتی ہے لیکن ماجد کے معاملے میں اسے اپنے خواب بے سود نظر آتے ہیں جبکہ ساجد بہت حد تک ماں کے خواب میں رنگ بھرنے کی کاوش کرتا ہے۔ اس افسانے کی زبان رواں اور سلیس ہے۔ یہاں ادق اور گنجلک بھاری بھر کم لفاظی سے اعتراض بتایا گیا ہے جس طرح ایک ہلکی پھلکی نیز جذباتی کہانی بنی گئی ہے۔ اسی طرح سلیس اور رواں اسلوب کام میں لایا گیا ہے۔ اس میں کرداروں کا انتخاب، انسانیت، ممتا کے جذبات، معاشرے اور ماحول کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ مختصراً یہ افسانہ خدیجہ مستور کے اسلوب، کردار نگاری، منظر نگاری، پلاٹ کی بنت، موضوع کے انتخاب کے حوالے سے اس کے دیگر افسانوں سے بہت حد تک لگا کھاتا ہے۔

۴۔ دوسرا راستہ – انتظار حسین

انتظار حسین (۱۹۲۵ء–۲۰۱۶ء) کی تحاریر میں ماضی کی یاد، پرانی اقدار، جذباتیت، پچھتاوے اور ماضی پر نوحہ خوانی ملتی ہے۔ انتظار حسین کا شمار ملک کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ بیک وقت افسانہ نگار، صحافی اور نقاد کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔ دوسرا راستہ، انتظار حسین کا شہرۂ آفاق افسانہ ہے جو اردو ڈائجسٹ، ستمبر ۲۰۱۷ء، کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ یہ افسانہ ملک کے سیاسی حالات پر مبنی ہے۔ ایک شخص ڈبل ڈیکر کی بس کی اوپری منزل پر بیٹھا بس کے باہر کے حالات کو ایک کیمرہ مین کی طرح پیش کرتا ہے۔ اس افسانے میں دو دوست ایک بس میں سفر کرتے ہیں اور ان کو لاہور ریلوے اسٹیشن تک جانا ہوتا ہے۔ بس

اپنا روٹ چھوڑ کر کسی دوسرے روٹ پر سفر کرنا شروع کرتی ہے تو بہت سے لوگ ہم آواز ہو کر پوچھتے ہیں کہ یہ بس اپنے روٹ سے ہٹ کر کیوں جا رہی ہے۔ بس کا ہر مسافر اس وجہ سے پریشان ہے اور جلد سے جلد یہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ اُسے پتہ چل جائے کہ اصل روٹ پر بس سفر کیوں نہیں کر رہی۔ چنانچہ پوچھنے پر پتہ چلتا ہے کہ بس کے اصل روٹ میں کوئی گڑبڑ ہے۔ اس راستے میں کوئی جلسے جلوس نکل رہے ہیں اور جو لوگ اس بس کے روٹ پر رہتے ہیں وہ پریشان ہو جاتے ہیں۔ بس کے اندر ایک بیگ والا شخص داخل ہو جاتا ہے جو وقتاً فوقتاً بس میں سوار لوگوں کو اسلامی طریقوں سے باخبر کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر جب بس اپنے مقررہ راستے پر روانہ نہیں ہوتی تو وہ بیٹھ جاتا ہے۔ جس کے بعد بس میں سوار دوسرے لوگ اپنے اپنے قصے کہانیاں سنانا شروع کر دیتے ہیں۔ بیگ والا آدمی لوگوں کو نصیحت کرتے ہوئے کہتا ہے:

> "حضرت عمر بن عبد العزیز کے بعد آج ہم کدھر جا رہے ہیں؟ یہ میرا سوال ہے مجھے جواب دو۔ ساٹھ پیسے کا کارڈ لے کر کیوں کہ زبانی بحث میں جھگڑے کا ڈر ہے اور فساد منع ہے از روئے اِسلام۔ چھنے ہوئے آٹے کی روٹی، بھوسی کی روٹی، نان جویں، حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کرتا اور فرمانا۔ اس جناب کا کہ کاش ایران اور عرب کے درمیان آگ کا پہاڑ حائل ہوتا اور ٹکڑے ٹکڑے کرنا، ایرانی قالین کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا کہ نثار ہوں ہماری تمھاری جانیں ان پر سے، اگر جانیں ہم میں تم میں باقی ہیں مگر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ داخل ہوئے دارالامارۃ میں تو روئے دیکھ کر دیبا و حریر کو کیوں؟ جواب دو مجھے ساٹھ پیسے کا کارڈ لکھ کر کہ زبانی بحث۔۔۔۔۔"۔ (۴)

اس کے بعد ہر ایک مسافر بس سے اُترتا ہے اور جلوس کے اندر چلا جاتا ہے۔ بس کنڈیکٹر وقتاً فوقتاً مسافروں کو مطلع کرتا ہے کہ وہ اپنا سر باہر نہ نکالیں کیونکہ اس طرح ان کے سر پر باہر سے کوئی پتھر بھی مار سکتا ہے۔ بس میں ایک دوست شیشے کی طرف بیٹھا ہے، اسے شوق ہوتا ہے وہ بس کے اندر کے ماحول کی بجائے باہر کے مناظر کا بھی نظارہ کرے۔ اس لیے اس نے کھڑکی کی طرف بیٹھنا پسند کیا تھا۔ جبکہ وہ اپنے دوسرے دوست کو بھی بلا تکلف ہی بس میں کہہ سکتا تھا کہ وہ کھڑکی کی طرف بیٹھ جائے لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔ اب تو حالات کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ جہاں جہاں سے بس گزرتی وہ راستے میں دیکھتے ہیں کہ ایک بس جو سامنے سے آ رہی ہے اس کے شیشے ٹوٹے پڑے ہیں جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ راستے میں کسی جلسے جلوس

میں شامل عوام نے اس کے شیشے پر پتھر مار کر توڑ دیے ہیں۔ اب بس کے مسافروں کی پریشانی اور بڑھ جاتی ہے اور پریشان ہو کر ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ آگے جا کر کیا ہو گا؟ بس کے تمام راستے ویران نظر آتے ہیں کیونکہ بس اپنے مقررہ روڈ پر چل ہی نہیں رہی ہوتی۔ اس طرح دونوں دوستوں کو تشویش ہوتی ہے کہ یہ شام تک خیر خیریت سے اپنے اختتام پر پہنچ بھی پائے گی کہ نہیں؟ اس طرح ان سارا سفر پریشانی اور فکر مندی میں گزرتا ہے۔

انتظار حسین اپنی علامتی اور استعاراتی زبان اور قدیم رنگ اسلوب و لفاظی کے لحاظ سے اردو زبان و ادب و فکشن کی روایت میں خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ انتظار حسین کا قاری ہمیشہ اسے روایت پسندی کے تناظر میں دیکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انتظار حسین کے اسلوب اور موضوعات کی پرکھ، جانچ اور قرآت عام قاری کے بس کی بات نہیں۔ انتظار حسین کے اسلوب اور موضوعات میں نوسٹالجیا پایا جاتا ہے۔ خاص طور پر تخلیق پاکستان، ہجرت تقسیم، تقسیم سے پہلے کے سماجی رویے، ہجرت سے قبل، ہجرت نصیبوں کے تغیرات و تصورات اور پھر ان تصورات پہ شب و خون مارا جانا جیسے موضوعات انتظار حسین کے خاص موضوعات ہیں۔ ناصر کاظمی کا یہ شعر انتظار حسین کے موضوعات کے حوالے سے بہت حد تک ترجمانی کرتا ہے۔

؎ "جنگل میں ہوئی ہے شام ہم کو
بستی سے چلے تھے منہ اندھیرے

؎ دھیان کے آتش دان میں ناصرؔ
بجھے دنوں کا ڈھیر پڑا ہے"(۵)

دوسرا راستہ انتظار حسین کا علامتی افسانہ ہے جس میں بس پاکستان کی علامت ہے جبکہ دو مسافر مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی علامت بنتے ہیں۔ مصنف تقسیم کے بعد پاکستان کی صورتحال کے تناظر میں اس کہانی کے پلاٹ کو بنتا ہے۔ پاکستان قائد اعظم کی بے وقت موت اور لیاقت علی خان کی بے وقت شہادت کے بعد سے اس پٹری سے اتر گیا جو منزل مقصود تک پہنچانے والی تھی۔ پاکستان جس طرح سے سیاسی و عسکری نیز بیوروکریسی کی جنگل میں پھنس گیا وہ ایک دردناک داستان ہے۔ دوران سفر بس میں در آنے والا تبلیغی دراصل پاکستان کی وہ اسلامی جماعتیں ہیں جو تضاد کا شکار ہیں۔ اور جو پاکستان کو درست سخت

میں دیکھنے کی متمنی ہیں لیکن ان کے پاس بھی ملک کو بہترین بنانے کا منصوبہ نہیں ہے۔ اسی طرح چلتی بس کے سامنے جلوس کا آنا بس پر پتھر برسانا دراصل بس مخالف یعنی پاکستان مخالف قوتیں ہیں۔

انتظار حسین جس طرح اپنے افسانوں اور ناول میں علامت اور استعارہ کا استعمال کرتے ہیں اسی طرح اس افسانے میں بھی علامت اور استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔ نیز ہجرت کے بعد پاکستان کی صورتحال کو بہت بہترین طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ افسانے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جب ہم ذہنی طور پر فارغ ہوتے ہیں تو ہمیں فکر مندی لاحق ہوتی ہے اور ہمارے ذہن میں طرح طرح کے سوالات جنم لینا شروع ہو جاتے ہیں جس سے ہمارا تجسس بڑھتا جاتا ہے۔ یہ افسانہ فنی لحاظ سے اس طرح اہم ہے کہ اس میں ہمارے معاشرے کی مجموعی ذہنی سوچ کی بھرپور عکاسی اور تصویر کشی کی گئی ہے۔

۵۔ پردے کے پیچھے کی عورت۔شکیلہ رفیق

شکیلہ رفیق نے معاشرے کی عورت کے رشتے اور دیے ہوئے ناسوروں کا اپنی سوچ اور جاگتی آنکھوں سے دیکھ کر لکھا ہے۔ انہوں نے شاعری بھی کی اور یہی وجہ ہے کہ مشرقی عورتوں کے دکھ اور اُن کی آزمائشوں کو بھی رقم کیا ہے۔ اُن کا پہلا افسانہ "درد کا ملاپ" رسالہ "نیا دور" یہیں سے ان کو مقبولیت ملی۔ پردے کے پیچھے کی عورت شکیلہ رفیق کا موجودہ حالات کے تناظر میں لکھا گیا ایک ایسا افسانہ ہے جو ملک میں ہونے والے الیکشن کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ یہ افسانہ ماہنامہ اردو ڈائجسٹ، مارچ ۲۰۱۸ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ الیکشن کے دنوں میں بازار میں کھڑے ہو کر لوگ کچھ ایسی تقریریں کرتے ہیں کہ ان پر سچ کا گمان گزرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں جب عوام کا ووٹ دینے کا وقت آتا ہے تو وہ ایسے اُمیدواروں سے خوب نمٹتے ہیں۔ ایک اُمیدوا کو ووٹ کا لالچ دے کر ووٹ کسی اور اُمیدوار کو دے دیتے ہیں۔ اسی طرح اس افسانے میں ایک ایسے ہی میاں بیوی کی کہانی بیان کرتے ہوئے بتایا گیا ہے۔ اس میں میاں اپنی بیوی کو بار بار ہدایت کرتا ہے کہ وہ جمہوریت کی بقا کے لیے متعلقہ اُمیدوار نے انتخابی نشان جہاز پر مہر لگائیں۔ کیوں کہ ہوائی جہاز پر مہر لگانا سے ہی ان کی نجات ہے۔ اس پارٹی کے برسر اقتدار آنے کے بعد بہت سے کام کرنے ہوں گے۔ اس کی بیگم اسے ہر طرح کی تسلی دیتی ہے کہ وہ اس بار جہاز پر ہی مہر لگائے گی۔ وہ بار بار تاکید کرتا ہے کہ اگر تم نے کسی اور نشان پر مہر لگا دی تو سخت گڑبڑ ہو گی۔ تمام نشانات کو دیکھنا جہاں جہاز کا نشان نظر آئے وہاں مہر لگانا، وہ کب سے اس کو نصیحت کر رہا تھا۔ وہ اس طرح کا سوٹ پہنے اور اس طرح کی ساڑھی پہنے اور اس طرح سے اپنے کپڑے رکھے،

اس طرح سے تیار ہو کر الیکشن آفس جائے، جب مہر لگانے کا وقت آئے تو صرف جہاز پر ہی مہر لگانا ہے۔ وہ اپنی بیوی کو یوں تاکید کرتا ہے:

> ”مقررہ دن آن پہنچا تھا۔ وہ صبح سے ہی وہی الفاظ دہراتے ہوئے ریکارڈ کی مانند دہرائے جارہا تھا: دیکھو۔ ہوائی جہاز پر نشان لگانا ہے! کسی اور انتخابی نشان کی جانب دیکھنا بھی مت! ہوائی جہاز کو منتخب کرنے میں ہی ہماری عافیت ہے اور ہاں! موٹر سائیکل تمہاری دشمن ہے. خبر دار! جو تم نے اس کے یا کسی دوسرے انتخابی نشان کے بارے میں سوچا بھی تو..... تم میری باتیں غور سے سن رہی ہو؟ جی ہاں مجھے اس پارٹی کو ووٹ دینا ہے جس کا انتخابی نشان ہوائی جہاز ہے۔ اس نے سبق کی مانند دہرا دیا۔ شوہر نے خوش ہو کر بیگم کو دیکھا اور کہا: شاباش! تم بہت اچھی بیوی ہو..... مجھے تم پر فخر ہے، پھر جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا تم بھی مجھ پر فخر کرتی ہو نا،،۔ (۶)

جہاز جس امیدوار کا نشان تھا وہ ان کا دوست تھا اور اگر وہ اس کے علاوہ کسی دوسرے کے نشان پر مہر لگاتی تو وہ کسی دشمن کی جیت کا سبب بنے گی۔ جس سے ملک میں بگاڑ پیدا ہو جائے گا اور پھر اس طرح سے ملک ترقی نہیں کر سکے گا۔ اس کی بیگم ہر دفعہ جب بھی وہ تاکید کر رہا تھا، اس کی ہاں میں ہاں ملائے جارہی تھی۔ آخر کار جب الیکشن میں ووٹ ڈالنے کا وقت آیا تو اس نے تمام نشانات کا بغور جائزہ لیا۔ جہاز کا نشان سب سے اوپر تھا تو اس نے تمام نشانات کا جائزہ لینے کے بعد اپنے دل میں آخری فیصلہ کیا کہ وہ جہاز کی بجائے موٹر سائیکل پر مہر لگائے گی۔ اس طرح ایک عرصہ سے کی گئی اس کے میاں کی تاکید کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا اور اس نے وہ کام کیا جو اس کا دل چاہتا تھا۔

شکیلہ رفیق کا یہ افسانہ بھی فنی لحاظ سے بہتر ہے۔ اس کا پلاٹ گھٹا ہوا نظر آتا ہے جہاں تک منظر نگاری کی بات ہے تو افسانہ نگار نے الیکشن کا دن، جلسے جلوس وغیرہ کی منظر کشی بہت محنت سے بیان کی ہے۔ اسی طرح اس افسانے میں بنیادی طور پر دو کردار شروع سے آخر تک چھائے رہتے ہیں۔ میاں اور بیوی اور ان کرداروں کی تخلیق میں شکیلہ رفیق نے بہت محنت کی ہے۔ اگر اس افسانے کو کرداری افسانہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ اس افسانے کے اندر ایک کش مکش نظر آتی ہے اور یہ کشمکش یا تجسس کی فضا افسانے

میں شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے۔ جب پردہ گرتا ہے تو گویا کہ اس کشمکش کا انجام ہو جاتا ہے۔ اس افسانے میں ایک پیچیدہ ذہنی صورتحال یا نفسیاتی مسئلہ بھی زیر بحث ہے۔ اگر کسی شخص کو ایک ہی بات بار بار یاد کرائی جائے اور اس پر زور دیا جائے تو بالآخر وہ شخص اس بات سے اکتا جاتا ہے۔ شوہر ایک ہی پارٹی کو ووٹ دینے کی تاکید کرتا ہے لیکن بیگم اپنی ہی پسند کی پارٹی یا بالفاظ دیگر شوہر کی تاکید کی ضد میں موٹر سائیکل کے نشان پر مہر لگا دیتا ہے۔ یہ کردار جامع ہے۔ افسانہ زمان و مکان کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ اس افسانے میں جذبات نگاری، نفسیاتی صورتحال، انسانی شخصیت کی پیچیدگیاں بیان کی گئی ہیں۔

اس افسانہ سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کو دوسرا چاہے کتنی بھی تاکید کرے مگر وہ وہی کام کرتا ہے جو اس کے دل کو پسند ہوتا ہے یا اس کے دل کی آواز ہوتی ہے۔ افسانے میں جہاں معاشرتی اتار چڑھاؤ کی خوبصورتی سے عکاسی کی گئی ہے وہاں فنی تناظر میں اگر جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت اور سچ سامنے آتا ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور اِسے مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ اُس کی مرضی کے مطابق کام کیا جائے۔ دوسروں کی اس حوالے سے صرف خواہش تو ہو سکتی ہے لیکن وہ اس کا غلام نہیں بن سکتا۔

۶۔ اکتالیس منزل۔ رضیہ بٹ

یہ امریکہ کی بلند و بالا عمارت میں جب دو پاکستانی دوست پھنس گئے تو اُن کی پریشانی کی کہانی کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ افسانہ رضیہ بٹ نے لکھا ہے اور ماہنامہ اردو ڈائجسٹ، اپریل ۲۰۱۸ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ اس میں ان حالات و واقعات کو تحریر کیا گیا ہے جو انسان کی سہولت کے ساتھ اس کے لیے مشکل کا باعث بھی بنتے ہیں۔ افسانے میں بتایا گیا ہے کہ امریکہ میں طالب علموں کو بھی اپنی ضروریات زندگی پوری کرنے کے لیے پارٹ ٹائم کسی نہ کسی شعبہ میں نوکری یا کام کرنا پڑتا ہے تاکہ اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ روزمرہ زندگی کے بھی اخراجات پورے کر سکیں۔ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ امریکہ کے علاقے میں زمین پر گھر بہت کم بنائے جاتے ہیں۔ وہاں پر بلند و بالا عمارتیں تعمیر کی جاتی ہیں اور ان عمارتوں میں رہائش کے لیے چھوٹے چھوٹے فلیٹ تعمیر کیے جاتے ہیں۔ پھر ان فلیٹس تک پہنچنے کے لیے سیڑھیوں کے ساتھ لفٹ کی سہولت دستیاب ہوتی ہے مگر اگر خدانخواستہ کبھی لفٹ خراب ہو جائے تو وہاں کے مکینوں کو کس قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کا اندازہ شاید ہمارے ہاں رہنے والے انسان کے لیے کرنا مشکل ہو گا۔ کہانی

میں لفٹ کی خرابی کے بعد اس عمارت کی اکتالیسویں منزل پر جو دو دوست رہائش پذیر ہیں مصنفہ نے ان کے درمیان ہونے والے مکالموں کی عکاسی کچھ اس انداز سے کی ہے:

"مگر اب ان کی رفتار سست پڑ رہی تھی۔ ٹانگیں شیل ہو رہی تھیں۔ لطیفوں کا بھی لطف نہیں آرہا تھا۔ جو چوبیسویں منزل پر پہنچ کر دونوں ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر رک کر دم لینا چاہیے۔ انجم بولا ستانا ضروری ہے۔ ہاں کچھ آرام کر لیں تو باقی منزلیں آسانی سے چڑھ لیں گئے۔ دونوں دس پندرہ منٹ وہیں بیٹھے رہے۔ ان کے قریب سے کبھی کبھی کوئی ہانپتے پانپتے خراب لفٹ ہی کی باتیں کرتا گزر رہا تھا۔ انہیں اس انداز میں بیٹھے دیکھ کر ایک امریکی نے انہیں مسکرا کر ہیلو بھی کہا،،۔ (۷)

جب ان دو دوستوں کو ۴۱ویں منزل پر رہائش ملتی ہے تو ایک دن اتفاقاً وہاں پہنچ کر پتا چلتا ہے کہ لفٹ خراب ہو گئی ہے لہٰذا سیڑھیوں کے ذریعے انھیں اپنے فلیٹ تک جانا ہو گا۔ دونوں دوست پریشان ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہ ہمت کر کے ایک دوسرے کو دلاسہ دیتے ہیں کہ ہم راستے میں ایک دوسرے کو لطیفے سناتے، گپیں لگاتے جائیں گے تو سیڑھیوں کا راستہ جلد ختم ہو جائے گا پھر ہم اپنی منزل یعنی ۴۱ویں منزل تک جلد ہی پہنچ جائیں گے۔ وہ ارادہ باندھ کر اپنا سفر شروع کرتے ہیں۔ آخر کار وہ اپنی اکتالیسویں منزل تک پہنچ جاتے ہیں مگر جب وہاں جا کر ایک دوسرے کو کہتے ہیں کہ فلیٹ کا دروازہ کھولیں تا کہ تھوڑا آرام کر کے تھکاوٹ دور کر لی جائے۔ ان کی بے بسی اس وقت انتہا کو پہنچ جاتی ہے، جب ان کو یاد آتا ہے کہ فلیٹ کی چابی تو نیچے گاڑی میں رہ گئی ہے۔ اب ۴۱ویں منزل سے دوبارہ نیچے جانا اور پھر نیچے سے اوپر آنا یہی سوچ کر خوف سے ان کے رونگٹھے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ پریشان ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور سوچنا شروع کر دیتے ہیں۔

اس افسانے کی خاص بات یہ ہے کہ یہ جدید دور کی ترقیات کے منفی پہلو اجاگر کرتا ہے۔ زیادہ تر تخلیق کار یا اہل دانش جدید دور کی سہولتوں، ترقیات کے متنوع رنگوں کو مثبت تناظر میں بیان کرتا ہے۔ لیکن رضیہ بٹ نے جدید ترقیات کے اس پہلو پر مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے روشنی ڈالی ہے۔ زمان و مکان کے اعتبار سے افسانہ نگار نے امریکہ (جدید ترقیات کا سرخیل) کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ افسانے کے اندر دو کردار ہیں جو امریکہ میں ایک فلیٹ میں رہائش پذیر ہیں اور یہ اکتالیسواں فلیٹ ہے۔ دونوں دوست لفٹ کے ذریعے باقی لوگوں کی مانند اپنے فلیٹ میں آتے جاتے ہیں۔ ایک دن لفٹ کی خرابی

کے باعث انہیں چل کر اکتالیسویں فلیٹ پر جانا پڑا۔ جب وہ فلیٹ کے سامنے پہنچے تو بے حال ہو چکے تھے اور انہیں یاد آیا کہ فلیٹ کی چابی وہ گاڑی میں چھوڑ آئے ہیں۔ لفٹ خراب تھی۔ مصنفہ ان دو کرداروں کی مدد سے یہ دکھاتی ہے کہ انسان جدید زمانے میں جہاں سہولتوں کا عادی بن گیا ہے وہیں فلیٹس کی رہائش کس قدر منفی بھی ہو سکتی ہے۔ اس افسانے کا موضوع اچھوتا اور منفرد ہے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ کہانی اکیسویں صدی کی کہانی ہے اگر کرداروں کے حوالے سے بات کی جائے تو ظاہراً تو دو دوستوں کا کردار نظر آتا ہے لیکن حقیقتاً لفٹ بھی باقاعدہ طور پر ایک کردار کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ گویا لفٹ وہ تیسرا کردار ہے جو دو دوستوں کے درمیان ہم نوالہ و ہم پیالہ ہے۔ اس دوست کی جدائی میں یا بیماری میں باقی دو دوست بے حال ہو جاتے ہیں۔ رضیہ بٹ کے ہاں گہری فلسفیانہ اور نفسیاتی گتھیاں سلجھانے کی فکر کم ہی ملتی ہے جبکہ اسلوب سلیس اور رواں رہتا ہے۔ یہ افسانہ موضوع کے اعتبار سے جدید فکر سے ہم آہنگ ہے لیکن یہاں کوئی فلسفہ یا نفسیاتی گھتیاں سلجھانہ مقصود نہیں ہے۔ رضیہ بٹ کے دیگر افسانوں اور ناولوں کی طرح اسلوب سادہ اور رواں ہے۔ یہاں تراکیب اور مشکل الفاظ نہیں ملتے۔ عام قاری اس افسانے سے خط کشید کر سکتا ہے۔

۷۔ آنندی-غلام عباس

غلام عباس ۱۷ نومبر ۱۹۰۹ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے متعدد افسانے اور ناول لکھے۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں آنندی، اُجاڑے کی چاندنی، کن رس، دھنک اور گوندنی والا تکیہ شامل ہیں۔ غلام عباس کو ان کی کتاب "جاڑے کی چاندنی" پر آدم جی ادبی انعام ملا۔ ۲ نومبر ۱۹۸۷ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔ آنندی غلام عباس کے شاہکار افسانوں میں سے ایک نمائندہ افسانہ ہے۔ اس افسانے کا اسلوب سادہ اور بیانیہ ہے جس کی بنت مضبوط سے تحریر میں روانی اور سادگی سے انجام تک پہنچتے پہنچتے قاری بھی دکھ بھری سانس لے کر رہ جاتا ہے۔ اس افسانے کا پلاٹ بہت جاندار ہے۔ یہ افسانہ طوائفوں کے گرد گھومتا ہے۔

آنندی، غلام عباس کا ایک کلاسیکل اور شاہکار افسانہ ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ غلام عباس کی وجہ شہرت آنندی افسانہ ہی ہے۔ آنندی کی کہانی ایک فطری اور سبق آموز ہے جو ہمیں سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ بعض چیزیں فطری طور پر نمو پذیر ہوتی ہیں۔ انسان اگر ان کو کنٹرول کرنے کی جتنی بھی کوشش کرے کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہ افسانہ ماہنامہ اردو ڈائجسٹ، جولائی ۲۰۱۸ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ آنندی میں

بتایا گیا ہے کہ شہر سے اگر پیشہ ور لوگوں کا خاتمہ بھی کر دیا جائے اور انھیں شہر سے نکال کر کہیں دور دراز بستی میں لا بسا دیا جائے تو بھی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا کیونکہ کچھ وقت گزر جانے کے بعد وہ آبادی بھی شہر کا حصّہ بن جائے گی اور وہ سارے مسائل جو ہمیں آبادی کے دباؤ کی وجہ سے درپیش تھے، ویسے کے ویسے ہی برقرار رہیں گے۔ ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ لوگ آبادی کے دباؤ کی وجہ سے اس بات پر مجبور ہو جائیں گے کہ اس سے بھی آگے کوئی نیا شہر بسا کر ان لوگوں کو اس میں بسایا جائے۔

افسانے کی کہانی یوں شروع ہوتی ہے کہ میونسپل کمیٹی کا اجلاس جاری ہے۔ کمیٹی کے ممبران میں ہر مکتبہ فکر کے لوگ شامل ہیں جس میں فیصلہ کیا جا رہا ہے کہ جرائم پیشہ لوگوں اور بازار حسن کی آبادی کو شہر سے باہر منتقل کیا جائے کیونکہ ان کی وجہ سے لوگوں کو بہت دشواریاں ہیں۔ سب کی مائیں بہنیں ہیں جنھیں اس طرح کی آبادی میں رہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ قوم کا کردار بھی خراب ہو رہا ہے۔ چنانچہ اجلاس میں فیصلہ کیا جاتا ہے کہ ان کو شہر سے چھ میل کے فاصلے پر ایک بستی بنا کر اس میں بسا دیا جائے تاکہ شہر سے ایسے لوگوں کا خاتمہ ہونے کے بعد ماحول صاف ہو جائے گا۔ اس منصوبے پر عمل کیا جاتا ہے جس کے بعد کچھ لوگ تو نئی بستی میں جانے کے لیے رضامند ہو جاتے ہیں لیکن کچھ لوگ اس سے بغاوت کرتے ہیں۔ شہر کے چھوٹے موٹے لوگ پہلے وہاں اپنی رہائش اختیار کر لیتے ہیں۔ ان مکانوں کی اتنی جلدی تعمیر ہونے کے سلسلے میں غلام عباس لکھتے ہیں کہ:

> "ان بیسواؤں کے مکانوں کی تعمیر کی نگرانی ان کے رشتہ دار یا کارندے تو کرتے ہی تھے، کسی کسی دن وہ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر اپنے عشاق کے ہمراہ خود بھی اپنے اپنے مکانوں کو بنتا دیکھنے آ جاتیں اور غروب آفتاب سے پہلے یہاں سے نہ جاتیں۔ اس موقع پر فقیروں اور فقیرنیوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں نہ جانے کہاں سے آ جاتیں اور جب تک خیرات نہ لے لیتیں اپنی صداؤں سے برابر شور مچاتی رہتیں اور بات نہ کرنے دیتیں۔ کبھی کبھی شہر کے لفنگے، اوباش و بیکار معاش کچھ کیا، کے مصداق شہر سے پیدل چل کر بیسواؤں کی اس نئی بستی کی سن گن لینے آ جاتے اور اگر اس دن بیسوائیں بھی آئی ہوتیں تو ان کی عید ہو جاتی۔ وہ ان سے دور ہٹ کر ان کے گرداگرد چکر لگاتے رہتے۔ فقرے کستے، بے تکے قہقہے لگاتے۔ عجیب عجیب شکلیں بناتے اور مجنونانہ حرکتیں کرتے۔ اس روز کبابی کی خوب بکری ہوتی"۔ (۸)

جب بستی پوری طرح آباد ہو جاتی ہے تو اس میں بھی وہی مسائل در پیش ہوتے ہیں جو اس سے پہلی والی بستی کے لوگوں کے تھے ۔

غلام عباس کے اس افسانے میں موضوع اگر چہ طوائف کا ہے لیکن اسے متنوع انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا اس کے سحر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ منظر نگاری اس افسانے میں کمال کی ہے۔ طوائفوں کا شہر میں جمگھٹا اور پھر شہر والوں کا انہیں نکال باہر کرنا اور شہر سے باہر ایک بار پھر دھیرے دھیرے ایک اور شہر آباد ہو جانا اس تمام عمل میں منظر نگاری اپنے عروج پر ملتی ہے۔ اردو اور دیگر ادبیات عالم میں اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن جس پس منظر میں یہ افسانہ قلم بند کیا گیا ہے وہ انوکھا اور منفرد ہے جس وجہ سے یہ عالمی ادب کا شاہکار بن گیا ہے۔ اس افسانے میں کرداروں کی بھرمار ہے لیکن کوئی مرکزی کردار موجود نہیں ہے۔ کردار آتے ہیں تھوڑی دیر کے لیے سٹیج پر موجود رہتے ہیں اپنا کردار نبھاتے ہیں اور پھر نئے کرداروں کے لیے جگہ خالی چھوڑ دیتے ہیں۔ مرکزی کردار نہ ہونے کے باوجود کرداروں کی بھرمار ہونے کے باوجود یہ افسانہ اپنی رنگارنگی، موضوع اور پلاٹ کے اعتبار سے شاہکار ہے۔

اگر اس افسانے کے پلاٹ کی بات کی جائے تو اس کی بنت اتنی اعلیٰ اور ریاضیاتی انداز میں ہوئی کہ اگر کوئی کردار، منظر، واقعہ کہانی سے نکال کر دیا جائے تو کہانی میں جھول پیدا ہو جائے گا۔ یہاں ایسا لگتا ہے کہ پلاٹ کی ابتدا، منتہا اور انجام کو ریاضی کے اصولوں کے تحت باقاعدہ حساب کتاب کے بعد تخلیق کیا گیا ہے۔ پلاٹ کی وجہ سے بھی یہ اردو ادب کا بہترین افسانہ قرار پاتا ہے۔

اس افسانے میں غلام عباس نے انسانی نفسیات کی گتھیوں کو سمجھنے اور سمجھانے کی کاوش کی ہے۔ انسان میں نیکی اور بدی ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ انسان بیک وقت فرشتہ ہے اور نہ شیطان۔ اس افسانے میں جہاں مذہبی اور پارسا نظر آنے والے طبقے کا منفی پہلو دکھایا گیا ہے وہیں معاشرے کے راندہ ایک طبقے کے مثبت پہلو کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ ایک اور بات بھی قابل غور ہے کہ انسان کے لیے معیشت اور معاش کس قدر اہمیت کی حامل ہیں کہ انسان نیکی اور بدی کو فراموش کر دیتا ہے۔ اسی لیے مذہب بھی ایک مقام پر جا کر ان چیزوں کو حلال قرار دیتا ہے جو عام حالات میں ناجائز ہیں۔

۸۔ مینوں لے چلّے بابلا-خدیجہ مستور

خدیجہ مستور نے افسانہ نگاری کا آغاز ۱۹۳۸ء میں کیا۔ اس زمانے میں ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی۔ ان کے ابتدائی افسانوں میں معاشرتی حقائق کو بیان کیا گیا ہے۔ ان کے افسانوں میں آزادی کی تڑپ، جنسی گھٹن، افلاس اور محرومی جیسے موضوعات ملتے ہیں۔ ان کا افسانہ "مینوں لے چلّے بابلا" خدیجہ مستور کا نمائندہ افسانہ ہے۔

یوم آزادی کے حوالے سے لکھا گیا ایک خوبصورت افسانہ "مینوں لے چلے بابلا" میں اغوا ہونے والی کم سن لڑکی کی دل سوز کہانی بیان کی گئی ہے۔ یہ افسانہ ماہنامہ اردو ڈائجسٹ، اگست ۲۰۱۸ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ معاشرے کی طرف اس کی پھیلی ہوئی باہوں نے سب کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس میں ایک شخص کا واقعہ بیان کیا گیا ہے جو کہ ڈرائیور ہے اور وہ پولیس کی گاڑی چلاتا ہے جب وہ سارا دن ڈیوٹی کر کے شام کے وقت گھر جا رہا ہوتا ہے تو راستے میں اس نے دیکھا کہ ایک تین منزلہ مکان کو باہر سے تالا لگا ہوا اور اندر سے کسی کے ہاتھ دھونے اور نہانے کی وجہ سے صابن ملا پانی باہر آ رہا ہے جس پر لوگوں کو شک ہو جاتا ہے کہ اس مکان کے اندر کوئی رہائش پذیر ہے۔ سارے لوگ باہر اکٹھے ہو جاتے ہیں اور شور مچانا شروع کر دیتے ہیں۔ سب مل کر ایک دوسرے سے کہتے ہیں اس کا تالا توڑا جائے تاکہ دیکھا جائے کہ اس مکان کے اندر کون لوگ رہتے ہیں۔ آپس میں صلاح مشورہ کرنے لگتے ہیں تو ان میں سے ایک آدمی آگے بڑھ کر اس مکان کا تالا توڑ دیتا ہے۔ یونہی وہ تالا توڑتا ہے تو بہت سے لوگ اس مکان کے اندر داخل ہو جاتے ہیں اور مکان کی تلاشی لینا شروع کر دیتے ہیں۔ سب سے پہلے وہ مکان کی پہلی منزل میں جاتے ہیں۔ وہاں ہر کونے کھدرے کی تلاشی لیتے ہیں مگر وہاں کوئی نہیں ہوتا۔ اس طرح دوسری منزل پر چڑھ جاتے ہیں اور تمام کونوں کھدروں اور کمروں میں جا کر دیکھتے ہیں لیکن وہ کوئی بھی وہاں موجود نہیں ہوتا۔ وہ باری باری پورے مکان کا جائزہ لیتے ہیں۔ پوری کوشش سے ان کی تلاش کا عمل کچھ اس طرح سے جاری رہتا ہے:

> پہلی منزل..... دوسری..... تیسری.....پر منزل کے ایک کونے کو چھان مارا۔ ہر کمرے میں سب سے پہلے وہ داخل ہوتا تھا۔ خاموشی اور ویرانی کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ الوؤں کا راج ہے لیکن جب چوتھی منزل پر جانے کے لئے قدم اٹھ رہے تھے تو نہ جانے کیوں اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

اس کا دل پھڑک پھڑک کر دعائیں کر رہا تھا کہ وہاں بھی کوئی نہ ہو۔ کوئی نہیں وہاں بھی الووں کا راج ہو۔ وہ انسانی تراش خراش کے ایسے نمونے دیکھ چکا تھا کہ اپنے دل میں کوئی اور نمونہ دیکھنے کی سکت نہ پاتا تھا۔ اس کے قدم تیز ہو گئے تھے۔ اس کے پیچھے دبے دبے قدموں سے آنے والے والوں کو کئی گز پیچھے چھوڑ دیا اور جب سیڑھیاں ختم ہوتے ہی سب سے پہلے سامنے پڑنے والے کمرے میں داخل ہوا تو جیسے دم بخود ہو کر رہ گیا۔ نیلے صاف ستھرے لباس میں ملبوس ایک چھوٹے سے قد کی خوبصورت لڑکی اس کے سامنے زمین پر بیٹھی تھی"۔ (۹)

اسی طرح وہ تیسری منزل پر چڑھ جاتے ہیں اور تمام کمروں میں داخل ہو کر جائزہ لیتے ہیں ایک کمرے میں ایک گم سم سی لڑکی بیٹھی ہوئی ہے۔ تمام لوگ اس کو اغوا کر لیتے اور اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ اس لڑکی کی تمام چیزیں وہاں پر پڑی ہیں۔ یہ لوگ ان کو دیکھ کر پریشان ہو جاتے ہیں۔ اس کے بارے میں سوچنا شروع کر دیتے ہیں۔ عجیب اور حیرت ناک بات یہ کہ ان لوگوں کو کس طرح سے پتہ چل جاتا ہے جس کے بعد انھوں نے سراغ لگایا کہ مکان کے اندر کوئی رہتا ہے۔ پھر شبہ کی بنیاد پر تالا توڑ کر نہتی لڑکی کو اغوا کر کے لے جاتے ہیں۔ اب وہ یہ سوچ کر، پریشان ہو کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ یہ قیام پاکستان کے وقت ہونے والے واقعات کی عجیب و غریب داستان ہے۔ جب سب لوگ اپنوں سے بچھڑ جاتے ہیں تو ہر ایک پناہ اور سہارے کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا ہے۔

۱۹۴۷ء کی ہجرت اور پیش آمدہ واقعات و حادثات نے جہاں ہجرت نصیبوں کے دل و دماغ پر بے پناہ اثرات مرتب کیے وہاں اردو زبان و ادب پر بھی حد درجہ اثرات مرتب کیے۔ اس بیسویں صدی کے نصف آخر کا کون سا تخلیق کار ایسا ہے کہ جس نے ہجرت کے حوالے سے قلم فرسائی نہ کی ہو۔ غلام عباس، راجندر سنگھ بیدی، منٹو، اشفاق احمد، ممتاز مفتی، بانو قدسیہ، قرۃ العین حیدر، ہاجرہ مسرور، ناصر، فیض، ان میں سے ایسا کون سا تخلیق کار ہے جس نے اس موضوع پر اپنے جذبات کا اظہار نہ کیا ہو "آنگن" اور "زمین" کی صورت میں خدیجہ مستور نے تقسیم سے پہلے اور بعد میں ہندوستانی معاشرے یا سماج کی جذباتی، سیاسی، معاشی، نفسیاتی ہر طرح کی کیفیات و صورتحال قلم بند کر دی ہے۔ اسی تناظر میں اگر اس

افسانے کا مطالعہ کیا جائے تو یہ افسانہ خدیجہ مستور کے بہت سے دیگر تخلیقی کاموں کی بنسبت ہی نظر آتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی اور منٹو نے اس موضوع کو کچھ یوں برتا ہے کہ گویا قلم توڑ دیا ہے۔ تقسیم کے دوران مسلمان یا غیر مسلمان بچوں اور عورتوں کے اغواء کے حوالے سے جب تک نادر و اچھوتا نہ لکھا جائے دیگر اس موضوع کے تخلیقی کاموں سے ممتاز نہیں ہو سکتا۔ اس کہانی کے اندر جھول پایا جاتا ہے۔ ایک لڑکی چوتھی منزل پر مسہری پر تن تنہا بیٹھی ہے اور بڑی تعداد میں لوگ گھر کے باہر کا تالا توڑ کر اندر داخل ہو جاتے ہیں۔ موضوع میں تنوع نہیں تاہم اس کہانی کے لکھے جانے سے ہجرت پر لکھے جانے والی کہانیوں کی تاریخ میں اضافہ ہوا ہے۔ کہانی انسانی جذبات کی نفسیاتی کیفیت کا اظہار کرتی ہے۔ ہندوستانی معاشرہ یا پھر دنیا کے سبھی معاشروں کے مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ وہ دنیا کی ہر عورت پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں اگر حلال طریقے سے ممکن نہ ہو تو وہ حرام کھانے سے باز نہیں آتے اور ایسے مواقع جب مردوں کو میسر آجاتے ہیں تو شاید ہی وہ حق پر قائم رہ سکیں۔ مردوں کی نفسیاتی کیفیت کا اظہار یا ان کی نفسیاتی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ ہجرت کے زمانوں میں خواتین کا کردار ایک مظلوم اور مشہور کردار کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے اور یہ ایک بڑی حقیقت ہے کہ زیادہ تر خواتین ہی ہجرت کی آگ میں بھسم ہوئیں اور ناصر کا یہ اشعار اس موضوع سے بہت حد تک مطابقت رکھتے ہیں۔

"شہر در شہر گھر جلائے گئے
یوں بھی جشن طرب منائے گئے

اک طرف جھوم کے بہار آئی
اک طرف آشیاں بھی جلائے گئے

کیا کہوں کس طرح سر بازار
عصمتوں کے دیے بجھائے گئے"(۱۰)

اسلوب کے لحاظ سے خدیجہ مستور کے دیگر افسانوں کی مانند یہ ایک سلیس اور رواں اسلوب میں لکھا گیا افسانہ ہے۔ خدیجہ مستور جذبات کی منظر کشی کرنے میں کمال رکھتی ہیں۔ اس افسانے میں بھی جذبات نگاری، منظر نگاری اپنے کمال پہ نظر آتی ہیں۔

۹۔ ٹھنڈا میٹھا پانی-خدیجہ مستور

مجموعی طور پر ۹ افسانوں پر مشتمل اس مجموعے کا نام "ٹھنڈا میٹھا پانی" کے عنوان پر رکھا گیا ہے۔ اس افسانے میں جنگ سے ہونے والی تباہی اور پھر اسی تباہی سے کامیابی کیسے حاصل کی جاسکتی ہے کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ ایک بم کے گرنے سے بڑا گڈھا پڑ جاتا ہے اور ایک بوڑھا کس طرح اسے ایک کینوس میں بدلنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ ایک نصیحت آمیز افسانہ ہے۔ اس افسانے میں نئی سوچ اور جینے کا ایک نیا راستہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ افسانے کی تحریر بہت زیادہ سادہ ہے۔

یہ افسانہ ماہنامہ اردو ڈائجسٹ، مئی ۲۰۱۹ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ یہ افسانہ جنگی کہانی پر مشتمل ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ملک دشمن عناصر جب نقصان کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ مدد کرتا ہے اور اس کے نقصان سے بچا کر ہمارے لیے آسانیاں پیدا فرماتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جہاں جنگی نقصانات ہوتے ہیں وہاں کچھ فائدے بھی ہوتے ہیں۔ کہانی کا آغاز کچھ اس طرح سے ہوتا ہے کہ ملتان کی ایک فیملی لاہور میں مقیم ہے اور لاہور میں جنگ شروع ہونے اور بارڈر قریب ہونے کے باعث ان کے بچے جنگی گولہ باری سے ڈر جاتے ہیں۔ بچوں کی ماں بھی گھبرا جاتی ہے اور وہ چاہتی ہے کہ اپنے بچوں کو بارڈر سے دور کسی محفوظ مقام پر لے جائے۔ وہ فیصلہ کرتی ہے اپنے بچوں کو لے کر اپنے آبائی گاؤں ملتان چلی جائے گی۔ اس سے بچوں کے اندر ڈر اور خوف ختم ہو جائے گا۔ جب حالات ساز گار ہوں گے تو بچوں کو واپس لاہور لے آئے گی۔ وہ گاڑی کرائے پر لیتی ہے اور بچوں کو لے کر ملتان کے لیے روانہ ہو جاتی ہے۔ راستے میں دیکھتی ہے کہ بہت سی فوجی گاڑیاں ایک قافلے کی صورت میں جا رہی ہیں وہ حیران رہ جاتی ہے کہ ان میں سے بہت سے فوجی اپنی جان کی پروا کیے بغیر پریشان ہونے کی بجائے گاڑیوں پر رقص کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کا دل چاہتا ہے کہ وہ بھی ان کے ساتھ رقص کرے۔ اس بات سے وہ حیران ہو جاتی کی یہ لوگ وطن پر قربان ہونے کے لیے کس قدر ہشاش بشاش اور خوش ہیں۔ جنگ کے زمانے میں جہازوں نے ملتان کے قریب گاؤں پر بہت سے بم گرائے جس سے اس کے بچے خوفزدہ ہو گئے۔ میزبان خاتون بھی خوفزدہ ہو گئی اور وہ اپنے بچوں پر کچھ اس طرح سے جھکی کہ اگر بم

بھی گرے تو سب سے پہلے اس پہ گرے۔ اس طرح بچے محفوظ رہیں۔ اس سے اگلے دن وہ اس جگہ کا معائنہ کرنے کے لیے جاتی ہے جہاں پر جہاز نے بم گرایا تھا۔ جب اس متاثرہ گاؤں پہنچتی ہے تو وہ دیکھ کر دنگ رہ جاتی ہے کہ یہاں پر بم گرا تھا ایک بہت بڑا کنواں بن گیا تھا۔ اس جگہ لوگوں جمع ہیں، وہ دیکھتی ہے تو یوں گویا ہوتی ہے:

> "میں یہاں کھڑی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی اس سے کوئی ساٹھ ستر گز کے فاصلے پر بہت سے آدمی کھڑے جھک جھک کر نہ جانے کیا دیکھ رہے تھے۔ چپڑاسی نے پوچھنے کے بعد بتایا کہ اس جگہ بم گرا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب لوگ وہاں سے ہٹ گئے تو میں بھی وہاں تک پہنچ گئی۔ بم گرنے کی جگہ پر ایک چھوٹا سا کنواں بن گیا تھا اور اس کنویں کے قریب ایک بوڑھا شخص سفید چادر بچھائے ہوئے بیٹھا تھا۔ چادر پر بے شمار سکے پڑے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بوڑھے نے آواز لگائی چندہ دو بیگم صاحب اس جگہ کنواں کھدے گا اور یہاں سے ٹھنڈا میٹھا پانی نکلے گا"۔ (۱۱)

افسانے کے تجزیہ سے ثابت ہوتا ہے کہ قدرت کی جانب سے ہر کام میں کوئی نہ کوئی بہتری اور مصلحت ہوتی ہے۔ اگر جنگ کے دوران اس جگہ یہ بم نہ گرتا تو کبھی اندازہ ہی نہ ہوتا کہ اس زمین کے اندر ٹھنڈے میٹھے پانی کی نعمت پوشیدہ ہے۔ اس طرح کے واقعات ہماری سوچ اور فکر میں بھی اضافہ کرتے ہیں۔

"ٹھنڈا میٹھا پانی" موضوع کے اعتبار سے انوکھی کہانی نظر آتی ہے۔ اس کہانی میں جنگ کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتحال بیان کی گئی ہے۔ ماں اس کہانی کا مرکزی کردار ہے جو اپنے بچوں پر قربان ہونے سے دریغ نہیں کرتی۔ اس کہانی میں ماں کا کردار جامع کردار ہے جو اس حد تک حساس ہے کہ وہ کسی صورت بھی بارڈر کے قریب اس لیے نہیں رہنا چاہتی کہ کہیں اس کے بچے جنگ کے نتیجے میں ہونے والے دھماکوں کی آواز سے خوفزدہ نہ ہو جائیں۔ چنانچہ وہ اپنے بچوں کو لے کر اپنے آبائی علاقے ملتان روانہ ہو جاتی ہے۔ ماں اور بچوں کے کردار کے بعد راستے میں فوجی سپاہیوں کا کردار ہماری توجہ اپنی طرف ملغطف کرتا ہے۔ جو جنگ کے خوف کو بالائے طاق رکھ کر گاڑیوں میں موج مستی کرنے میں مصروف ہیں۔ ماں کو حیرت ہوتی ہے یہاں فوجیوں کا کردار ایک طرح سے ماں کے کردار کے برعکس اس کے بچوں کے کردار میں ڈھل جاتا ہے جس طرح ماں اپنے بچوں کو باحفاظت ملتان پہنچانا چاہتی ہے تاکہ وہ محفوظ رہیں اس

طرح نوجوان سپاہی اپنی دھرتی ماں کی حفاظت بے خوف ہو کر کرتے ہیں۔ اچانک راستے میں دشمنوں کا ایک بم آن پھٹتا ہے تاہم سب محفوظ رہتے ہیں۔ اس افسانے کا موضوع جنگ کی ہولناکی ہے اور افسانہ نگار نے جنگ کے تناظر میں اچھی منظر نگاری کی ہے۔

تاہم اس افسانے کی ابتدا، منتہا اور انجام کے اندر تجسس تو موجود رہتا ہے تاہم عجیب سی صورت حال اس وقت پیدا ہو جاتی ہے جب افسانہ نگار منفی میں سے مثبت امکانات ظاہر کرتی ہے اور افسانے کا یہ موڑ عجیب سی صورت حال اور کشمکش دکھاتا نظر آتا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ بم کے گرنے سے اتنا بڑا گڑھا بن جائے کہ وہ کنواں کی صورت میں بدل جائے یہ ایک غیر حقیقی صورتحال ہے اور ایسا لگتا ہے کہ افسانہ نگار حقیقت سے ہٹ گئی ہے یا پھر غیر حقیقت پسندانہ انجام کی طرف افسانہ بڑھ جاتا ہے۔ بہر حال اسلوب سلیس اور رواں ہے۔ منظر نگاری خوب ہے۔ خدیجہ مستور کے دیگر افسانوں کی مانند جذبات کی پیشکش عمدہ ہے۔ کردار نگاری پر بھی توجہ دی گئی ہے ادق اور مشکل لفاظی سے اعتراض برتا گیا ہے لیکن یہ بات اپنی جگہ ہے کہ افسانے کا انجام حقیقت کے قریب ترین نہیں ہے۔ فنی طور پر یہ افسانہ اس لیے اہم ہے کہ اس میں ملکی سلامتی کے حوالے ایک مثبت سوچ کو پروان چڑھانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔

۱۰۔ایک حقیقت ایک فسانہ-ممتاز مفتی

ممتاز مفتی ستمبر ۱۹۰۵ء ہندوستان کے شہر بٹالہ میں پیدا ہوئے۔ایک حقیقت ایک فسانہ، ممتاز مفتی کا شاہکار افسانہ زندگی اور موت کا سوال کے عنوان سے حکایت کے شمارے اپریل ۲۰۱۹ء میں شائع ہوا ہے۔ افسانہ زمانے کے موجودہ حالات کے عین مطابق ہے۔ جس میں ایک لڑکے جمیل کی محبت کی ایک ایسی لازوال داستان بیان کی گئی ہے، جو پڑھائی کے لیے اپنے گاؤں سے دور شہر میں جا کر رہتا ہے اور وہاں اسے ایک لڑکی سے محبت ہو جاتی ہے۔ وہ لڑکی اس کے فلیٹ کے قریب ہی رہتی ہے جمیل اس سے ہر روز سے ملاقات کرتا ہے ۔ لڑکی بھی اس کے پاس آتی ہے اور جمیل سے راز و نیاز اور پیار محبت کی باتیں کرتی ہے۔ جمیل جب سامنے نہیں ہوتا تو لڑکی کھڑکی میں نہیں آتی۔ جمیل اسے حاصل کرنے کی حسرت کرتا ہے لیکن اسے یہ بھی خطرہ ہے کہ اگر وہ اُسے نہ مل پائی تو اس کے بغیر زندگی کیسے گزارے گا؟ اس لیے وہ ایک منصوبہ سوچتا ہے اور اپنے گاؤں میں ایک تار بھیجتا ہے۔ اس کے گاؤں والے انتہائی سادہ لوگ ہیں وہ تار سے مراد عموماً یہ لیتے ہیں کہ یہ صرف کسی ایمرجنسی کی صورت میں دی جاتی ہے۔ جب تار گاؤں میں پہنچتی تو لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید کوئی

فوت ہو گیا ہے۔ اس لیے گاؤں کے سب لوگ تار ملتے ہی رونا دھونا شروع کر دیتے ہیں۔ کوئی بھی تار کو پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔ جمیل سے جب شہر میں رابطہ کرتے ہیں کہ وہ خیریت سے ہے۔ جمیل کہتا ہے کہ اس نے کوئی ایسی اطلاع نہیں دی صرف خیر خیریت کے بارے میں لکھا ہے۔ اس کے گاؤں والے جب شہر میں اس کی خیریت کا پتہ کرنے جاتے ہیں وہاں پہنچ کر جمیل ان کو لڑکی سے محبت کی روداد سے یوں آگاہ کرتا ہے:

> ”ارے یار اس سامنے والے گھر میں رہتی ہے وہ کھڑکی سے دیکھتے ہوئے لیکن نہ جانے آج کیا معاملہ ہے؟ سامنے ہی نہیں آرہی کھڑکی بھی بند ہے ورنہ روز ادھر ادھر کوٹھے پر قلیلیں کرتی ہوئی آئی لیکن خاکسار کے علاوہ کوئی اور سامنے ہو تو نے کیا مجال جو کھڑکی میں آئے تبھی تو تمہیں کہا تھا کہ ذرا اس کرسی پر ہو جاؤ مجھے دیکھ کر کھڑکی بند تو نہیں کرلی۔ میں نے معذرت کے انداز میں کہا“۔ (۱۲)

جمیل اپنے دوست کو بتاتا ہے کہ اُسے جینے میں کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ اس لیے اس نے گاؤں میں تار بھیج دیا تاکہ وہ اپنی پریشانی کو کسی کے ساتھ بانٹ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکے۔ وہ اپنے ساتھ ہونے والے تمام حالات و واقعات بتانا چاہتا ہے۔ وہ اپنے دوست کو فلیٹ کی چھت پر لے جاتا ہے۔ جب اس کا دوست چھت پر چلا جاتا ہے تو وہ لڑکی کھڑکی میں نہیں آتی ہے۔ لیکن جب جمیل چھت پر آتا ہے تو وہ اُس کو دیکھنے کے لیے اس کے پاس چھت پر آجاتی ہے۔ اس کہانی میں بتایا گیا ہے کہ یوں کسی سے حد سے زیادہ محبت کرکے اُسے اپنے اعصاب پر سوار کرنے سے کچھ حاصل نہ ہو گا انسان کو اپنی جان کی حفاظت کرتے ہوئے حد اعتدال میں رہنا زیادہ فائدہ مند ہو گا۔ جمیل دیوانگی کے عالم میں اپنے دوست سے پوچھتا ہے کہ کیا میری یہ خواہش پوری ہو سکے گی جس پر اس کا دوست قہقہہ لگاتا ہے اور کہتا ہے کہ اب پتہ نہیں کہ آپ کی یہ خواہش پوری بھی ہو سکے یا نہیں۔

ممتاز مفتی کا یہ رومانوی افسانہ ہے عام طور پر ممتاز مفتی اپنے افسانوں میں نفسیاتی مسائل چھیڑتا ہے لیکن اس افسانے میں رومانویت نظر آتی ہے۔ یہ افسانہ فنی اعتبار سے کوئی بہت بڑا شاہکار نہیں ہے۔ اس افسانے میں دو کردار ہیں ایک جمیل اور دوسرا لڑکی جو جمیل کو تنہا دیکھتی ہے تو کھڑکی کھول دیتی ہے۔ پورے افسانے میں وہ صرف ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں کہیں بھی گفتگو یا بات چیت نہیں ہوتی۔ جمیل کا کردار پھر بھی کسی حد تک متحرک نظر آتا ہے لیکن لڑکی کا کردار جامد ہے۔ جمیل اپنے گاؤں میں تار بھیجتا

ہے جسے پڑھے بغیر گاؤں والے سمجھتے ہیں کہ شاید گاؤں میں کوئی فوت ہو گیا ہے اور ان میں سے کچھ شہر جمیل سے ملنے بھی آ جاتے ہیں۔ جب وہ لڑکی کے حوالے سے بات کرتا ہے تو وہ ہنستے ہیں۔ ایسا نظر آتا ہے کہ ڈائجسٹ نے اس لیے یہ افسانہ شائع کر دیا ہے کہ اس کے اوپر ممتاز مفتی کا نام لکھا ہوا ہے۔ ورنہ عجیب بے جان سے کہانی ہے۔ جمیل کا کردار توانا، زندہ اور متحرک کردار نہیں ہے بلکہ یہ کردار شروع سے آخر تک یکسانیت کا شکار ہے۔ اس میں تحرک نہیں پایا جاتا ایک شخص محبت کا اظہار تو کرتا ہے لیکن اس کے حصول کے لیے کسی قسم کی کوئی سرگرمی انجام نہیں دیتا۔ محض ایک امید پر باتیں ہی کرتا چلا جاتا ہے۔

اس افسانے میں جہاں تار کے ذریعے پیغام بھجوانے سے ہمیں زمان و مکان سے آگاہی ہوتی ہے وہیں گاؤں کی زندگی، ان کی جہالت اور بر صغیر کے معاشروں کے اس چلن سے آشنائی بھی ہوتی ہے کہ یہاں جب کوئی سنتا ہے کہ کتا کان لے کر بھاگ گیا تو لوگ کان کو نہیں بلکہ کتے کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیتے ہیں۔ تو ایسی صورتحال کی منظر کشی کی گئی ہے کہ تار کو پڑھے بغیر لوگ کسی کی موت کی خبر پھیلا دیتے ہیں۔ اس افسانے میں تار کے حوالے سے تہذیبی و معاشرتی ترجمانی کی گئی ہے کہ تار تب بھیجا جاتا ہے جب کوئی بہت ہی اہم سرگرمی انجام پائی جاتی تھی۔ خاص طور پر کسی کی موت کی اطلاع کے لیے۔ اس افسانے کا اسلوب سیدھا سادا سپاٹ اور رواں ہے۔ کہانی کا پلاٹ ایک ہی لائن میں آگے بڑھتا ہے۔

۱۱۔ تماشا- منشایاد

منشایاد کے چھ افسانوی مجموعے اور کم و بیش ۱۲۵ افسانے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا پہلا افسانہ ۱۹۵۵ء میں تماشا منظر عام پر آیا۔ منشایاد نے اپنے ارد گرد پھیلے ہوئے سماج کی کمزوریوں، ناانصافیوں، ظلم اور زیادتیوں کو محسوس کیا اور اپنے لفظوں میں بیان کیا۔ انھوں نے ہمیشہ پسے ہوئے نچلے طبقے کے لوگوں کی بات کی۔

تماشا، منشایاد کے قلم کا ایک شاہکار افسانہ ہے جو ماہنامہ حکایت، جون ۲۰۱۹ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ اس افسانے میں بتایا گیا ہے کہ ایک باپ بیٹا دونوں کرتب دکھا کر اپنی روزی کماتے ہیں۔ ایک دن وہ دریا کے کنارے پہنچے تا کہ دوسری بستی میں جا کر اپنے کرتب دکھائیں اور کچھ پیسے کمائے جا سکیں۔ لیکن دونوں باپ بیٹے کو تیرنا نہیں آتا اور وہ اپنا سامان لے کر دریا کے کنارے پر پریشان کھڑے ہوتے ہیں۔ یک بارگی وہ دونوں باپ بیٹا سوچتے ہیں کہ دریا میں کود جائیں اور اس دور بستی، جس کی مسجد کے مینار انہیں نظر آ رہے ہیں، وہاں تک پہنچ جائیں گے لیکن ان کی ہمت نہیں پڑتی کہ وہ اپنے آپ کو دریا کی تند و تیز لہروں کے حوالے کریں۔ باپ اور

اس کا بیٹا کبھی دریا کے کنارے ٹیلے پر چلتے ہیں اور کبھی نیچے اترتے ہیں۔ انھیں دور ایک بستی دکھائی دیتی ہے وہ سمجھتے ہیں کہ اس پُل کے ذریعے سے اس بستی میں داخل ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب جنگل میں بہت سی مشکلات برداشت کرتے ہوئے بستی کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں تو انہیں راستہ نہیں ملتا۔ اچانک وہ ایک بونوں کی بستی میں پہنچ جاتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ بونوں کی بستی میں تماشا دکھا کر کچھ روزی روٹی کا بندوبست کرنا چاہیے، وہاں کوئی بھی ان کے فن کی تعریف نہیں کرتا، نہ ان کو کوئی انعام واکرام دیتا ہے۔ وہ کرتب دکھاتے رہتے ہیں آخر کار جب وہ آخری کرتب دکھانے کا کہتے ہیں کہ میں اب اپنے بیٹے کی گردن پر چھری چلاؤں گا اور یہ جادو نہیں بلکہ ایک ہاتھ کی صفائی کا کام ہو گا کیونکہ کوئی بھی باپ اپنے بیٹے کو اپنی آنکھوں کے سامنے ذبح نہیں کر سکتا۔ بڑا اُستاد اپنے تماشائیوں سے اس طرح مخاطب ہوتا ہے:

"صاحبان قدر دان کوئی باپ اپنے بیٹے کی گردن پر چھری نہیں چلا سکتا۔۔۔۔ نہ ہی اللہ کے پیغمبروں کے سوا کسی میں اتنی ہمت اور حوصلہ ہو سکتا ہے۔۔۔ یہ سب کچھ ایک کھیل ہے نظر کا دھوکہ۔۔۔ اس پاپی پیٹ کی خاطر۔ ہمیں معلوم ہے ہم جانتے ہیں باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔ سردار کہتا ہے۔

چھری چلاو۔ ایک طرف سے آواز آتی ہے۔

چھری چلاؤ۔۔۔ چھری چلاؤ۔ تماشائی شور مچاتے ہیں۔

وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے اور جمہورے کے قریب آ کر چھری چلاتا ہے۔

تماشائی زور زور سے تالیاں اور سیٹیاں بجاتے ہیں، سکے پھینکتے اور بکرے بلاتے ہیں اور جمہورے کے دوبارہ زندہ ہونے کا کھیل دیکھے بغیر کھسکنے لگتے ہیں"۔ (۱۳)

جب باپ یہ اعلان کرتا تو کچھ بستی کے لوگ اس کو کہتے ہیں کہ ایسا نہ کریں لیکن کچھ لوگ کہتے ہیں دیکھ لو کی آواز دیتے ہیں۔ جب وہ بیٹے کے اوپر چادر ڈال کر مجمع کے سامنے ایسا کرتا ہے تو لوگ اس کو بہت سا انعام واکرام اور پیسے دیتے۔ اس کے بعد وہ اپنے بیٹے کو کہتا کہ پیسے اور سکے وغیرہ جمع کرو تو وہ نہیں اٹھتا جب اس نے چھری چلاتے وقت اپنے بیٹے کے منہ پر چادر ڈال دی تھی۔ اب جب وہ اپنے بیٹے کے منہ سے چادر اُٹھاتا ہے تو بیٹا واقعہ ذبح ہو چکا ہوتا ہے اس پر وہ اتنا پریشان ہوتا ہے، روتا اور واویلا کرتا ہے لیکن کوئی بھی اس کی سننے والا نہیں ہوتا۔

منشا یاد کا افسانہ تماشا ایک بہترین افسانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس افسانے میں ایک باپ بیٹے کا کردار ابھرتا ہے اور ایک ایسے معاشرے کے پس منظر میں یہ کہانی بنی گئی ہے جہاں ایک طرف غربت، بے روزگاری کے ستائے باپ بیٹا شعبدہ بازی دکھا کر روٹی روزی کمانے کی کوشش کرتے ہیں اور دوسری طرف معاشرہ بے حسی کا شکار نظر آتا ہے۔ تماشا لگانے والے یعنی شعبدہ باز باپ بیٹا اس حد تک بے روزگاری اور بھوک سے ستائے ہوئے ہیں کہ وہ ایک رواں دریا میں کود کر بستی تک پہنچنا چاہتے ہیں تاکہ وہ اپنی شعبدہ بازی کے ذریعے رزق کا بندوبست کر سکیں۔ حالانکہ وہ تیرنا نہیں جانتے یہاں تک کہ وہ ایک گاؤں میں پہنچ جاتے ہیں اور گاؤں میں پہنچ کر باپ شعبدہ دکھاتے دکھاتے حقیقتاً اپنے بیٹے کو ذبح کر بیٹھتا ہے۔ باپ کا کردار زندہ اور متحرک کردار ہے جبکہ مصنف نے اس گاؤں کو بونوں کا گاؤں قرار دیا ہے دراصل ہم سب جب بے حس ہو جاتے ہیں سفاک ہو جاتے ہیں اور ظالم ہو جاتے ہیں تو کردار سے عاری بونے بن جاتے ہیں۔ باپ محض بیٹے پر چھری چلانے کا ڈھونگ رچا کر بونوں سے پیسے بٹورنا چاہتا تھا لیکن بونے اسے مجبور کر دیتے ہیں کہ ہر صورت وہ چادر کے نیچے لیٹے سٹیج پر پڑے بیٹے پر چھری چلا دے۔ اس سے معاشرے میں بڑھتی اور پھیلتی ہوئی سفاکیت، سادیت پسندی اور ظلم کی داستان کی ترجمانی ہوتی ہے اور جس وقت بونے آدھا تماشا دیکھ کر اپنے گھروں کو لوٹنے لگتے ہیں تو افسانے کی کہانی اپنی منتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ معاشرے کے بونے افراد کو اس بات کا احساس نہیں کہ باپ کے ہاتھوں بیٹا ذبح ہو گیا ہے بلکہ افراد معاشرہ کو تو بس تماشا چاہیے اور تماشا دیکھنے کے بعد وہ اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں اور کوئی اس کے دکھ میں شریک نہیں ہوتا۔ اس افسانے میں بیٹے کا کردار ایک مؤدب اور معصوم بچے کا کردار نظر آتا ہے جو تماشا دکھانے کی خاطر چپ چاپ ذبح ہو گیا۔ یہ کردار بہت دیر تک افسانے میں موجود نہیں رہتا لیکن بہت گہرا تاثر چھوڑ جاتا ہے جب تک کہ باپ کا کردار بیٹے کو ذبح کرنے کے باوجود سفاک نہیں بلکہ مظلوم کردار کی صورت میں ڈھل جاتا ہے۔ منشا یاد نے اس افسانے میں کردار نگاری پر خاص توجہ مرکوز کی ہے۔

اس افسانے کے پلاٹ کی بنت سوچ سمجھ کر کی گئی ہے جہاں کہانی اپنے اندر ایک کشش تجسس اور سحر رکھتی ہے وہیں پلاٹ کی بنت اس کہانی کو جادوئی بنا دیتی ہے اور قاری کہانی پن نیز گھٹے ہوئے پلاٹ کی وجہ سے کہانی کے سحر میں آخر تک مبتلا رہتا ہے۔ منشا یاد نے اس کہانی میں کمال کی منظر کشی کی ہے۔ دریا کی منظر کشی، کرداروں کی منظر کشی، معاشرے کے بونے کرداروں کی منظر کشی، سٹیج پر باپ کے ہاتھوں بیٹے

کی ذبح ہونے کی منظر کشی اور پھر باپ کے شور و غوغا اور درد کی منظر کشی، تماشا دیکھنے والوں کی بے حسی کی منظر کشی، بڑی ہنر مندی سے کی ہے۔

اس افسانے کو رسالہ حکایت نے شائع کیا بلاشبہ ہر حوالے سے یہ افسانہ منشایاد کا شاہکار افسانہ کہا جاسکتا ہے۔ باپ اور بیٹے کا کردار اعلیٰ پائے کا ہے۔ اس کی کہانی دل کو چھو لینے والی ہے اور کہیں کہیں تو یہ افسانہ علامت کے اندر بھی ڈھلتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کہانی کے اندر جان موجود ہے اور جو موضوع ہے شعبدہ گھر شعبدہ بازی بڑی اچھوتا انوکھا متنوع اور اعلیٰ قسم کا نظر آتا ہے۔ اس افسانے کا اگر فنی جائزہ لیا جائے تو کہانی اعلیٰ پائے کی ہے۔ اس کی ابتدا کہانی کی بنت اس کے افسانے کے ساتھ ساتھ چلتے چلے جانا اور آخر تک کہانی کے اندر تجسس قائم رکھنا افسانہ نگار کی بہت بڑی کامیابی ہے۔ اس افسانے کا پلاٹ بہت گٹھا ہوا بہت اچھا اور ریاضیاتی تقسیم پر مبنی نظر آتا ہے۔ یہاں اس پلاٹ کے اندر ہمیں جھول نہیں ملتا۔ افسانے کے اندر اگر کرداروں کی بات کریں تو وہ باپ یعنی شعبدہ گر اس کا بیٹا اور وہ بستی جسے منشایاد نے بونوں کی بستی قرار دیا ہے۔ وہ تیسرا کردار کہا جاسکتا ہے شعبدہ گر اور اس کا بیٹا مفلسی کے ہاتھوں پٹے ہوئے ہیں اور بہت پریشان نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ دریا میں چھلانگ لگا کے بھی دوسرے کنارے دوسری بستی جانا چاہتے ہیں جو ناممکن ہے اس کے بعد وہ بونوں کی بستی میں پہنچتے ہیں اور اس کا ان کے سامنے شعبدہ گری کا مظاہرہ کرتے ہیں بونے کون ہیں بونے بنیادی طور پر انسان ہیں اور ایک ایسی بستی سے ان کا تعلق ہے جن کے اندر جذبہ نہیں ہے شعبدہ گر اپنی روٹی روزی کے لیے ایک جذباتی تقریر کرتا ہے اور اس کے بعد وہ اپنے بیٹے کو لٹاتا ہے اس پر کپڑا ڈالتا ہے اور چھری چلاتا ہے اس کے ساتھ وہ سمجھتا ہے کہ وہ ابھی لیٹا ہوا ہے اور اس کے بعد پتہ چلتا ہے کہ وہ تو مر گیا ہے اور بونے جو بے حس انسان بحث قوم اور جذبات سے عاری اور خود غرض لوگ کہے جاسکتے ہیں تیسرا کردار انہی کا ہے وہ اس کو نوٹس ہی نہیں کرتے شعبدہ گھر کے اوپر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی ہے بہت پریشان بہت غمگین اور دونوں کے آگے روتا پیٹتا ہے لیکن بونوں کو اس کی پرواہ نہیں ہے تو تین کردار شعبدہ گر اس کا بیٹا اور اور بونے تینوں کردار اعلیٰ طریقے سے تخلیق کیے گئے ہیں۔ اسی طرح اس افسانے کا اسلوب بہت اعلیٰ پائے کا ہے۔ منشا یاد جس طرح کے اعلیٰ پایا اسلوب کے حوالے سے جانے جاتے ہیں۔ یہ اسلوب ہمیں اسی صف میں کھڑا نظر آتا ہے۔ کہانی موضوع پلاٹ کردار تجسس منظر نگاری جزئیات نگاری اسلوب نگاری ہر حوالے سے یہ اعلیٰ پائے کا افسانہ کہا جاسکتا ہے۔

۱۲۔لاڈلے میاں-نائلہ بلیغ الرحمٰن

لاڈلے میاں، نائلہ بلیغ الرحمٰن کا لکھا ہوا افسانہ ہے جو ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ، جون ۲۰۱۷ء میں شائع ہوا ہے۔ افسانے کی کہانی میں لاڈلے میاں کے دو بڑے بھائی ہیں۔ لاڈلے میاں ان سے چھوٹے ہیں۔ لاڈ پیار کی وجہ سے پڑھائی میں ان کا دل نہیں لگتا اور ان کی والدہ ہر وقت ماسٹر کو برا بھلا کہتی اور لاڈلے میاں سے بہت پیار کرتی ہیں۔ لاڈلے میاں کے تین بچے ہیں جن میں ایک زارا، سارا، ایک بیٹا وسیم اور ان کی بیگم ہے۔ یہ خاندان بڑی مشکل سے حالات کا مقابلہ کر کے اپنی گزر بسر کرتا ہے۔ لاڈلے میاں کے دونوں بڑے بھائی ڈاکٹر ہیں اور کراچی منتقل ہو گئے ہیں اور وہاں انھوں نے لیڈی ڈاکٹرز سے شادی کر لی ہے۔ وہ لاڈلے میاں سے ملنے سے کتراتے ہیں۔ کیونکہ وہ کسی کو یہ نہیں بتانا چاہتے کہ لاڈلے میاں ان کے بھائی ہیں وہ غریب ہیں اور ان کی حالت بھی ایسی ہے کہ کپڑے بھی ٹھیک نہیں ہے جو کسی کے سامنے بیٹھا جا سکے۔ لاڈلے میاں کی بیٹی اپنے تایا کے ہاں کراچی جاتی ہے تو ان کی کزنز ان سے نفرت کرتی ہیں اور اپنے ملنے والوں سے کبھی بھی ان کا تعارف نہیں کراتیں۔ اس طرح جب وہ دونوں بھائی اپنی والدہ کو رمضان کے لیے کراچی بلا رہے تھے کہ وہ ان کے پاس آ کر روزے رکھے تو کوئی بھی گھر کا فرد لاڈلے میاں کی والدہ کے ساتھ جانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ جسے اس واقعہ کو افسانے میں یوں بیان کیا گیا ہے:

> ”دادی نے بچوں سے بھی پوچھا تھا مگر سب نے انکار کر دیا تھا، سارا زارا گئی تھیں کراچی مگر گھر والوں کے رویے کی وجہ سے وہ دکھی لوٹی تھیں۔ وہ اپنے کزنز ان سے بات بہت کم کرتے تھے۔ گو کہ بڑے اور چھوٹے تایا نے اپنے ڈرائیور گاڑیوں سمیت ان کے حوالے بھی کیے تھے تاکہ وہ انھیں گھمالائیں مگر دونوں کا دل پھر بھی نہ لگا تھا۔ وہ بری طرح سے احساس کمتری کا شکار ہو گئی تھیں۔ ان کا لباس اور جوتے انہیں ہمیشہ کمرے میں بند رہنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ ایک بار بڑی تائی کے میکے سے مہمان آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے سارا اور زارا کو تاکید کر دی تھی کہ جب تک مہمان گھر میں رہیں تم اندر ہی رہنا کمرے میں۔ غالباً ان کی کم مائیگی ان کے حلیوں سے ظاہر ہو رہی تھی کیونکہ انھوں نے زارا اور سارا کا مہمانوں سے تعارف کروانا بھی مناسب نہ سمجھا تھا“۔ (۱۴)

اس طرح لاڈلے میاں خود اپنی والدہ کو لے کر اپنے بھائیوں کے گھر کراچی چلے جاتے ہیں لیکن پھر اپنے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک کی وجہ سے بہت پریشان ہوتے ہیں۔ ایک بار جب لاڈلے میاں اپنی والدہ کو لے کر جب کراچی گے تو ان کے بھائی نے ان کا استقبال کیا۔ جب ان کے بھائی کے گھر گئے تو اس نے ان کو کچھ پیسے دیے کہ وہ بازار سے کپڑے خرید لائیں اور اپنا حلیہ درست کریں۔ کیونکہ ان کے گھر میں جو مہمان آئیں گے وہ ان کے کھانے پینے کو نہیں دیکھیں گے بلکہ کپڑوں کو دیکھیں گے۔ لاڈلے میاں نے اپنی توہین محسوس کی اور اسی دن گاڑی میں بیٹھ کر کراچی سے اپنے گھر آ گے۔ لاڈلے میاں کی والدہ بھی اگلے دن گاڑی میں بیٹھ کر اپنے گھر پہنچ گئی۔ تکنیکی لحاظ سے اگر کہانی کا مطالعہ کیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ ہمارا کسی سے جتنا بھی قریبی رشتہ ہو، وہ ایک حد تک اس کی پاسداری کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ ہمیں معاشرے کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے کہ ہم کہاں تک معاشرے کے ساتھ چل سکتے ہیں۔

"لاڈلے میاں" نائلہ بلیغ الرحمان کا ایک اچھا افسانہ ہے۔ اس افسانے میں معاشرے اور سماج کے پس منظر میں اچھی کہانی بیان کی گئی ہے۔ اس افسانے کے اندر اگرچہ تین سے چار کردار ہیں لیکن دراصل یہ تین سے چار کردار ہمارے سماج یا برصغیر کے سماج کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس افسانے کے اندر یہ دکھایا گیا ہے کہ سماج اور معاشرہ معاشی لحاظ سے کس طرح سے تفرق یا فرق برتتا ہے۔ ڈاکٹرز کے کردار اس حد تک تو اچھے کردار ہیں کہ وہ لاڈلے میاں کی بیٹی کو گاڑی اور ڈرائیور دیتے ہیں کہ وہ اسے گھما پھرا کر لائے لیکن یہی کردار اپنے بچوں کی اچھی تربیت نہیں کر سکے اور اپنی بیگمات کو یہ نہیں سمجھا سکے کہ لاڈلے میاں ان کے بھائی ہیں اور ان کی بیٹی ان کی بھتیجی ہے اس کی عزت کرنا ضروری ہے یہاں تک اسی طرح سے اس افسانے میں خود لاڈلے میاں کا کردار بھی حساس ہے۔ شروع میں تو وہ ایک پڑھا لکھا کردار نظر نہیں آتا لیکن یہی کردار بعد ازاں معاشرے کے اندر اپنے مقام کو اس وقت سمجھ جاتا ہے جب بھائی کے ہاں اسے جس دن اپنی ماں کو لے کے جاتا ہے واپس آنا پڑتا ہے کیونکہ بھائی کا خیال ہے کہ لاڈلے میاں کے لباس جوتے اچھے نہیں ہیں اور وہ مہمانوں سے اپنے بھائی کا تعارف کیسے کروائے گا۔ وہ اسے پیسے دیتا ہے کہ بازار سے نئے کپڑے اور جوتے جوتے خرید لیں اور اگلے دن ماں بھی واپس اجاتی ہے گویا کہ ماں کا کردار اپنے غریب بیٹے سے محبت کا کردار ہے۔ اس افسانے کے اندر کردار نگاری کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے اور ہر کردار اپنی اپنی جگہ متحرک ہے زندہ ہے اور جامع ہے۔ اسی طرح سے لاڈلے میاں کی غربت اور ڈاکٹرز کی دولت مندی کے کی منظر نگاری خوب کی گئی ہے اور یہی نہیں غربت کے ماحول میں پلنے والی

بچیاں ان کا ماحول اور ان کی انا حساسیت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ دوسری طرف اسی احساس سے عاری ڈاکٹرز کے بچوں کے بارے میں بیان کیا گیا ہے اس افسانے میں جزئیات نگاری باکمال ہے۔ پلاٹ بہت اعلیٰ ہے گٹھا ہوا ہے اور تجسس کہانی کے اندر تجسس موجود ہے جو شروع سے آخر تک رہتا ہے۔ اس کہانی میں سماج کی حد درجہ حقیقت نگاری کی گئی ہے۔ سماج کیا سوچتا ہے؟ سماج کیا کرتا ہے؟ اور کس طرح سے سفاک حقیقت نگاری ہمیں نظر آتی ہے۔ بہر حال کہانی پن، کردار نگاری، منظر نگاری، جزئیات نگاری ابتدا منتہی انجام تجسس ہر حوالے سے یہ افسانہ ایک بہترین افسانہ کہلانے کے قابل ہے۔ اس میں فنی اعتبار سے اچھی خاصی بلاغت اور بلوغت پائی جاتی ہے۔

۱۳۔ چاند اور گلشن۔ بلونت سنگھ

افسانہ چاند اور گلشن، بلونت سنگھ کا لکھا ہوا ایک ایسا شاہکار افسانہ ہے جو ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ، جون ۲۰۱۷ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ اس میں پنجاب کے ایک گاؤں میں رہنے والے بد معاش صورت سنگھ کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ ہندوستان پنجاب میں واقع اس گاؤں کا نام دبئی والا ہے وہاں کا نمبر دار علاقے کے تھانیدار نواب سنگھ کو اطلاع دیتا ہے کہ اس کے گاؤں میں ایک بد معاش صورت سنگھ اپنی محبوبہ سے ملنے آیا ہے۔ وہ اس لڑکی کے عشق میں گرفتار ہے اور اکثر و بیشتر چھپ چھپا کر اور کبھی کھلے عام اپنی محبوبہ سے ملنے کے لیے آتا رہتا ہے۔ نمبر دار کی اطلاع پر تھانے دار نواب سنگھ، صورت سنگھ کو گرفتار کرنے کے لیے گاؤں کا رخ کرتا ہے۔ گاؤں میں پہنچ کر صورت سنگھ کی گرفتاری کا منظر کچھ یوں بیان کیا گیا ہے:

> ”غالباً صورت سنگھ کو اس کی آمد کی خبر مل گئی تھی۔ نواب سنگھ نے لگام کو جھٹکا دیا گھوڑا گاؤں کے ہاشیے سے ہو کر دوڑ نکلا اور اس کے سموں سے گیلی زمین سے ننھے ننھے پودے اکھڑ کر ادھر ادھر اڑنے لگے۔ تفریح طبع کی خاطر کچھ کتے بھی سوار کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگے۔ جب سوار گاؤں کے دوسری طرف پہنچ کر رک گیا تو کتے بھی عجیب سے قلنرانہ انداز اور بے اعتنائی کے ساتھ دائیں بائیں بکھر گئے“۔ (۱۵)

اس افسانے میں دیہاتی ماحول کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا گیا۔ تھانے دار نواب سنگھ کی نفسیات کی عکاسی بھی بڑے خوبصورت انداز سے کی گئی ہے۔ جب نواب سنگھ تھانے دار صورت سنگھ کو گرفتار

کرنے لگتا ہے تو وہ اتنی تیزی سے بھاگتا ہے کہ نواب سنگھ اپنا گھوڑا چھوڑ کر صورت سنگھ کے پیچھے دوڑتا ہے۔ آخر کار نواب سنگھ صورت سنگھ کو گرفتار کر لیتا ہے مگر وہ اس کو کوئی سزا نہیں دیتا۔ اُسے یہ کہہ کر چھوڑ دیتا ہے کہ آئندہ اس کے علاقے میں اس گاؤں میں آنے کی جرأت نہ کرے۔ جس پر اس کی محبوبہ بہت مایوس ہو جاتی ہے اور تھانے دار واپسی کا رُخ کرتا ہے۔ صورت سنگھ اپنی محبوبہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتا تو وہ اس سے ہاتھ چھڑا لیتی ہے۔

بلونت سنگھ کا افسانہ چاند اور گلشن ایک اور درجے کا افسانہ ہے۔ اسے بہت مجا ہوا ادب کا اعلیٰ شاہکار نہیں کہہ سکتے اس میں ایک ڈاکو کا کردار ہے اسی طریقے سے ایک تھانیدار کا کردار ہے جو دونوں سکھ ہیں مزید بر آں یہ کہ اس علاقے کے نمبر دار کے کردار بھی موجود ہیں۔ اس افسانے کی کہانی تو اوپر بیان کی گئی ہے۔ اس افسانے میں خوبصورتی یہ ہے کہ یہاں دیہاتی پس منظر کو بہت محنت سے اجاگر کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں دیہات کی کشش دیہات کی منظر نگاری دیہات کی زندگی نمبر دار وغیرہ کی قوت تھانیدار کا کردار ایک ایک چیز جو ہے وہ بہت ہی اچھے طریقے سے پیش کی گئی ہے۔ ظاہراً تو یہ ایک رومانوی قصہ ہے جس میں ایک سکھ ڈاکو صورت سنگھ اپنی محبوبہ سے ملنے کے لیے دبئی والا گاؤں میں چھپ کر آتا ہے اور نمبر دار تھانیدار کو خوش کرنے کے لیے اطلاع دے دیتا ہے حالانکہ سورت سنگھ نمبر دار کے لیے کوئی خطرہ نہ تھا نمبر دار کا کردار یہاں متضاد ہے۔ ایک طرف وہ گاؤں والوں کا رکھوالا ہے اور دوسری طرف وہ پولیس کے ساتھ ملا ہوا نظر آتا ہے۔ تھانیدار کا کردار یا سورت سنگھ کا کردار یا اس کی محبوبہ کے کردار۔ اگر یہ کہیں کہ یہ بہت ہی جامع، بہت ہی اکمل بہت ہی اعلیٰ طریقے سے بنے گئے کردار ہیں تو یہ بات درست نہ ہو گی ایسا لگتا ہے کہ یہ کہانی کہیں سے سنی گئی ہے۔ یہ کوئی حقیقی قصہ تھا اور اسے بلونت سنگھ نے اپنے انداز میں بیان کر دیا ہے۔ کہانی کا انجام تقریباً منٹو کے افسانوں جیسا ہے جب تھانیدار صورت سنگھ کو پکڑنے کے بعد چھوڑ دیتا ہے اور صورت سنگھ دوبارہ اپنے محبوبہ کے پاس جاتا ہے اور وہ اس کے ہاتھ چھڑا اس سے ہاتھ چھڑا لیتی ہے اور اسے اہمیت نہیں دیتی تو اس سے اہل دانش کے لیے فکر کا سامان مہیا ہو جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہوا وہ محبوبہ جس کے کردار بہت زیادہ ابھرا ہوا زندہ کردار نہ تھا۔ اچانک اس میں کسی حد تک زندگی کی رمق پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جو یہاں ایک کہانی کے اندر کشمکش موجود ہے۔ آخر سورت سنگھ کی محبوبہ نے اسے کیوں چھوڑ دیا؟ کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کا محبوب اب سورمہ نہیں رہا؟ کیا پولیس کے ساتھ مل گیا ہے؟ یا اس کی توانائی پہلے جیسی نہیں رہی۔ اس کا کردار مشکوک ہو گیا ہے اسی طرح

تھانیدار صورت سنگھ کو کیوں چھوڑ دیتا ہے کیا دونوں سکھ ہیں؟ بھائی بندی ہے یا تھانیدار کے نزدیک اس کے مد نظر محبت ہے اور وہ دو دل توڑنا نہیں چاہتا یا وہ سورت سنگھ سے ڈر گیا ہے کئی سوالات ہمارے ذہن میں جنم لیتے ہیں۔ کہانی کہیں سپاٹ ہے، کہیں گنجلک ہو جاتی ہے۔ تاہم اس افسانے میں کرداروں کے نفسیاتی تجزیے کرنے کا اچھا خاصا سامان موجود ہے۔ پلاٹ بہتر ہے اسے بہت اعلیٰ ترین پلاٹ نہیں کہہ سکتے اسی طرح سے منظر نگاری اور کردار نگاری پر محنت کی گئی ہے۔ اس افسانے میں دیہات کی پیشکش کے لیے بھی اچھی خاصی تخلیقی پچ سے کام لیا گیا ہے۔ افسانے میں جزیات نگاری تجسس پایا جاتا ہے۔ اگر پلاٹ بہت زیادہ گٹھ ہوا نہیں تو ڈھیلا ڈھالا بھی نہیں ہے۔ مجموعی طور پر درمیانے درجے کا افسانہ ہے اور کرداروں کی شخصیت سازی بہت اُبھری ہوئی نظر نہیں آتی سادہ سلیس اور رواں اسلوب ملتا ہے۔

۱۴۔ماسٹر جی۔ جمیل احمد پال

پروفیسر ڈاکٹر جمیل پال نے ساہیوال سے لکھنے کا آغاز کیا۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے طالبعلموں کے بارے میں پنجابی کے بارے میں محبت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ پنجابی کو صوبے میں اس کا جائز حق نہ ملنے کا افسوس رہا۔ "پنجابی تحریک" کے روں رواں رہے۔ ماسٹر جی جمیل احمد پال کا لکھا ہوا افسانہ ہے۔ یہ افسانہ ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ، مارچ ۲۰۱۸ء میں شائع ہوا ہے۔ افسانے میں دو لڑکیوں کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ ان دونوں کی پریشانی یہ ہے کہ وہ آپس میں سہیلیاں بھی ہیں۔ دونوں کو انگریزی پڑھانے کے لیے گھر والوں نے ایک اُستاد مقرر کیا ہے۔ یہ اُستاد ان کو بڑے اچھے طریقے سے انگریزی پڑھاتا ہے۔ اس کے پڑھانے کے انداز اور طریقہ کار سے دونوں سہیلیاں اپنی پڑھائی سے بہت مطمئن ہیں جس کی وجہ سے وہ اپنے استاد کی بہت قدر افزائی کرتی ہیں۔ اچھا پڑھانے کی وجہ سے وہ اپنے استاد کی بہت گرویدہ ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنے دل میں خیال کرتی ہیں کہ اگر یہ استاد انگریزی پڑھانے کے لیے ان کو نہ ملتا تو انہیں بہت پریشانی کا سامنا ہوتا۔ لیکن شومئ قسمت سے ان کا یہ استاد ایک لڑکی کے عشق میں گرفتار ہے اور وہ اپنی محبوبہ کے لیے روز ایک نئی نظم لکھتا ہے۔ جب بھی ان کو انگریزی کا سبق پڑھانے آتا ہے تو اپنی محبوبہ کے لیے لکھی ہوئی نئی نظم ان کو سناتا ہے۔ نظم ان کے حوالے کر کے چلا جاتا ہے اور اگلے روز آ کر ان سے اس نظم کا جواب لکھنے کے لیے کہتا ہے۔ اس حوالے سے بچیاں استاد سے یوں گویا ہوتی ہیں:

"نہیں میری تو سمجھ میں نظم آئی نہیں۔ میں نے جب یہ کہا تو وہ مجھے نظم سمجھانے لگے اور جاتے جاتے ایک نظم مزید دے گئے اور ساتھ ہی کہہ گئے کہ میں تو سوچتا ہوں جب میری زندگی کے سوال کا جواب نہ ملا تو میں زہر کھا کر مر جاؤں گا"۔ (۱۶)

نظم ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ ماسٹر جی کا عشق اس حد تک آگے بڑھ چکا ہے کہ وہ کہتا ہے کہ اگر مجھے میری محبت نہ مل سکی تو میں زہر کھا کر مر جاؤں گا۔ اس کی یہ دونوں شاگرد پریشان ہوتی ہیں کہ اگر ماسٹر جی نے زہر کھالیا تو ان کو کون پڑھائے گا؟ اس طرح ان کی پڑھائی ادھوری رہ جائے گی۔ ماسٹر جی کی بیوی جب ان نظموں کو پڑھتی ہے تو ان کی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آتا۔ وہ دونوں سہیلیاں اس بات کا ذکر اپنے ایک کزن سے کرتی ہیں تو وہ کہتا ہے کہ یہ ساری نظمیں مجھے دے دو میں آپ کی پریشانی کا کوئی حل تلاش کرتا ہوں۔ وہ ساری نظمیں ان سے لی کر ضائع کر دیتا ہے۔ وہ ان نظموں کا کچھ بھی نہیں کرتا۔ اس کے برعکس جب ان کی باتیں سنتا ہے تو ان کو تسلی دیتا ہے کہ تمہارے ماسٹر صاحب زہر ہرگز نہیں کھائیں گے، یہ پکی بات ہے۔ چنانچہ ماسٹر جی ایسے گم ہوتے ہیں کہ ایک عرصے تک ان کا کوئی نام و نشان نہیں ملتا۔ کافی وقت گزر جانے کے بعد ایک دن دونوں سہیلیاں بازار جاتی ہیں تو اچانک ماسٹر جی بھی بازار جا رہے ہوتے ہیں۔ ان کا وہ کزن اور بچیاں بھی بازار میں موجود تھیں۔ ان کا کزن بچیوں کو بتاتا ہے کہ وہ دیکھو تمہارے مرے ہوئے ماسٹر جی جا رہے ہیں۔ افسانے کا اہم فنی پہلو ہمیں بتاتا ہے دونوں سہیلیاں اپنے ماسٹر جی میں تمام تر برائیاں دیکھتے ہوئے بھی اس کی بھرپور عزت افزائی کرتی ہیں۔

اس افسانے میں اگرچہ ۴، ۳ کردار موجود ہیں استاد جی کا کردار نئے دور کے اساتذہ کی عکاسی کرتا ہے اور یہی نہیں بلکہ اس کردار کے اندر انسانی نفسیات بھی جھلکتی نظر آتی ہے اور ایک طرح سے جب اپ لڑکیوں کو پڑھائیں گے تو فطری عمل کے تحت محبت کے جذبے میں ضرور مبتلا ہو جائیں گے۔ چنانچہ استاد کا کردار بنیادی طور پر اسی حوالے سے زیر بحث لایا گیا ہے، جبکہ بچیوں کا کردار بطور ایک طالب علم کے دکھایا گیا ہے جنہیں انگریزی اچھی طرح نہیں آتی۔ نیز استاد انہیں اپنی لکھی ہوئی نظمیں دیتا ہے جو دراصل اس کی محبوب یا محبوبہ طالبہ کے لیے لکھی گئی ہیں لڑکیاں شعری ذوق نہ رکھنے کی وجہ سے نہیں جان پاتی کہ ان نظموں کا مطلب کیا ہے اور انہیں کیوں دی جا رہی ہے۔ استاد اس بات پر مصر ہے کہ وہ اس کو سمجھیں اسی طرح ایک اور کردار اس نوجوان کا فراط ہے جو تمام نظمیں لے کر گیا اور ان کو ضائع کر دیا۔ یہ معاشرے کہ ایک ایسے فرد کا کردار ہے جو عقل سے بے بہرا ہے اور علمی شعور سے تہی ہے۔ اسی طرح اس

افسانے کا پلاٹ بہتر ہے۔ بہت اعلیٰ نہیں کہہ سکتے۔ اس افسانے کے اندر انسانی نفسیات کا بہت زیادہ عمل دخل ہے۔ پھر جو عمروں کا اختلاف ہوتا ہے اس کو واضح کیا گیا ہے جزیات بیان نہیں کی گئیں۔

۱۵۔ صاحب بہادر- پرکاش کرشن

صاحب بہادر، پرکاش کرشن کا تحریر کردہ افسانہ ہے جس میں ماضی کے افسران اور ان کے کردار کی جھلک دلچسپ انداز میں دکھائی گئی ہے۔ یہ افسانہ ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ، مارچ ۲۰۱۸ء میں شائع ہوا ہے۔ اس افسانے میں سرکار کے مختلف افسروں کی عادات کی کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے ایک ضلع دار کے بارے میں تحریر کیا گیا ہے کہ وہ کسی تعزیہ کے جلوس پر دو فریقوں کے مابین جب صلح کراتا ہے تو ان کو کسی جوہڑ میں لے جا کر دونوں کی گردنیں آپس میں ٹکراتا ہے اور جوہڑ کے کنارے پر کھڑے سب لوگ اور لیڈروں سمیت سینکڑوں افراد یہ عبرتناک اور مضحکہ خیز تماشہ دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ایک ڈپٹی کمشنر کی عادات کے حوالے سے بتایا کہ وہ قومی خزانے کو کس طرح فائدہ پہنچاتے تھے۔ وہ سارا دن فائلیں جمع کرتے رہتے تھے اور شام کو تمام فائلوں کو اُٹھا کر دریا برد کر دیتے تھے۔

ایک واقعہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ بھارت کے آزاد ہونے کے بعد جب افسروں کا امتحان ہوتا ہے تو امتحان کے لئے جس افسر کو نامزد کیا جاتا ہے وہ سرعام دوسرے افسروں کو نقل کرواتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ تمہارا حق ہے۔ اس واقع کو کتنے خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے:

> ”بھارت کے آزاد ہونے پر کچھ بڑے افسروں کا ایک شعبہ جاتی امتحان اردو زبان میں ہوا۔ ایک حاکم ضلع نے پرچے کو مشکل سمجھتے ہوئے دوسرے حاکم ضلع سے مدد چاہی۔ اس نے اپنا پرچہ حل کرنے کے لیے پہلے حاکم ضلع کو دے دیا۔ نگران نے یہ حرکت دیکھی اور حاکم ضلع سے وضاحت چاہی کہ اس نے اپنا پرچہ حل کرنے کے لیے دوسرے کو کیوں دے دیا۔ حاکم ضلع نے نگران کو صاف صاف بتا دیا کہ اس نے اپنے ساتھی کو پرچہ حل کے لیے دیا ہے نگران نے اپنے نگران اعلیٰ کے سامنے پیش کیا جو خود ایک ضلع کے حاکم اور کمرہ امتحان میں اس وقت ایک کتاب پڑھنے میں مصروف تھے۔ نگران اعلیٰ نے کتاب سے نظریں اٹھا کر دیکھا اور کہا کہ پھر کیا ہوا اپنے ہی بھائی ہیں نقل کرنے دو تمہارا کیا جاتا ہے“۔ (۱۷)

احمد سرہندی ایک ضلع کے کمشنر کو ایک بار کسی نے اطلاع دی کہ مالک کا نام لے گئے اور وہاں پہ پلیٹ فارم پر سفید رنگ کا ایک خوبصورت ڈبہ دیکھا اور میں نے اصرار کیا کہ اس ڈبے کو گاڑی کے ساتھ لگا دیا جائے تاکہ میں اس میں سفر کرنا چاہتا ہوں۔ جب ریلوے والے نہ مانے تو انھوں نے اپنے ملازمین سے کہا کہ ریلوے کی پٹڑی اکھاڑ دیں جب ریلوے اسٹیشن والوں نے یہ منظر دیکھا تو انھوں نے چپ چاپ وہ ڈبہ گاڑی کے ساتھ لگا دیا۔ اسی طرح کا ایک واقع حاکم ضلع کے بارے میں بتاتے ہیں کہ وہ اپنی بیوی سے ناراض ہو کر تلخ کلامی کے بعد درخت پر چڑھ گیا اور بیوی کو دھمکی دی کہ وہ درخت سے چھلانگ لگا دے گا، اگر اس نے اپنی عادت نہ بدلی اس نے واقعی درخت سے چھلانگ لگا دی اور اپنی ٹانگیں تڑوا بیٹھا۔ جب ہسپتال سے صحت یاب ہو کر گھر آیا تو اس کی بیوی کی عادات پھر ویسی کی ویسی ہی تھیں۔

اسی طرح ایک اور حاکم ضلع کے بارے میں بتایا کہ وہ بہت کنجوس تھا اور جب اس نے اپنی حکومت بنا لی تو وہ ہاتھی پر سوار ہو کر خود بازار گیا کہ اگر وہ حجام کو گھر میں بلائے گا تو اس کا خرچہ زیادہ ہو گا۔ چنانچہ وہ بازار جا کر حجام سے بال بنوائے گا تاکہ خرچہ کم ہو۔ جب وہ بازار گیا تو ایک سڑک کنارے حجام کے پاس بیٹھ گیا اور بال بنوانے لگا۔ اس طرح مہاوت اس کو بُری نظروں سے دیکھتا رہا اور وہاں سینکڑوں لوگوں نے حاکم ضلع کو سڑک پر بیٹھ کر ایک معمولی حجام سے بال کٹواتے دیکھا۔ ہمارے معاشرے میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب کسی کے پاس اختیار آجاتا ہے تو وہ اس کا ناجائز استعمال شروع کر دیتا ہے۔

اس افسانے میں بہت سے کردار شامل کیے گئے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس افسانے کی اساس جو کہانی بنائی گئی ہے۔ اس میں زیادہ پختگی نظر نہیں آتی اور گٹھا ہوا پلاٹ بھی نظر نہیں آتا ہے۔ ااس افسانے میں کہیں تو کہانی حقیقت پر مبنی نظر آتی ہے اور کہیں ایسی صورتحال نظر آتی ہے جیسے اس کہانی کے اندر حقیقت موجود ہی نہ ہو۔ اسی طریقے سے اس افسانے کے اندر اگرچہ مصنف نے یا افسانہ نگار نے جزیات بیان کرنے کی کوشش کی ہے لیکن وہ جزیات نگاری بھی بہتر طور پر نبھا نہیں سکا۔ اسلوب رواں ہے سلیس ہے بہتر ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ادبی سے زیادہ ایک ڈائجسٹ کا اسلوب ہے۔ زیادہ بہتر ہو گا۔ یہ ایک ایسی کہانی ہے جو محض ڈائجسٹ کے لیے لکھی گئی ہے۔ اسے کسی اعلیٰ پائے کی کہانی یا افسانے میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس افسانے میں کہیں کہیں ہمیں انسانی نفسیات کی جھلک نظر آتی ہے۔ افسانہ نگار بیوی کے حوالے سے بات کرتا ہے کہ ایک شخص بیوی سے تنگ آ کر بلندی سے چھلانگ لگا کر خودکشی کی کوشش کرتا ہے۔ چھلانگ مارتا تھا اور ٹانگیں تڑوا بیٹھتا ہے، جبکہ بیوی کے حرکتیں وہیں کی وہیں رہتی ہیں۔ اور ان

میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ اس افسانے میں کہیں پر کوئی نفسیاتی حوالہ بہتر طور پر موجود نہیں ہے۔ اس افسانے میں افسر شاہی کا کردار بہت بہتر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ عام طور پر معاشرے کے اندر افسر شاہی اس طرح ہوا کرتی ہے۔ مذکورہ افسانے میں فنی پہلوؤں کی پاسداری کرتے ہوئے حدِ اعتدال میں رہنے کے لیے خوبصورتی سے بیان کیا گیا افسانہ ہمارے معاشرے میں بڑوں میں بگاڑ پیدا کرنے کی کیا کیا ترغیب بتاتا ہے۔

۱۶۔ صبح کے خوش نصیب-انتظار حسین

انتظار حسین اُردو ادب کا ایک اہم نام ہیں۔ وہ افسانہ نگار اور ناول نگار بھی ہیں۔ اُن کی تحاریر اُردو ادب میں اہمیت کا درجہ رکھتی ہیں۔ اُن کی تمام تحاریر کسی نہ کسی اہم سماجی موضوع کی وضاحت کرتی ہیں۔ صبح کے خوش نصیب، انتظار حسین کا ایک دلچسپ اور شاہکار فن پارہ ہے جو ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ، اپریل ۲۰۱۹ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ اِس افسانے میں مصلحت سے بے خبر تقدیر کے شاکی کی خوش بختی کا ماجرا بیان کیا گیا ہے۔ افسانے میں بتایا گیا ہے جس چیز کو ہم کو نعمت سمجھ رہے ہوتے ہیں بعض اوقات وہ ہمارے لیے ایک ایسی وبال بن جاتی ہے کہ ہم نہ تو اس سے نفرت کر سکتے ہیں، نہ گلہ شکوہ کر سکتے ہیں۔ اس نعمت کا شکر بھی ادا نہیں کر سکتے۔ اس طرح تذبذب کا شکار ہو جاتے ہیں کہ اب اس کے لیے تشکر یا نفرت دونوں میں کون سے الفاظ استعمال کیے جائیں۔ یہ فیصلہ کرنا ہمارے لیے بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر سوائے پچھتانے کے اور کوئی چارہ کار نہیں رہتا ہے، نہ ہی کوئی چیز ہاتھ آتی ہے۔ مذکورہ افسانے میں بھی ایک پسنجر ٹرین کے بارے میں بڑی تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ جب ریلوے اسٹیشن پر ٹرین آتی ہے تو سب لوگ اس کو ایک نعمت سمجھ کر ایک دوسرے کو پیچھے دھکیلتے ہوئے آگے بڑھ کر اس پر سوار ہو کر سب سے پہلے سیٹ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو نیچے گرا کر آگے بڑھنے کی کوشش میں دوسروں کے انسانی حقوق تک پامال کر جاتے ہیں۔ لیکن ان کو کیا پتہ ہوتا کہ یہ سفر ہی ان کے لیے وبال جان بن جائے گا۔ اس بات کا اندازہ ان کو اس وقت ہوتا ہے جب شام تک گاڑی اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔ جب ان کو اس سفر میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تو سب مسافر بہت زیادہ پریشان ہو جاتے ہیں اور پچھتاتے ہیں کہ کاش وہ اس ٹرین میں سوار ہی نہ ہوئے ہوتے۔ یہ ٹرین ان سے کسی نہ کسی طرح چھوٹ ہی گئی ہوتی۔ انتظار حسین اس ماحول کی منظر کشی کچھ اس طرح سے کرتے ہیں :

"پسنجر ٹرین کی خرابیاں اب ان پر کھل رہی تھیں۔ سوار ہوتے وقت تو وہ انہیں بڑی نعمت نظر آ رہی تھی۔ پلیٹ فارم پر کتنا ہجوم تھا۔ کتنی دھکم پیل کے ساتھ وہ گاڑی میں گھس رہے تھے اور سیٹ لینے کے لیے ایک دوسرے کو دھکیل رہے تھے۔ ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے۔ جو اندر داخل ہو گئے تھے ان کی سر توڑ کوشش تھی کہ اب کوئی اندر نہ آئے، جو باہر رہ گئے تھے وہ سر توڑ کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح اندر داخل ہو جائیں۔ اندر داخل ہو جانے والوں نے کتنی پھرتی سے اپنے ڈبے کے دروازے بند کیے تھے اور بعد میں آنے والوں نے کتنے زور کے ساتھ دروازے کھلوائے تھے"۔ (۱۸)

ان مسافروں کو اس وقت ٹرین کی خرابیوں کے بارے میں اگر معلوم ہو جاتا تو شاید اس میں بیٹھنے کی کوشش بھی نہ کرتے اور جو لوگ اس میں سوار نہیں ہو سکے تو وہ ان کو خوش نصیب سمجھتے تھے اور اپنے آپ کو بدنصیب شمار کر رہے تھے۔ افسانے کا فنی لحاظ سے تجزیہ کیا جائے تو احساس ہو گا کہ جس بات کو بعض اوقات ہم اپنی خوش بختی سمجھ رہے ہوتے ہیں، وہی ہمارے لیے وبال جان بن جاتی ہے۔

اس افسانے میں عام انسانی مسئلے کو سیر بحث لایا گیا ہے۔ اس افسانے میں کہانی عام معاشرتی زندگی سے لی گئی ہے۔ انتظار حسین کا پلاٹ بہت شاہکار ہوتا ہے۔ وہ افسانے کے منجھے ہوئے کہانی کار ہیں۔ تاہم یہ بات بڑی حقیقت پر مبنی ہے کہ انہوں نے انسانی نفسیات کو بہت اعلیٰ انداز میں بیان کیا ہے۔ انسان بعض اوقات کسی بات کو اپنے لیے سود مند خیال کرتا ہے جب کہ انسان کے لیے سود مند کبھی ہوتی ہے اور کبھی نہیں ہوتی۔ انسان مخمصے کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس افسانے کے اندر انسان کے اسی نفسیاتی حوالے کو یا نفسیاتی فطرت کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کے اندر اگر دیکھا جائے تو بنیادی کردار ٹرین ہے جس میں لوگ دھکم پیل کرتے ہوئے داخل ہوتے ہیں اور پھر انہیں یہ سمجھ نہیں آتی کہ یہ ان کے لیے خوش بختی ہے یا خوش بختی نہیں ہے۔ گویا کہ اس افسانے میں کردار بہت زیادہ نمایاں اور واضح نہیں۔ اس افسانے کا اسلوب انتظار حسین کے بہت سے دوسرے افسانوں سے مختلف ہے۔ انتظار حسین علامت، استعارہ، تمثال سے کام لیا کرتے ہیں۔ ماضی پرستی ان کے ہاں نمایاں ہے۔ ہجرت کا تجربہ ان کے ہاں اکثر نظر آتا ہے لیکن اس افسانے میں ایسا کچھ نہیں ہے بلکہ حالاتِ حاضرہ کا ایک مسئلہ بیان کیا گیا۔ گویا اس افسانے میں زمان و مکان کے اثرات یا زمان و مکان بھی موجود ہے، معاشرہ موجود ہے اور کہانی کسی دور کے معاشرے کی نہیں بلکہ ہندوستانی معاشرے کی ہے۔ جزئیات ہر جگہ

موجود ہیں کیوں دیکھا جائے تو اسلوب سلیس ہے، ادق نہیں ہے، پیچیدہ نہیں ہے، کہیں بھی کہانی پن کے اندر پیچیدگی نہیں ہے۔

۱۷۔ بریک ڈاؤن-ڈاکٹر محمد علی

ڈاکٹر محمد علی ۱۹۳۸ء میں پیدا ہوئے۔ اُردو زبان کے ماہر نقاد اور محقق ہیں۔ پہلے ایشائی اور پاکستانی نقاد ہیں۔ انہوں نے بہت سی کتابیں بھی تحریر کیں۔ ۲۰۰۳ء میں پرائڈ آف پرفارمنس اور ۲۰۱۰ء میں ستارہ امتیاز ملا۔

بریک ڈاؤن، ڈاکٹر محمد علی کی افسانوی کہانی ہے جو ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ، اپریل ۲۰۱۹ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس کہانی میں بتایا گیا ہے کہ اعصابی تناؤ ہمارے جسم اور روح کے لیے ایسے روشندان کھول دیتا ہے کہ ہم خوشیوں سے لطف اندوز تو ہوتے ہیں لیکن اگر یہی روشندان بڑے بڑے دروازے بن جائیں تو کس قدر نقصان دہ ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ ہماری صحت یہ حادثہ یا دباؤ برداشت نہیں کر سکتی۔ دور جدید میں تیزی سے پھیلتے مرض کے متعلق ایسی کہانیاں کہ جن کو ڈاکٹر محمد علی بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ انہیں سمجھ نہیں آتی تھی کہ ان کا چہرہ خوبصورت کیوں نہیں رہتا، آنکھیں بیمار اور وہ اعصابی تناؤ کی وجہ سے وہ دنیا سے بیزار ہو گئے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا کا سب کچھ میرے پاس تھا صرف اور صرف ٹینشن کی وجہ سے میرے اندر چڑچڑا پن پیدا ہو گیا تھا۔ میں ہر وقت اس صورتحال سے دوچار رہتا تھا کہ ابھی پتہ نہیں کیا ہونے والا ہے۔ میں نے اپنی صحت کی وجہ سے اپنا شہر بھی تبدیل کیا لیکن میں نے دیکھا کہ مجھے پھر بھی سکون حاصل نہ ہوا۔ سارے لیبارٹری ٹیسٹ کروائے مگر کہیں بھی کسی بیماری کا کچھ پتہ نہ چلا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری صحت اس تیزی سے گر رہی تھی کہ میں بہت جلد موت کے منہ میں جا رہا ہوں۔ وہ اپنی سرگزشت میں بیان کرتے ہوئے اس طرح کہتے ہیں:

> " اعصابی تناؤ نے مجھے چاروں شانے چت کر دیا تھا۔ میں نڈھال ہو چکا تھا۔ جس طرح شیشہ افتاد زمانہ سے رگڑ کھا کر نہایت پتلا ہو جائے اور پھر کرچی کرچی ہو جائے، اسی طرح میرے دل، دماغ اور روح، بکھر گئے تھے۔ مسلسل درد ہڈیوں میں گودے کے اندر تک اترتا محسوس ہوتا۔ مسلسل بے خوابی اور پھر کالی سیاہ رات جیسی مایوسی یا ڈپریشن "۔ (۱۹)

جب وہ ڈاکٹر سے ملتے ہیں تو ڈاکٹر ان کو بہت تسلی دیتا ہے۔ وہ ان کی مرض کو سمجھ جاتا ہے اور کہتا ہے آپ بہت جلد انشاءاللہ ٹھیک ہو جائیں گے۔ وہ اس کے ساتھ اس طرح سے مخاطب ہوتا ہے:

> ”ڈاکٹر صاحب کی ہمدردانہ باتوں نے میرے اندر ایک نئی امنگ اور جذبہ پیدا کر دیا۔ میرے جسم و جان نے تیرا ساتھ کیوں چھوڑا مجھے اس کی فکر رہنے لگی۔ میں نے اعصابی تناؤ کے بارے میں مزید علم حاصل کرنا شروع کر دیا۔ کتابیں پڑھیں ڈاکٹر صاحب سے مشاورت کی اور میں ٹھیک ہو گیا“۔ (۲۰)

اس طرح وہ ہمیں اپنے تجربات بتاتے ہیں کہ ہم ڈپریشن کو اپنے اوپر کبھی بھی حاوی نہ ہونے دیں۔ کسی بات کو اس انداز میں نہیں لینا چاہیے کہ آپ کا بلڈ پریشر زیادہ ہو جائے یا آپ کو اور کوئی مرض لاحق ہو جائے۔ زندگی میں اس طرح کی دنیاوی پریشانیاں آتی جاتی رہتی ہیں۔ اپنے آپ پر مکمل طور پر کسی پریشانی کو حاوی کر لیا جائے تو پھر اس سے جو بیماری انسان کے اندر لاحق ہوتی ہے وہ نکلنے کا نام بھی نہیں لیتی۔ ڈاکٹر صاحب ہمیں چند ایک طریقے اور غذائیں بھی بتاتے ہیں کہ جن کے استعمال کرنے سے ڈپریشن پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ سبزیاں، پھل، دودھ پولٹری اور مچھلی وغیرہ کھانے اور ورزش کو اپنی باقاعدگی سے اپنایا جائے تو گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ آپ جتنے بھی ڈیپریشن میں ہوں اپنی سوچ کو درست رکھیں تو آپ انشاءاللہ ٹھیک ہو جائیں گے۔ افسانے کی یہ کہانی ہمیں بہترین زندگی جینے کا راز مہیا کرتی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ڈاکٹر محمد علی کے افسانے کی کہانی پر عمل کر کے اپنی زندگی کو سہل بنایا جا سکتا ہے۔

بریک ڈاؤن ڈاکٹر محمد علی کا نئے دور کا افسانہ ہے۔ اگر ۲۰۰ سال پہلے یا ۱۰۰ سال پہلے کہ انسان کا ذکر کیا جائے تو اس وقت اس طرح کی کہانی کا وجود میانہ ناممکن عمل تھا ڈپریشن دباؤ جدید اور کی کہانی ہے۔ جدید دور کی بیماری ہے اور اس حوالے سے انسان بہت سے مسائل اور مصائب کا شکار ہے۔ افسانے کی کہانی اتحاظ سے تعلق رکھتی ہے اسی طرح ڈپریشن کے نتیجے میں اور ہونے والی دنیا سے بیزاری کا نقشہ بہتر انداز میں کھینچا گیا ہے اس افسانے کے پلاٹ کو غور سے دیکھا جائے تو وہ بہت بہتر ہے اس کی بنت جامع تفقرانہ آغاز منتہی اور انجام پاؤ سوچ سمجھ کر ترتیب دیا گیا ہے۔ افسانے کے اندر غیر ضروری الفاظ سے وہ بوجھل پن پیدا نہیں ہونے دیا گیا۔ اس کہانی کا کردار بڑی محنت سے تخلیق کیا گیا ہے۔ ایک ایسا شخص جو ڈپریشن کا شکار ہوتا ہے وہ کن کن مصیبتوں سے اور مراحل سے گزرتا ہے۔ بہت بہتر طریقے سے کردار کے اندر کردار کے اندر زیر بحث لایا گیا ہے۔ اسی طرح مرکز کردار کے بعد ڈاکٹر کا کردار جو ایسے لگتا ہے

خود ڈاکٹر محمد علی کا کردار ہے۔ احسن انداز میں پیش کیا گیا ہے کردار نگاری پر محنت کی گئی ہے۔ اس افسانے کے اندر جزئیات نگاری موجود ہے جو کہ ایسے افسانے کی متقاضی بھی تھی ورنہ افسانے کے اندر حسن کی کمی رہ جاتی۔ افسانے کی بنت اعلیٰ انداز میں کی گئی ہے۔

۱۸۔ وحشتیں کیسی؟- آسناتھ کنول

وحشتیں کیسی؟، آسناتھ کنول کا افسانہ ہے۔ یہ افسانہ ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ، ستمبر ۲۰۱۹ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ مذکورہ افسانے میں ایک شاعرہ کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ افسانے کی کہانی میں بتایا گیا ہے کہ بعض اوقات ہم مستقبل کے سہانے خوابوں کا سوچ کر اپنے ذہن میں ایسے خوابوں کو سجا لیتے ہیں کہ جو کبھی حقیقت کا روپ نہیں دھار سکتے۔ لیکن پھر بھی ہم اُس اُمید کو اپنے ذہن میں بسائے رکھتے ہیں۔ وہ خواب کبھی پورا نہیں ہو سکتا لیکن نہ جانے کون سی ایسی چیز ہے جو ہم کو اُس وہم کو ہمارے ذہن سے نکلنے نہیں دیتی۔ اس افسانے میں بھی ایک ایسی ہی شاعرہ کی کہانی بیان کی گئی ہے جن کو ایک دن کسی صحافی شاعر کا فون آتا ہے اور وہ شاعرہ سے کچھ غزلیں بھیجنے کی فرمائش کرتا ہے۔ جب کچھ دن گزر جاتے ہیں تو یہ شاعرہ اس صحافی کو غزلیں نہیں بھیجتی تو وہ فون کر کے دوبارہ اس کو یاد کرواتا ہے اور اصرار کرتا ہے کہ اگر آپ کو غزلیں بھیجنے میں کوئی دشواری ہے تو وہ ان کے گھر آ کر ان سے غزلیں لے سکتا ہے۔ شاعرہ کو اس صحافی کی بات بہت بسند آتی ہے اور وہ دل میں دو باتیں سوچتی ہے۔ پہلے اپنے بارے میں سوچتی ہے کہ وہ کتنی بڑی شاعرہ ہے کہ جس کا کلام لوگ اتنا پسند کرتے ہیں اور اسی لیے یہ صحافی بار بار اس سے اپنی غزلیں بھیجنے کی فرمائش کر رہا ہے۔ وہ اس صحافی کے بارے میں سوچتی ہے کہ اس کا رویہ کتنا پُر خلوص ہے کہ وہ اس کی غزلوں کے لیے خود اس کے گھر تک آنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کر رہا۔ چنانچہ صحافی اس کے گھر پہنچ جاتا ہے اور اس سے بات چیت کر کے اس سے غزلیں لے جاتا ہے۔ اب ان کے درمیان ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ سلسلہ اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا جب ان کی بات نہ ہو۔ ہر روز اور ہر وقت ان کو ایک دوسرے کے پیغام کا انتظار رہتا ہے۔ اس کا نام مسٹر علی ہے اور وہ بھی شاعرہ سے محبت بھرے لہجے میں بات کرتا ہے۔ ملاقاتوں کے دوران وہ محبت کے بہت بڑے بڑے دعوے کرتا ہے۔ آخر کار ان کی محبت عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ اس کے بعد کافی دن جب مسٹر علی کا فون، کوئی پیغام نہیں آتا تو شاعرہ کو تشویش ہوتی ہے۔ افسانہ نگار نے اس کی اضطرابی کیفیت کو یوں بیان کیا ہے :

"پھر ایک دن اس کا فون نہیں آیا اس سے اگلے روز بھی نہیں آیا۔ چار دن گزر گئے۔ میں حیران بھی تھی پریشان بھی۔ پورے چار دن گزر گئے۔ اس کا دل ہی نہیں کیا کچھ بتانے کو، ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ تو اپنی ہر بات شیئر کرتا تھا۔ کھانے پینے سونے جاگنے، ملازمت پر آنے جانے ہر وقت کے حالات کا مجھے پتہ ہوتا تھا۔ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔ اب ایسا کیا ہوا تھا۔ میں نے اس سے گلہ کیا اس سے لڑی ناراض ہوئی مگر یہ کیا؟ میں اس سے ناراض تو رہ ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ ہنس کے منالیتا تھا اور میں ہمیشہ سے محبت اور توجہ کو ترسی عورت مان جاتی تھی"۔ (۲۱)

وہ اس کو فون کرتی ہے، پیغام بھجواتی ہے مگر کوئی رابطہ نہیں ہوتا۔ آخر کار جب کسی نہ کسی طرح اس سے رابطہ کر کے اس کی خیریت معلوم کرتی ہے تو اس وقت اسے انتہائی دکھ ہوتا ہے کہ اس نے کسی دوسری لڑکی سے شادی کر لی لیتا ہے، جس سے شاعرہ بہت رنجیدہ، پریشان ہوتی ہے اور اس کو صحافی سے رابطہ توڑنے میں بہت بڑی پریشانیاں، دشواریاں اور دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے حتیٰ کہ وہ ایسا رویہ اپنا لیتی ہے اور ڈپریشن کا شکار ہو جاتی ہے۔

"وحشتیں کیسی" افسانے میں افسانہ نگار نے بہت خوبصورت کہانی بیان کی ہے۔ افسانے کہ مرکز کردار دو ہیں ایک صحافی اور ایک شاعرہ دونوں اپنے اپنے انداز اور پس منظر کے لحاظ سے اعلیٰ تخلیقی کردار ہیں۔ حیرت انگیز طور پر افسانہ نگار نے کردار بہت احسن انداز میں بیان کیے ہیں۔ یہ ایک انتہائی باریک نقطہ ہے شاعر تصورات کے اندر رہتا ہے شاعر ایک جمالیاتی حسین اور رومانی دنیا کا باسی ہوتا ہے اور شاعرہ کا کردار اسی طرح کی رومانویت کی عکاسی کرتا ہے جبکہ صحافی عام طور پر خبر کی تلاش میں ہوتے ہیں وہ ہمیشہ اپنے اخبار کا پیٹ بھرنے کے لیے بھاگتے دوڑتے ہیں۔ چھوٹتے ہیں اور طرح طرح کی خبریں شاعری تعلیمی نظام کی خبریں نفسیات فلسفہ معاشرہ ہر ایک کی تلاش کرتے ہیں اور پھر اس کو پیش کرتے ہیں صحافی ناقابل اعتبار ہوتے ہیں اور اکثر صحافی باوفا نہیں ہوتے ان کا ان کی وفات صرف اپنے رزق کے ساتھ منسلک ہوتی ہے۔ یہاں اس افسانے میں دیکھتے ہیں کہ صحافی اچانک ایک شاعرہ کو چھوڑ دیتا ہے تو جس طرح کا اس کا پیشہ ہے اسی طرح اس نے یہاں پر اپنا کردار ادا کیا ہے۔ گویا کہ یہاں انسانی نفسیات کو بہت بہتر انداز میں بیان کیا گیا ہے انسان جو کتابیں پڑھتا ہے انسان جس پیشے سے منسلک ہوتا ہے اس کے اثرات لازمی طور پر اس انسان کے اوپر مرتب ہوتے ہیں اور یہی بات اس افسانے کے اندر فنی طور پر اعلیٰ طریقے سے بیان کی گئی

ہے۔ جہاں تک اس افسانے کے پلاٹ کا تعلق ہے تو اس کی بنت اچھی ہے اکٹھے ہوئے پلاٹ نظر آتا ہے اور انسان افسانے کے اندر اس حد تک ہو جاتا ہے کہ جب تک اسے مکمل پڑھ نہیں دیتا وہ اس جہاد سے چھوٹتا نہیں ہے۔ اس افسانے کے اندر رومانویت اور حقیقت پسندی پائی جاتی ہے۔ ایک طرف روحانی فضا اور دوسری طرف حقیقت پسندانہ نقطہ نظر ایک صحافی کی زندگی شاعرہ کی زندگی کے پس منظر میں ہمیں نظر آتا ہے۔ اس افسانے میں مردوں کی نفسیات بھی بیان کی گئی ہے۔ اہم طور پر مرد کا دل یہی چاہتا ہے کہ اسے دنیا کی ساری حسین عورتیں میسر آ جائیں اور اس افسانے کے اندر صحافی ایک مرد بھی ہے ایک لڑکی سے پیار کرتا ہے اور اور شادی ایک اور لڑکی سے کرتا ہے تو گویا کہ ہم مرد کی اس نفسیات کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ عام مشاہدے کی بات ہے کہ مرد کی زندگی اسی طرح حسن پرستی اور جمالیاتی ذوق کی آبیاری میں گزرتی ہے۔ اس لیے مشتاق احمد یوسفی نے کہا تھا کہ عورت کی بات کی جائے تو سب سے آخر میں اس کی زبان سے دم نکلتا ہے جبکہ مرد کی بات کی جائے تو سب سے آخر میں اس کی آنکھ سے دم نکلتا ہے۔ بہر حال اس افسانے کے اندر نفسیات بہت اعلیٰ انداز میں بیان کی گئی ہے پھر ایک اور بات انسان گنجلک ہے، انسان پیچیدہ ہے، شاعر جو معاشرے کی تیسری آنکھ کہلاتا ہے اور جو انسانی نفسیات کو سمجھنے کا دعوی کرتا ہے اور صحافی کی نفسیات نہیں سمجھ سکتا۔ پلاٹ گھٹا ہوا ہے۔ ڈھیلا ڈھالا نہیں ہے، اس افسانے کا اسلوب بہت ہی اعلیٰ ہے ،رواں ہے ، سلیس ہے اور اس کے اندر کسی قسم کا گنجلک پن ادب یا مشکل پسندی نظر نہیں آتی۔ افسانہ جدید دور سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے اندر شاعرہ جب پریشانی کی آخری حدوں کو چھو جاتی ہے تو ڈپریشن کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ صحافت اور ڈپریشن بنیادی طور پر جدید دور کی باتیں ہیں جدید دور کے موضوعات ہیں اور اس افسانے میں مصنف نے کہانی کا موضوع جدید زمانے سے منتخب کیا ہے۔ اگر اس افسانے کے مکمل تجزیہ فنی تجزیہ کرنا چاہیں تو یہ افسانہ بہر حال ایک بہترین افسانہ ہے۔ کہانی ، پلاٹ، کردار نگاری، نفسیات ڈپریشن سب کو اگر ایک تنظیم کے ساتھ سمجھنے کی اور بیان کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ افسانہ شاہکار افسانہ بُنتا نظر آتا ہے۔

ناول:

باب سوم کے دوسرے حصّے میں تینوں ڈائجسٹوں ماہنامہ "اردو ڈائجسٹ"، ماہنامہ "حکایت" اور ماہنامہ "سیارہ ڈائجسٹ" میں شائع ہونے والے قسط وار ناولوں کا فنی لحاظ سے تجزیاتی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ بھکاری شہزادہ-مارک ٹوین

بھکاری شہزادہ، مارک ٹوین کا ایک جیتا جاگتا ناول ہے جس میں دو شہزادوں کی عجیب و غریب کہانی بیان کی گئی ہے۔ یہ ناول ماہنامہ اردو ڈائجسٹ، جون ۲۰۱۷ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ اس ناول میں ایک سنسنی خیز داستان بیان کی گئی ہے۔ ناول کو پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انسان اگر چاہے کہ اپنی محنت اور جستجو سے بہت کچھ حاصل کر لے تو یہ محض اس کی خام خیالی ہے۔ تقدیر انسان کو فقیر سے بادشاہ بنا دیتی ہے اور بادشاہ سے فقیر۔ اس ناول میں بھی کچھ ایسی کہانی بیان کی گئی ہے۔ کہانی میں اصلی شہزادہ نقلی بن جاتا ہے جبکہ نقلی شہزادہ اصلی شہزادے کا روپ دھار لیتا ہے۔ لندن کی تنگ و تاریک گلیوں میں غربت و مصائب سے دوچار بیکاری لڑکے کو کیا پتہ تھا کہ وہ ایک دن اس ملک کا شہزادہ بن جائے گا۔ لندن میں ٹام مینٹن میں ایک لڑکا رہتا تھا اور وہ بھیک مانگ کر گزارہ کرتا تھا۔ اس کی شکل و صورت ولی عہد انگلستان شہزادہ ویلز سے بہت ملتی جلتی تھی۔ ایک دفعہ اتفاقاً دونوں کی ملاقات ہوتی ہے۔ شہزادہ محل کی پُر تکلف زندگی سے بہت بیزار ہوتا ہے اور وہ گمنامی کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ وہ لندن کی فضا میں آزادانہ گھوم پھر کر اپنی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ شہزادہ ویلز بھیس بدل کر گلیوں میں نکل آیا اور ادھر ٹام شہزادے نے چارلس کا قیمتی لباس پہن کر شہزادے کا روپ دھار لیا۔ شہزادے ٹام کو شہزادہ ویلز کے ظالم باپ نے پکڑ کر قید کر لیا۔ ادھر ٹام محل کے ماحول میں خود کو اجنبی محسوس کرنے لگا۔ اسے ہمیشہ خوف رہتا تھا کہ جب کبھی بادشاہ کو اس کی حقیقت معلوم ہو جائے گی تو وہ اسے قتل کروا دے گا۔ جبکہ تمام سلطنت میں شہزادہ ٹام ہی زیر گفتگو رہتا تھا۔ اچانک دربان کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس نے بلند آواز سے پکارا کہ شہزادیاں لیڈی جین گرے اور لیڈی ہیلتھ شہزاد سے ملاقات کرنا چاہتی ہیں۔ یہ سنتے ہی ٹام کینٹی بوکھلا گیا۔ وقت گزرتا رہا کہ اچانک وہاں کے بادشاہ کا انتقال ہو گیا۔ اب شہزادہ ٹام کنٹی کو پوری سلطنت اپنا بادشاہ بنانا چاہتی تھی۔ چنانچہ تاج پوشی کی تمام تر تیاریاں مکمل کر لی گئیں۔ لیکن شہزادہ ٹام کینٹی کے دل میں ایک خوف تھا۔ وہ شاہی لباس پہننے سے انکار کرنا چاہتا تھا لیکن آخر سب لوگوں نے اکٹھے ہو کر شاہی لباس زیب تن کروا کر حلف برداری کی تقریب کے لیے چرچ میں سب جمع ہو جاتے ہیں۔ جب اسے تاج پوشی کی تقریب کے لیے لے جا رہے تھے تو راستے میں اس کی والدہ سے ملاقات ہوتی ہے۔ شہزاد ٹام چاہنے کے باوجود اپنی والدہ سے ملاقات نہیں کر پاتا۔ اس کی والدہ اس کے قریب آتی ہے تو اسے دربان پکڑ کر نہ صرف دور کر دیتے ہیں بلکہ شہزادہ ٹام سے پوچھتے ہیں کہ آپ اجازت دیں تو اس بڑھیا

کو مار دیا جائے کہ یہ شاہی تقریب کے راستے میں خوامخوار کاوٹ بنتی جارہی ہے۔ شہزادہ ٹام کو حلف برداری کی تقریب کے لیے لے جایا جارہا ہوتا ہے جس کا ذکر ناول میں یوں کیا گیا ہے:

"جب بھی ٹام کو کرم کرم کی آواز آتی ہے تو وہ سکوں سے بھرے تھال سے مٹھی بھر کر سکے اٹھاتا اور عوام کی جانب اچھال دیتا۔ ایک محافظ یہ تھال اٹھائے اس کے ساتھ ہی چل رہا تھا۔ خوشی و مسرت سے ٹام کے گال تمتمارہے تھے۔ اچانک اس کی نگاہیں ایک چہرے پر پڑیں تو وہ پریشان ہو گیا۔ یہ اس کی محبوب ماں کا چہرہ تھا وہ اسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے وہ لوگوں کا ہجوم چیرتے ہوئے بڑھی اور کہنے لگی میرے پیارے بچے میرے پیارے بچے وہ ٹام کے قریب پہنچنا چاہتی تھی مگر شاہی محافظوں نے اسے پکڑ کر دھکا دیا تو وہ دور جا گری۔ ٹام مجبور تھا کہ وہ اس عورت اپنی ماں کو پہچاننے سے انکار کر دے۔ اس کے لیے اجنبی بن جائے مگر ماں سے بے اعتنائی برتنے بلکہ دھوکہ دینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی ساری خوشی کافور ہو گئی۔ تنی ہوئی چھاتی میں جھکاؤ پیدا ہو گیا۔ شاہی سطوت کے تمام آثار جاتے رہے۔ اس کے چہرے پر شرمندگی کا پسینہ جھلملانے لگا۔ تمام مسرتیں شیشے کی طرح کرچی کرچی ہو گئیں"۔ (۲۲)

شہزادہ ٹام دل ہی دل میں پریشان ہو جاتا ہے اور جب تاج پوشی کی رسم شروع ہوتی ہے تو اچانک وہاں پر اصلی شہزادہ آجاتا ہے اب وہاں پر موجود تقریب میں سارے لوگ مخمصے میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اصل شہزادہ ان میں سے کون سا ہے۔ چنانچہ لوگ دیکھتے ہیں کہ پرانے کپڑوں میں ملبوس ایک لڑکا ٹام کی جانب بڑھ رہا ہے۔ لوگ اس بیکاری نما لڑکے کو بازو سے پکڑ کر شاہی تقریب سے دور کر دیتے ہیں۔ پھر وہاں پر موجود بادشاہ کے وزیر ولیج شہزادے کو بادشاہ کے بارے میں بہت سے سوالات کرتے ہیں ان میں سے ایک ایک کر بہت سے سوالوں کے جواب شہزادہ ولیج دیتا رہا۔ آخر کار اس سے سرکاری اُمور کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے تو وہ اس کا بھی درست جواب دے دیتا ہے تب وہاں موجود لوگوں کی سمجھ میں آتا ہے کہ جو امور سلطنت کے اتنے پیچیدہ سوالوں کے جواب دے سکتا ہے۔ یہی اصل شہزادہ ہو سکتا ہے۔ شہزادہ ٹام کینٹی نے تو ایسے ہی جعلی شہزادے کا روپ دھار رکھا ہے۔ اب اصل بادشاہت ولیج شہزادے کو مل جاتی ہے۔

اس ناول کے اندر اگرچہ بہت زیادہ کردار نہیں ہیں لیکن اس کا تجسس کرداروں کی پیشکش پلاٹ کہانی موضوع اور زمان و مکاں اسے ایک دلچسپ اور پر تجسس ناول میں بدل دیتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ناول میں تقدیر بھی بطور ایک کردار شامل ہے شہزادہ ویلز جو کہ دراصل حقیقی شہزادہ ہے۔ وہ لندن میں اپنے محل کی زندگی سے یا دوسرے الفاظ میں قید خانے کی زندگی سے تنگ آچکا ہے خوش قسمتی یا بد قسمتی سے ایک بھکاری کی شکل شہزادے کے ساتھ مل جاتی ہے اور شہزادہ لندن میں گھومنے کے لیے آزادانہ طور پر گھومنے کے لیے بھکاری کے لباس زیب تن کر لیتا ہے اور بھکاری شہزادی کی لباس میں بدل جاتا ہے یہاں تقدیر عجیب کھیل کھیلتی ہے۔ ایک شخص جو پیدائشی طور پر شہزادہ ہے۔ وہ بھکاری بن جاتا ہے اور ایک شخص جو بھکاری ہے۔ وہ شہزادہ بن جاتا ہے۔

اگر فنی حوالے سے اس ناول کا جائزہ لیا جائے تو اس ناول کا موضوع یا اس ناول کی کہانی بہت مختلف ہے ادویات عالم میں اس کہانی کا موضوع اور اس کی پیشکش بہر حال بہت جدت کی اور تنوع کی حامل ہے۔ ایسی کہانیاں داستانوں میں تو مل جاتی ہیں لیکن ناول میں یا حقیقی زندگی میں ان کا وجود کم ہی نظر آتا ہے۔ پھر یہ کہ ایسا موضوع جو عامیانہ نہیں ہے جو خاص ہے، اہم اور تنوع لیے ہوئے ہے، اس کو نبھانا شروع سے آخر تک آسان کام نہیں تھا لیکن مارک نے اس کو نبھایا ہے یہی نہیں بلکہ کردار نگاری بھی کمال پر نظر آتی ہے۔ ایک طرف وہ شخص جو بنیادی طور پر بھکاری ہے اور قسمت کے چکر میں وہ شہزادہ بن جاتا ہے اور اس کے بعد اس پر بیتنے والا جو نفسیاتی عمل ہے، یہ شعور ہے، وہ اپنے پڑھنے والے کو دلچسپی قائم رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ ایک ایسا شخص جو دراصل شہزادہ نہیں ہے بلکہ اس کا بہروپ بھرے ہوئے ہے وہ کس طرح پل پل زندگی اور موت کے درمیان سے گزرتا ہے اور اس پر کس طرح کی نفسیاتی کیفیات وارد ہوتی ہیں۔ زندگی اور موت کے درمیان زندگی بتانا آسان کام نہیں ہے اور اس کردار میں دیکھتے ہیں کہ شروع سے آخر تک جب تک کہ اس سے منصب سے ہٹا نہیں دیا جاتا۔ وہ اسی کشمکش میں زندگی گزارتا ہے ۔ اس کردار میں بے پناہ ارتقا پایا جاتا ہے۔ یہ کردار اگرچہ بھکاری تھا لیکن شہزادہ کا بہروپ بھرنے کے بعد اس نے بہت کچھ بہت کم عرصے میں سیکھ لیا اور لوگوں کے لیے پہچاننا مشکل ہو گیا کہ اصل شہزادہ کون ہے؟ دوسری طرف شہزادہ ویلز ایک اور زندہ کردار ہے جو اپنی مرضی سے ستم ظریف زندگی کو قبول کرنے پر راضی ہو گیا اور لندن کی گلیوں میں گھومتا پھرا۔ یہ ایک ایسا کردار ہے جو ایک اور دنیا کا باسی ہے۔ اس کردار سے ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انسان کو کتنی ہی آسائشیں اور پر راحت زندگی میسر ہو۔ وہ اسے

میرے اوپر ہے قید خانہ قرار دیتا ہے۔ وہ آزاد زندگی گزارنے کا خواہاں ہوتا ہے کیونکہ انسان آزاد پیدا ہوا اور آزاد مرنا چاہتا ہے۔ اس کردار میں بہتر طریقے سے جانچ سکتے ہیں کہ شہزادہ یعنی ایک انسان اپنی آزادی کے لیے پر راحت زندگی قربان کرنے کو کیسے تیار ہو جاتا ہے حقیقتاً انسان جنگل کے زمانے سے ارتقا پذیر رہا ہے۔ چنانچہ جنگل کی تہذیب اب بھی اس کے اندر زندہ ہے اور وہ جنگل کی زندگی کی طرح آزاد زندگی کو ترجیح دیتا ہے۔ اس کردار کی بدقسمتی کو ہی نہیں دیکھتے بلکہ ہمارے سامنے وہ وقت بھی آتا ہے کہ جب یہ بیچارہ کردار دیکھتا ہے کہ میں جو اصل بادشاہ بننے والا تھا میں جو ولی عہد تھا۔ میری جگہ ایک اور بھکاری جو میرا ہم شکل تھا۔ وہ آج بادشاہ بننے کو تیار بیٹھا ہے، بھکاری اپنے اندر ٹوٹ رہا ہے اور اس وقت اس کی خوشی اس کا تنتنا اس کا جذبہ اور جوش ختم ہو جاتا ہے۔ جب ماں اس سے ملنا چاہتی ہے اور سپاہی اس کی ماں کو دھکے دے کر دور پھینک دیتے ہیں کہ پتہ نہیں کون عورت ہے جو شہزادے سے ولی عہد سے یا تقریب کے بعد متوقع بادشاہ سے ملنا چاہتی ہے اور اس کی ماں کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں یہ درد یہ غم دیکھ کر اس کے اندر بادشاہ بننے کا جوش و جذبہ اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔ اس سے بھی اس کردار کی توانائی اور ارتقا نظر آتا ہے۔ بعد ازاں شہزادہ ویلز اپنا مقام حاصل کر لیتا ہے لیکن ہمارے ذہن میں بھکاری شہزادے کا کردار مرتصم ہو جاتا ہے۔ ہمارے ذہن میں وہ ہمیشہ کے لیے قائم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اس ناول میں ماں اگرچہ تھوڑے سے وقت کے لیے آتی ہے لیکن اس کا کردار ہمیشہ کے لیے زندہ ہو جاتا ہے ۔ بادشاہ بھی بطور ایک کردار ہمارے سامنے آتا ہے اور وہ عام بادشاہوں کی طرح ظالم اور جابر بادشاہ کا روپ دھار کر ہمیں ملتا ہے اور اس سے قرون وسطہ میں کے زمانوں میں بادشاہوں کا انداز ہمیں نظر آنے لگ جاتا ہے۔ کہانی کے اندر شروع سے لے کر آخر تک تجسس موجود رہتا ہے۔ یہ مصنف کا کمال ہے کہ وہ ناول کے اندر ایسے ٹوسٹ لے کر آتا ہے ایسے موڑ لاتا ہے کہ قاری شروع سے آخر تک اس کو بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ پلاٹ بہتر ہے بلکہ بہترین ہے پلاٹ کے اندر جھول نہیں ہے اور کہانی کی بنت پلاٹ کی وجہ سے بہت ہی اعلیٰ پایا کی ہو گئی ہے۔ یوں پلاٹ میں جھول نہ ہونے کی وجہ سے گھٹا ہوا اور پلاٹ ہونے کی وجہ سے کہانی اور زیادہ توانا اور جاندار بن گئی ہے۔ اس ناول میں جہاں کہانی یا کردار موضوع پلاٹ تجسس اپنے اپنے مقام پر بہترین کردار ادا کر رہے ہیں ۔ کہانی کی بنت میں مصنف اپنا پورا زور صرف کر دیتا ہے۔ بھکاری شہزادہ میں منظر نگاری خوب ہوئی ہے یہاں ہم لندن ایک زندہ اور جیتا جاگتا لندن دیکھتے ہیں ہم بھکاری کو بھکاری اور پھر اس کے بعد شہزادے کے روپ میں جب دیکھتے ہیں تو ہماری آنکھوں کے سامنے

سے کتنے ہی منظر گزرتے ہیں اسی طرح اصل شہزادہ جب بھکاری کا لباس پہن لیتا ہے تو وہاں بھی منظر نگاری کمال کی ہے۔ ماں کو جب دھکہ دیا جاتا ہے اور وہ گرتی ہے اور اس کے آنسو نکلتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ وہ آنسو ہمارے دلوں پر آن گرے ہیں تو یہ جو کردار نگاری ہے۔ اور منظر نگاری خاص طور پر باکمال ہے۔ اس ناول کے اندر جزئیات نگاری اور محاکات نگاری بھی باکمال ہے۔ ہماری آنکھوں کے اندر شہزادوں لندن اس کی گلیاں اس کے مناظر چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ ایک تصویر نظر آتی ہے محاکات نگاری ہے اور جزئیات نگاری اپنے جوبن پر نظر آتی ہے۔ اس کہانی کے اندر نفسیاتی کش مکش کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔ انسان کیا ہے؟ انسان ایک گنجلک مشکل اور نہ سمجھ آنے والا عقدہ ہے اور اس ناول کو پڑھنے کے بعد یہ بات بہت بہتر طور پر ہم پر عیاں ہو جاتی ہے۔ ناول نگار لباس اور اس سے متعلقات کو جس طرح سے پیش کرتا ہے۔ یہ اسی کا حصہ ہے ناول کے اختتام قارئین کی منشا کے مطابق ہوتا ہے تاہم کہیں رحم بھی نظر آتا ہے اور جو ارسطو کا المیہ ہے۔ وہ بھی ہمیں یہاں پر جھلکتا ہوا نظر آتا ہے جب تک کہ اصل شہزادہ اپنے منصب پر فائض نہیں ہو جاتا۔ اس وقت تک ایک المیہ یا المیاتی کیفیت طاری رہتی ہے اور یہ المیہ کردار کا اصل شہزادے کا المیہ ارسطو کے المیہ کے مطابق ڈھلتا ہے۔ ہمارے اندر رحم پیدا ہو جاتا ہے جس وقت بھکاری کو منصب حکمرانی سے ہٹا دیے جاتا ہے تو ایک بار پھر ہمارے جذبات میں رحم اُبھرتا ہے۔ یوں ارسطو کا جو المیہ کا نظریہ ہے وہ بھی ہمیں یہاں پر واضح طور پر نظر آتا ہے ایک طرف نفسیات دوسری طرف ستوں کا المیہ نظر آتا ہے ہر لحاظ سے ایک بہترین شاندار اور اعلیٰ پایا کا ناول ہے۔

۲۔ تاروں بھری رات-سید وسیم رضا

تاروں بھری رات، سید وسیم رضا کا لکھا ہوا ایک انوکھا اور شاہکار ناول ہے۔ یہ ناول ماہنامہ حکایت کے جولائی، اگست ۲۰۱۷ء، مئی، جولائی، اگست اور ستمبر ۲۰۱۸ء کے شماروں میں قسط وار شائع ہوا ہے۔ اس ناول میں انسانی خوشیوں اور مسرتوں کو اُجاگر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ دنیا میں ہر ایک جاندار کی اپنی اہمیت ہے۔ دنیا میں جہاں کہیں بھی کسی جاندار سے زیادتی ہوتی ہے وہاں انسانیت کی تذلیل ہو رہی ہوتی ہے۔ انسان زمین کی ساری مخلوقات میں سب سے حساس ہے۔ ہم کسی خوشی کے موقع پر یا میلوں ٹھیلوں میں جانوروں کو تکلیف دے کر اپنی تفریح طبع کا سامان تو پیدا کرتے ہیں لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ جانور اس وقت کس اذیت سے گزر رہے ہوتے ہیں۔ انسان تو ان کے دکھوں کو محسوس نہیں کرتا مگر اس وقت حیوانوں کے

دل پر کیا گزرتی ہے۔ اس کا اندازہ ہمیں نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جشن بہاراں کے موقع پر جانوروں کو تکلیف دے کر ان کے ساتھ جو کھیل تماشار چایا جاتا ہے۔ رقاصہ ناہید یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتی اور اس کا دل اس پر کڑھتا ہے۔ اس کی پریشانی کو ناول میں کچھ اس انداز سے بیان کیا گیا ہے:

"میں اس مقام پر ہونے والے جشن بہاراں میں اپنا فن کیسے پیش کر سکتی ہوں جہاں ان بے زبانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی ہو۔ میں آپ کے جشن بہاراں میں اپنا فن پیش نہ کر سکوں گی۔ ناہید کے الفاظ نے سب کو دم بخود کر دیا ہے"۔ (۲۳)

ناول میں جابجا میلے کا سماں باندھا گیا ہے کہ اس سے ماحول کس قدر خوشگوار ہوتا ہے اور ہر طرف چہل پہل اور طرح طرح کے کھانوں کی خوشبو کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ لوگ میلوں میں کس طرح ذوق و شوق سے اپنی سواریوں، پبلک ٹرانسپورٹ اور خصوصی گاڑیوں کا اہتمام کر کے میلے میں شریک ہوتے ہیں۔ اس کی منظر کشی کی گئی ہے، اس کے علاوہ جو لوگ میلے میں پہنچ جاتے ہیں، وہ کس قدر سرور حاصل کرتے ہیں اور مزے لے لے کر ماحول سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس تمام ماحول کی منظر کشی کرتے ہوئے یوں بیان کیا گیا ہے:

"جب ملک کے باغ کے نزدیک پہنچے تو کھانوں کی خوشبو نے ہوا کے دوش پہ استقبال کیا۔ باغ کے نزدیک جا کے گاڑیاں اور تانگے رُکے اور سب نیچے اُترے۔ باغ روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ قالین بچھے ہوئے تھے، گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ دور بیٹھے سارندے اپنے ساز درست کر رہے تھے"۔ (۲۴)

ناہید جو اس ناول کا مرکزی کردار اور اس ناول کی ہیروئن بھی ہے اس کو میلے میں دیہاتی ماحول سے روشناس کراتے ہوئے دیہات میں میلوں کی صورت میں ہونے والے پروگراموں کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہاں کے لوگوں کی طبیعتوں میں کس قدر انکسار، سادگی اور محبت پائی جاتی ہے۔ کوئی ایک دوسرے کی محبت کا طلب گار ہوتا ہے اور ایک دوسرے پر جان نچھاور کرتا ہے۔ دیہاتیوں کی سادگی کی وضاحت کچھ اس طرح سے کی گئی ہے کہ وہ کسی عام بیماری کو بھی جدید دور کی سائنسی اختراع خیال کرنے لگتے ہیں۔ مذکورہ پیراگراف سے یہ بات اور واضح ہو جاتی ہے:

"دیکھیے ناہید جی اکثر دیہات میں لوگ اپنی سادگی اور سادہ لوحی کی بنا پر بہت سے ایسے مشاہدات و واقعات کو مافوق الفطرت کی درجہ بندی میں شمار کر لیتے ہیں جو کہ دراصل سائنسی طور پر قابل توجہ ہیں"۔ (۲۵)

ناول میں جگہ جگہ جادو ٹونا کرنے کے طریقے، اثرات اور قدیم زمانے کی فرسودہ رسوم کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ پرانے زمانے کے لوگ جب کہ سائنس نے بھی ابھی اتنی ترقی نہیں کی تھی، اگر کسی مریض کو کوئی ایسی بیماری لاحق ہو جاتی جو لوگوں کی سمجھ میں نہ آتی تو وہ اسے جادو ٹونے کا اثر قرار دیتے اور طرح طرح کی کرامات کو تلاش کرنے کا سوچتے رہتے کہ جس سے اس مریض کا علاج ممکن ہو سکے۔ ایسے ہی ایک ماحول کا ذکر کرتے ہوئے ناول کا درج ذیل پیراگراف ملاحظہ کریں:

"میرے سورہ ناس پڑھنے کی دیر تھی کہ پھوپھی نسیم نے اچانک ہی بے چینی سے روٹی کے ٹکڑوں کے پھورے کرنے شروع کر دیے۔ لیکن اتنی تیزی سے جو کہ ناقابل یقین تھا۔ انھوں نے لمحوں میں روٹی کے ٹکڑوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے کبوتروں کے سامنے پھینک دیئے۔ جیسے جیسے میں پڑھتا گیا پھوپھی نسیم کی بے چینی بڑھتی گئی"۔ (۲۶)

یہاں توہم پرستی کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ کچھ لوگ اپنے آپ کو روحانی پیر اور پیشوا ظاہر کرتے ہیں اور ہر بیماری کا علاج کرامات کے ذریعے کرنے کے دعویدار ہوتے ہیں حالانکہ ان کے پاس ایسی کوئی کرامات بھی نہیں ہوتیں۔ اس طرح کے روحانی پیروں، درویشوں اور ان کی کرامات کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ناول میں یوں بتایا گیا ہے:

"یہ سب قدرت کے کھیل ہیں ناہید جی۔ میں نے کہا مجھے کئی دفعہ یہ بات سننے کا موقع ملا کہ روحانی فقیر اور درویش کچھ ایسے عمل بھی کرتے ہیں کہ اِن کی روح پرندوں میں منتقل ہو جاتی ہے یا ان کے بدن کے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک ٹکڑا یہاں پڑا ہوتا ہے تو دوسرا کہیں اور۔ یا ان کو قید میں رکھا جائے تو تالے خود بخود کھل جاتے ہیں"۔ (۲۷)

روحانی پیروں فقیروں کے ساتھ ساتھ کچھ لوگ عوام کو بیوقوف بناتے ہوئے نظام شمسی کے ذریعے علاج کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ لیکن ناول کے آخری میں اس بات کی بھی تردید کی گئی ہے کہ یہ سارے

طریقہ کار اپنی جگہ لیکن اسلام نے جو تصور پیش کیا ہے اس میں سائنس، اجرام فلکی اور سب سے بڑھ کر اسلامی تصور کی پاس داری کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ہماری نجات کا واحد راستہ اسلامی تعلیمات میں ہی ممکن ہے۔ یہ حل کسی اور مذہب یا طریقہ کار میں ممکن نہیں ہے۔ جیسا کہ ناول کے اس پیراگراف میں ذکر کیا گیا ہے:

"یہ جو نظام شمسی ہے سائنس اور روحانیت کی دنیا میں اس کی تصویر بڑی گہری ہے۔ اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اس نظام شمسی کی جو تصویر چودہ سو سال پہلے اسلام نے پیش کر دی ہے، اب سائنس نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔۔۔۔ تو پھر ابھی سائنس اور مذہب کا ملاپ ہونا ہے۔ ہو گیا نا۔۔۔۔۔۔۔ گڈریے نے ناہید سے پوچھا۔۔۔۔ جی ہاں بالکل۔۔۔۔ ناہید نے خیالوں میں کھوئے ہوئے لہجے میں چونک کر کہا"۔ (۲۸)

ناول میں جابجا توہمات کے حوالے سے ذکر ہے۔ اس طرح ماحول اور اس پر اثر انداز ہونے والے رویوں اور انسانوں کی رسوم اور عادات کا بھی ذکر ملتا ہے۔ قدرتی مناظر جس طرح کہ ناول کے عنوان "تاروں بھری رات" میں اس بات کا تاثر ملتا ہے کہ اس میں بہت سی دیگر چیزوں کا حوالہ بھی ہو سکتا ہے۔ سائنس کے کرشماتی کارنامے اور ماقوف الفطرت خیالات بھی اس ناول میں بڑی آسانی سے دیکھے جاسکتے ہیں۔

یہ ناول ماہنامہ حکایت میں قسط وار شائع ہوتا رہا ہے۔ اس کے اندر ایک طرح کا ثقافتی پس منظر نظر آتا ہے۔ اور ایک معاشرہ جیتا جاگتا اور زندہ دکھائی پڑتا ہے اس یہی نہیں بلکہ اس ناول کے اندر زندگی کی محبتیں زندگی کی نفرتیں رحم دلی غصہ بہت سے جذبات اور احساسات جھلکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس ناول کے اندر ہمارے ہاں ہونے والے میلے ٹھیلے جشن اور ان کے اندر رقص و سروت نیز جشن بہاراں کے اندر ناچتے ہوئے جانور یہ طرح طرح کی سرگرمیاں نظر آتی ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس ناول کے اندر ثقافت اور تہذیب ثقافت کے متعلقات یہ تمام کچھ مل کر ایسے لگتا ہے کہ جیسے یہ ایک علیحدہ کردار کی صورت میں جلوہ گر ہو گئے ہیں اور یہ جلوہ گری پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور شروع سے آخر تک قاری اس فنی سرگرمی کی وجہ سے یا فنی خوبصورتی کی وجہ سے اس ناول کے اندر موجود رہتا ہے۔ ناہید کا کردار اعلیٰ کردار ہے اس سے پہلے کہ ایک اس طرح کہ ناول اردو زبان ادب کے اندر بہت کم لکھے گئے ہیں حقیقت تو یہ ہے کہ یہ ایک بہترین اور شاندار ناول ہے۔ اس کی کہانی اور کہانی کی بنت اس کا موضوع بہت زیادہ مختلف جاندار اور بہترین قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس ناول کے اندر جہاں ثقافت بطور

بھرپور کردار کے جلوہ گر ہوتی ہے اور قارئین اپنی گرفت میں لیے رکھتی ہے۔ وہیں پر ہمارے سامنے ایک اور بڑی مضبوط شاندار اور بہترین کردار ناہید کی صورت میں نظر آتا ہے۔ ناہید اس کردار کا مرکزی کردار ہے اور یہ کردار اتنا جاندار ہے کہ اگر کچھ لمحات کے لیے بھی اس کردار کو منہا کر دیا جائے تو ناول کی پوری عمارت دھڑام سے زمین بوس ہو جائے گی۔ اس ناول کے اندر ناہید اور کہیں تو رحم کے جذبات سے مغلوب کردار کی صورت میں ہمارے سامنے نظر آتی ہے جب وہ رقص کرنا چھوڑ دیتی ہے اور اس سے انکار کرتی ہے اس وجہ سے کہ جشن بہاراں میں جانوروں کو قید کیا ہوا ہے۔ جان کر جانوروں سے ان کی من مرضی کے بغیر سرگرمیاں انجام دلائی جارہی ہیں اور اسے رحم آتا ہے ان جانوروں پر جن کا تماشہ دیکھنے کے لیے انسان وہاں پر آموجود ہوئے ہیں۔ اس سے ہمیں ناہید کے اندر جو پیشے لحاظ سے رقاصہ ہے ایک دھڑکتا ہوا احساس دل نظر آتا ہے تو اس کے اندر جابجا میلے ٹھیلے کا پورا کا پورا سامان نظر آتا ہے۔ یہاں دیہاتی ماحول بھی ملتا ہے کیونکہ عام طور پر دیہاتی لوگ ہی میلوں کو پسند کرتے ہیں اور وہاں جاتے ہیں۔ اس ناول کی کہانی بڑی جاندار ہے اور اس ناول کے اندر جو ہمارے دیہات ہیں۔ ان کے جادو ٹونے بھی نظر آتے ہیں کردار نگاری کے ساتھ ساتھ اس ناول کے اندر پلاٹ بہت مضبوط نظر آتا ہے اور اگر اپنی جگہ پر کردار ثقافت موضوع اہمیت کا حامل ہے تو وہیں اس کہانی میں پلاٹ کو بھی کمال حاصل ہے بڑے گٹھے ہوئے پلاٹ ہیں اس میں جھول نہیں ہے اور ایسا لگتا ہے کہ بہت ہی محنت کے ساتھ اس ناول کو باقاعدہ طور پر ترتیب دیا گیا ہے جیسے کہ کوئی ریاضیاتی انداز ہو جیسا کہ کوئی سائنسی طور طریقہ ہو اس طرح سے ناول کی بنت کی گئی ہے۔ ایک اور چیز اس ناول کے اندر دیکھنے کو ملتی ہے اور وہ ہے جزئیات نگاری ناول نگار جابجا رک کر اپنے معاشرے پر اور اپنی ثقافت پر نگاہ ڈالتا ہے اور اور جزئیات نگاری پر توجہ دیتا ہے ایک ایک جز کو تفصیل سے بیان کرتا ہے یہاں ہمیں محاکات نگاری بھی ملتی ہے اور کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ مصنف جس منظر کی تصویر کشی کر رہا ہے۔ وہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں منظر نگاری بند ہونے والی ہے منظر نگاری لاجواب ہے۔ اس منظر نگاری کے اندر جو دیہاتی پس منظر ہے جو میلے کھیلے کا انداز ہے۔ وہ بھی باکمال ہے حقیقت تو یہ ہے کہ اس ناول کے اندر تجسس بھی موجود ہے یہاں کردار نکاری اپنی منتہی پر نظر آتی ہے۔ یہاں منظر نگاری، محاکات نگاری جزئیات نگاری ہر وہ چیز جو ناول کی بنت کو بہترین بناتی ہے جو ناول کی بنت کو زندہ بناتی ہے وہ موجود ہے۔ اس ناول کے اندر ایک اور خوبی یہ ہے کہ اس ناول کا اسلوب میلے ٹھیلے اور دیہاتی پس منظر کا عکاس ہے۔ ہمیں اس کا اسلوب پڑھ کر دیہاتی پن اور اور پاکستان

کے دیہاتوں خاص طور پر پنجاب کے دیہاتوں کی خوشبو نظر آتی ہے اور ہم اس کے عینی شاہد بن جاتے ہیں ۔اپنے پس منظر کی وجہ سے اسلوب کے اندر تشبیہات، استعارے، علامتیں، کہیں ادق لفاظی بھی نظر آئی ہے ورنہ اس کا اسلوب سلیس، رواں اور سادہ ہی نظر آتا ہے۔

۳۔رکھیل-ریاض عاقب کوہلر

رکھیل، ریاض عاقب کوہلر کا لکھا ہوا معاشرتی ناول ہے جس میں ایک خوبصورت لڑکی تناوش کی زندگی اور اس پر بیتنے والے دکھوں کی کہانی بڑی خوبصورتی بیان کی گئی ہے۔یہ ناول ماہنامہ حکایت کے شماروں جنوری ۲۰۱۷ء، فروری، مارچ، مئی، جون، جولائی، اگست، اکتوبر، ستمبر، نومبر اور دسمبر ۲۰۱۹ء میں قسط وار شائع ہوا ہے۔ناول کی کہانی کچھ اس طرح شروع ہوتی ہے کہ تناوش گینگسٹر یعنی بدمعاشوں کے ہتھے چڑھ جاتی ہے اور اس کو طرح طرح کی تکلیفیں دیتے ہیں۔دلاور شیخ بہت بڑا بدمعاش ہے جو تناوش کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔جب وہ اسے کالج جاتے ہوئے تنگ کرتا ہے تو تناوش اس کا ذکر اپنے بھائی سے کر دیتی ہے۔تناوش اپنے بھائی کو دلاور شیخ کے بارے میں اس طرح بتاتی ہے:

> ”آج میں کالج نہیں گئی تھی۔یوں ہی دائیں بائیں گھومتی رہی اور پھر وہ مجھے ایک ہوٹل کے باہر نظر آیا، اس حالت میں کہ ایک جج اس کے سامنے ہاتھ باندھے ہوئے گڑگڑا رہا تھا۔میں جان گئی کہ وہ ہی ایسا ہے جو مجھے دلاور شیخ کے چنگل سے نجات دلا سکتا ہے۔مجھے اللہ پاک نے اس سے بات کرنے کا موقع دیا اور میں نے فورا اپنی مجبوری اس کے سامنے بیان کر دی لیکن یہ تو آپ جانتی ہیں نا کہ اس دنیا میں لے دے کا اصول ہی کار فرما ہے۔بس میں نے دلاور شیخ کی موت کے بدلے خود کو اس کے سامنے پیش کر دیا۔البتہ پریشان نہ ہوں وہ مجھے نکاح پڑھا کر ہی ساتھ لے جائے گا۔اس نے بہت ساری باتیں حذف کرتے ہوئے اجملاً سارا واقعہ دہرا دیا“۔(۲۹)

اس کا بھائی دلاور شیخ بدمعاش سے اپنی بہن کی بے عزتی کا پوچھنے کے لیے جاتا ہے تو دلاور شیخ اسے قتل کر دیتا ہے۔تناوش کا والد پہلے ہی فوت ہو چکا ہے اور وہ اپنی ماں کے ساتھ رہتی ہے۔دلاور شیخ ہر وقت ان کے لیے مسائل پیدا کرتا رہتا ہے۔تناوش ہر وقت پریشان رہتی ہے کہ آخر وہ اس بدمعاش دلاور شیخ کا کیا حل کرے؟ اپنے بھائی کے قتل کا بدلہ بھی اس سے لے اور ساتھ ہی کوئی نہ کوئی ایسا بندوبست کرے تاکہ دلاور شیخ

اسے آئندہ زندگی میں تنگ بھی نہ کرے۔ وہ ایک دن بازار سے گزرر کر جارہی ہوتی ہے تو ایک بہادر نوجوان جو کہ جج کے ساتھ بھی پنگا لے لیتا ہے۔ اس سے تناوش اس کی طاقت کا اندازہ لگاتی ہے کہ وہ واقعی بہت طاقتور اور بہادر آدمی ہے۔ وہ اس کے بارے میں دریافت کرتی ہے کہ یہ کون ہے تو اسے بتایا جاتا ہے کہ اس کا نام کبیر دادا ہے اور بڑے بڑے بدمعاش بھی اس سے ڈرتے ہیں۔ چنانچہ تناوش اس سے شادی کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ اس کے خیال میں یہ بات آتی ہے وہ کبیر دادا کے ساتھ شادی کر کے دلاور شیخ سے اپنے بھائی کے قتل کا بدلہ بڑی آسانی سے لے سکتی ہے۔ یہ سوچ کر وہ کبیر دادا سے شادی کر لیتی ہے مگر شادی کے بعد کبیر دادا تناوش کو داشتہ اور رکھیل بنا کر پہلی ہی رات کسی دوسرے مرد کے سپرد کر دیتا ہے۔ اس منظر کو ناول نگار اس طرح سے بیان کرتا ہے:

> "دیر تک وہ سر جھکائے تلخ و شیریں خیالات میں گم رہی یہاں تک کہ دروازے پر کھٹکا ہوا اور اس سے پہلے کہ وہ گھونگٹ میں چہرہ گرم کرتی، تھری پیس سوٹ میں ملبوس ایک قبول صورت جوان اندر داخل ہوا۔ شاید یہ کبیر دادا کا سیکرٹری وغیرہ ہو گا۔ اس کے دماغ میں ایک امکانی سوچ گونجی۔ لیکن جوں ہی کمرے میں داخل ہوا، اس نے دروازے کی کنڈی لگائی۔ وہ ایک دم چونک پڑی تھی۔ کک۔۔۔۔ کون ہیں آپ۔۔۔ کنڈی کیوں لگادی۔ وہ بے اختیار کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ بے بی خادم کو خاور کہتے ہیں۔ آج کی رات تو مجھے اپنا خدمت گار سمجھ سکتی ہو اور کنڈی اس لیے لگائی ہے کہ کوئی ہماری تنہائی میں مخل نہ ہو سکے"۔ (۳۰)

مگر تناوش آہستہ آہستہ اس کوشش میں لگی رہتی ہے وہ کسی نہ کسی طرح کبیر دادا کو اپنی کہانی سنا کر رام کر لے اور اپنی زندگی کا مقصد حل کر لے۔ لہٰذا بہت زیادہ پریشانیوں اور دکھوں کے بعد اپنی زندگی کا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس طرح وہ کبیر دادا اور اپنی ماں کے ساتھ مل کر دلاور شیخ کو آخر کار ہلاک کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ دلاور شیخ جب کبیر دادا کے راستے میں آنے کی کوشش کرتا ہے تو کبیر دادا اس سے یوں مخاطب ہوتا ہے:

> "کیا تمہیں معلوم تھا کہ اس لڑکی کے جملہ حقوق میرے نام محفوظ ہو چکے ہیں۔ کبیر دادا کا ٹھنڈا ٹھار لہجہ بھی دلاور شیخ کے دل کی دھڑکن کو بڑھائے جارہا تھا۔ یوں بھی

کبیر دادا کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں تھی۔ زیر زمین دنیا میں اس کا نام ہیبت و دہشت کی علامت تھا۔ جس کام میں اس کے ملوث ہونے کا شبہ بھی ہوتا باقی لوگ اس کام سے یوں دور بھاگتے جیسے موت سے بھاگا جاتا ہے"۔ (۳۱)

اس طرح وہ اپنے بھائی کا بدلہ بھی لیتی ہے۔ تمام محلے کے لوگوں کا خیال تھا کہ تناوش کا والد پہلے ہی فوت ہو چکا ہے اور اس کے بھائی کو دلاور شیخ بد معاش نے قتل کر دیا ہے۔ اب اس خاندان کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا ہے اور کوئی بھی پرسان حال نہیں ہے۔ اس لیے اب تناوش سے شادی کون کرے گا۔ لیکن سارے اہلِ محلہ کی اس وقت حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب ان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تناوش کا رشتہ بہت اچھی جگہ ہو گیا ہے۔ وہ آپس میں چہ میگوئیاں کرتے ہوئے اس طرح گفتگو کرتے ہیں اور اندازہ لگاتے ہیں کہ وہ سسرال میں اپنے میاں کبیر دادا کے ساتھ پتہ نہیں کتنی خوش ہو گی:

" میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ کبیر علی خان نے اپنی دلہن کو ناز نخروں سے رکھا ہو گا، مگر اس بے چاری کی حالت دیکھ کر ترس آنے لگا ہے۔ فرحانہ نے منہ بنایا۔ نوشاد آفریدی کی چہتی بیگم نغمہ بے باقی سے بولی۔ اب بھی حسرت بھری نظروں سے کبیر صاحب کہہ رہی ہے، شاید اسی کے پاس جا کر بیٹھنے کا دل کر رہا ہے بچاری کا، لیکن بے وقوف یہ نہیں جانتی کہ کبیر خان جیسے آدمی کے پاس ایسی لڑکیوں کے لیے صرف بستر پر لیٹتے وقت چند لمحات ہوتے ہیں۔ اس کی بات پر تمام کھل کھلا کر ہنس پڑی تھیں۔ سنا ہے کسی غنڈے کی منظور نظر تھی جسے کبیر علی خان نے اپنے اثر ورسوخ سے مروادیا اور اس کی خوبصورتی دیکھتے ہوئے چند دنوں کے لیے گھر لے آیا۔ اب یہ بیچاری خود کو کبیر دادا کی سچ مچ کی بیوی سمجھے ہوئے ہے"۔ (۳۲)

اس طرح ناول کی کہانی میں آگے جا کر کبیر دادا کو بہت سے لوگ ملتے ہیں جو اس کو تناوش کی محبت میں گرفتار ہونے کی وجہ سے بہکاتے ہیں کہ وہ اس لڑکی کی محبت سے جان چھڑا لے۔ لیکن اس کے مقابلے میں تناوش کبیر دادا کا اس قدر خیال رکھتی ہے کہ وہ اپنی محبت کی وجہ سے کبیر دادا کے دل میں گھر کر لیتی ہے۔ کبیر دادا کے قریبی دوست آپس میں چہ میگوئیاں کرتے ہوئے ایک دوسرے کو کہتے ہیں:

"تم یوں ہی پریشان ہو رہے ہو، کبیر دادا کسی لڑکی کے لیے اپنا مقام اور عزت گنوانے پر تیار نہیں ہو سکتا۔ عورت ذات کی اہمیت اس کے لیے ٹشو پیپر سے بڑھ

کر نہیں ہے اور ٹشو پیپر استعمال ہونے کے بعد اپنی اہمیت کھو دیتا ہے۔ کاشف اس کی بات کو اتنی زیادہ اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ کاش ایسا ہی ہو پاشا حسرت بھرے لہجے میں بولا کہ وہ کبیر دادا سے بہت زیادہ محبت کرتا تھا۔ وہ اس کا آئیڈیا تھا اور اپنے آئیڈیل کو وہ کسی صورت برباد ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا"۔ (۳۳)

کبیر دادا تناوش سے کہتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ نہیں چل سکتی کیونکہ اسے جرائم کی دنیا میں رہنے سے ہر وقت اپنی زندگی کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ وہ ایسے میں یہ ذمہ داری نہیں لے سکتا کہ اسے اپنے ساتھ رکھے اور اس کی جان کو کوئی خطرہ ہو۔ تناوش اس کی بات پر یقین نہیں کرتی اور وہ بضد ہے کہ چاہے اس کی زندگی کو کتنا بھی خطرہ ہو وہ اس کو نہیں چھوڑ سکتی اور ہمیشہ زندگی بھر اس کی زوجہ بن کر اس کے ساتھ رہے گی۔ کبیر دادا اس کو اپنے الفاظ میں سمجھانے کی اس طرح کوشش کرتا ہے :

"بیوقوف لڑکی تم نہیں جانتی میں کیوں تمہیں دور کر رہا ہوں، میں تمہاری دنیا کا آدمی نہیں ہوں، تم صاف و شفاف شبنم کے قطروں سے دھلا ہوا گلاب کا پھول اور میں ببول کا درخت۔ یہاں تمہاری کوئی جگہ نہیں ہے۔ آج رو رہی ہو مگر کل ضرور مسکراؤ گی۔ آخر میں دے ہی کیا سکتا ہوں۔ جرم کی دنیا میں تم سے زیادہ دن خوش نہیں رہ پاؤ گی اور میں تو اس دلدل سے چاہ کر بھی نہیں نکل سکتا۔ اس دنیا میں آمد کا رستا کھلا ہے واپسی کا کوئی رستا نہیں ہے"۔ (۳۴)

کبیر دادا چونکہ جرائم کی دنیا کا بادشاہ ہے اس لیے اس کو لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اس کے دوست اس کو ہر روز ایک نئی لڑکی پیش کرتے ہیں اور اس کے بستر پر ہر روز ایک نئی لڑکی ہوتی ہے۔ اس لیے کبیر دادا کی غیرت کو یہ گوارا نہیں کہ وہ کسی ایک لڑکی کا ہو کر رہ جائے اور زندگی بھر اسی کے ساتھ گزارا کرے۔ اس کے دوست اسے سمجھاتے ہیں کہ یہ لڑکی آپ کو دھوکہ دے گی اس لیے اس سے جتنی جلدی ہو جان چھڑا لو۔ وہ کبیر دادا کو ان الفاظ میں نصیحت کرتے ہیں:

"آپ کو معلوم ہے عورت ذات مقصد پورا کرنے کے بعد کس طرح مرد کے پاؤں سے زمین کھینچتی ہے۔ اس وقت وہ نہ جینے کے قابل رہتا ہے نہ مرنے جوگ۔ اور یاد رکھنا جلد ہی تجوری کو اس نے خالی کر دینا ہے۔ خدارا اس وقت مجھے موردِ الزام نہ ٹھہرا دینا کہ پاشا نے تجوری خالی کی ہے۔ وہ بالکل بھی ایسی نہیں ہے۔ دھوکا دینا تو

اس معصوم کو آتا ہی نہیں ہے۔ یقیناً اس کی آنکھوں میں محبت اور چاہت کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔ ہر ادا، ہر عمل چیخ چیخ کر اس کے دل میں چھپی محبت کا اعلان کرتا ہے"۔ (۳۵)

کبیر دادا ایک بار دھوکے سے تناوش کو اس کی ماں سے ملاقات کروانے کے بہانے اس کے گھر لے جاتا ہے اور پھر کئی دن گزر جاتے ہیں اس کو واپس اپنے گھر لانے کے لیے نہیں جاتا۔ اس پر تناوش کی ماں ناراض ہو جاتی ہے اور کبیر دادا سے گلہ شکوہ اس انداز سے کرتی ہے :

"اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ چند ٹکے دے کر میری بیٹی کے دکھوں کا مداوا کر دیں گے یا کوئی گاڑی بنگلہ دے کر ہماری جھولی خوشیوں سے بھر دیں گے تو یہ غلط فہمی ہے۔ ہم غریب ضرور ہیں مگر کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔ خاص کر حرام کی دولت کا ایک روپیا نہیں چاہیے ہمیں۔ اور اب گزارش یہ ہے کہ میری بیٹی کا پیچھا چھوڑ دیں اسے اپنے دکھوں اور غموں کے ساتھ رہنے دیں۔ جتنی عیاشی کرنا تھی کر لی۔ میری بیٹی نے پورا پورا معاوضہ ادا کر دیا ہے۔ اُمید ہے میری درخواست کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے آئندہ آپ یہاں نظر نہیں آئیں گے"۔ (۳۶)

اس پر تناوش اپنی ماں کو تسلی دیتی ہے کہ میں نے کبیر دادا پر کچھ اس طرح سے اپنے حسن کا سحر طاری کر دیا ہے کہ اب وہ مجھ سے زیادہ دیر دور نہیں رہ سکتا۔ اس لیے آپ میری وجہ سے پریشان نہ ہوں کیونکہ میں نے انھیں کئی بار آزما کر دیکھ لیا ہے کہ وہ مجھ سے دور رہ کر زیادہ دن نہیں گزار سکیں گے۔ تناوش اپنی ماں سے یوں گویا ہوتی ہے:

"میں انھیں دور رہ کر دکھاؤں گی ماں جی، وہ ضرور پچھتائیں گے، دیکھنا ایک دن انہیں میری یاد آئے گی، جب وہ بکھریں گے اور انہیں سمیٹنے والا کوئی نہیں ہو گا، جب وہ روئیں گے اور آنسو پونچھنے والا کوئی نہیں ہو گا، جب وہ اکیلے ہوں گے اور ساتھ نبھانے والا کوئی نہیں ہو گا اور تب ۔۔۔۔۔۔ تب میرے پاس آئیں گے اور میں میں ۔۔۔۔۔ میں انہیں سمیٹنے کے لیے اپنی آغوش وا کر دوں گی، انہیں طعنے نہیں دوں گی ماں جی، کچھ بھی نہیں کہوں گی۔ گزرا وقت بالکل بھی یاد نہیں دلاؤں

گی۔ بس کہہ دوں گی کہ میں تو کب سے منتظر تھی۔ آپ نے ہی دیر کر دی۔ نمکین پانی اس کے گالوں پر بہنے لگا"۔ (۳۷)

چاہنے کے باوجود بھی کبیر دادا تناوش سے اپنی جان نہیں چھڑا سکتا۔ کیونکہ وہ اس سے بے پناہ محبت کرتی ہے اور اس کی اتنی زیادہ خدمت کرتی ہے کہ کبیر دادا کا دل جیت لیتی ہے۔ وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں کبیر دادا سے باتیں کرتی ہے کہ نہ جانے کیسے کیسے الٹے سیدھے خیالات میرے دماغ میں پلتے رہتے ہیں۔ وہ کہتی ہے کہ مجھے اپنی بضاعتی اور کمتری کا احساس کسی پل چین نہیں لینے دیتا۔ آپ سے بچھڑنے، دور ہونے اور دھتکارے جانے کا خوف ہر وقت دل دھڑکا تا رہتا ہے۔ اس کی ان باتوں کے جواب میں کبیر دادا اپنی محبت کا اظہار تناوش سے یوں کرتا ہے :

"پاگل کبیر دادا نے اس کے سر پر لپٹا دوپٹا اتار کر ریشمی بالوں کو بکھیرا۔ جانتی نہیں تم میرے لیے کیا ہو۔ وہ شاعر کہتا ہے نا۔۔۔۔

تیرے خیال سے دامن بچا کے دیکھا ہے
دل و نظر کو بہت آزما کے دیکھا ہے
نشاط جاں کی قسم تو نہیں تو کچھ بھی نہیں
بہت دنوں تجھے ہم نے بھلا کے دیکھا ہے"(۳۸)

"حقیقت یہ ہے کہ تم اس وقت میرے دل پر قابض ہوئیں جب پہلی بار دیکھا اور اس کے بعد دل و دماغ کا جھگڑا شروع ہو گیا، یہاں تک کہ حسب دستور دل جیت گیا اور دماغ کو ماننی ہی پڑی کہ میری زندگی کے لیے میری گڑیا، میری چندا، میری تناوش اتنی ہی ضروری ہے جتنا سانس لینا"۔ (۳۹)

تناوش کبیر دادا کا دل جیت لیتی ہے اور اُسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ جس کا اعتراف کبیر دادا خود بھی اپنے الفاظ میں یوں کرتا ہے۔ ناول کی کہانی کے آخر میں کبیر دادا کی بھی کسی سے لڑائی ہو جاتی ہے اور جب اس کو لوگ مار رہے ہوتے ہیں تو تناوش اس کے دکھوں کو اپنے دل پر یوں محسوس کرتی ہے کہ پہلے باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ پھر بھائی کو دلاور شیخ نے قتل کر دیا اور اب اس کے خاوند کو بھی لوگ مار رہے تھے تو اس کا اظہار یوں کرتی ہے:

"کبیر دادا کو ایک مکے کے جواب میں تین مکے کھانا پڑتے۔ مسلسل مار کھا کر کبیر داداہ لہولہان ہو چکا تھا۔ اس کے چہرے اور جسم سے خون تناوش کو اس کی دعاؤں کے رد جانے کی بری خبر سنا رہا تھا۔ باپ اور بھائی کی موت کے بعد شاید شوہر کی موت کا دکھ دیکھنا بھی اس کے نصیب میں لکھا تھا۔ کبیر دادا کو لگنے والی ہر چوٹ اس کے دل پر لگ رہی تھی۔ محسوس ہو رہا تھا کہ کبیر دادا سے پہلے اس کا سانس نکل جائے گا۔ اس کے لرزتے ہونٹوں پر مناجات جاری رہیں"۔ (۴۰)

فنی نقطہ نظر سے اگر اس ناول کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں احساس ہو گا کہ معاشرے کے پسماندہ اور غریب طبقہ سے ہمیں اخلاقی اور معاشرتی لحاظ سے ہمدردی کا سلوک کرنا چاہیے مگر ہمارے معاشرے میں رہنے والے طاقت ور اور جرائم پیشہ لوگ نہ صرف غریبوں کا استحصال کرتے ہیں بلکہ ان پر وہ مظالم کرتے ہیں کہ جس سے انسانیت کی توہین ہوتی ہے۔ کہانی میں بتایا گیا ہے کہ تناوش ہر موڑ پر جب مجبور ہو جاتی ہے تو وہ خود بخود اپنے آپ کو گینگسٹرز کے حوالے کر دیتی ہے۔

اس ناول کے اندر معاشرے کے ایک ایسے پہلو کا ذکر کیا گیا ہے جس پر اگرچہ بہت کچھ لکھا گیا۔ تاہم اس نئے انداز اور تازگی سے کم لکھا گیا، یہ موضوع یا یہ کہانی بالکل نئی ہے اور اس سے پہلے اس طرح کی کوئی کہانی تحریر نہیں کی گئی بلکہ اس موضوع پر فلم اور ڈرامہ میں بہت کچھ لکھا پڑھا گیا ہے افسانے بھی لکھے گئے ہیں یعنی اس موضوع پر اردو ادب ہی نہیں بلکہ عالمی ادبیات میں بھی بہت سا لٹریچر موجود ہے۔ بے شک یہ موضوع نیا نہیں ہے۔ تاہم اس ناول کی کہانی بہر حال بہت دلچسپ اور پر لطف ہے یہاں تاثر پایا جاتا ہے اور اس کہانی کے اندر تجسس موجود ہے۔ قاری شروع سے آخر تک کہانی کی تجسس میں مبتلا رہتا ہے اور وہ ہر صورت میں اس ناول کو پڑھ ڈالنا چاہتا ہے۔ ناول شروع کر لینے کے بعد ناول کو ختم کیے بغیر کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ یوں ناول نگار نے قدم قدم پر تجسس پیدا کیا ہے۔ اس ناول کے اندر اس کی ابتدا اس کا عروج اور اس کے انتہا اپنے اپنے مقام پر بہت اہمیت کی حامل ہے۔ اس کے اندر تناوش کا نسوانی مرکزی کردار موجود ہے۔ اس کے بعد اس کہانی میں جو بنیادی مرکزی مردانہ کردار ہے۔ وہ کبیر دادا ہے کبیر دادا کا کردار ایک انتہائی ظالم کردار نظر آتا ہے اور جس طرح کے انڈر ورلڈ کے لوگوں کا کردار ہوتا ہے۔ وہ ظالم بھی ہے اسی طرح سے اس کے اندر رحم نہیں پایا جاتا۔ اس کردار کے اندر اس وقت تک جامد پن موجود رہتا ہے جب تک کہ یہ کردار تناوش کی محبت میں مبتلا نہیں ہو جاتا۔ تناوش کی محبت میں مبتلا ہونے

کے بعد کبیر دادا کے کردار نہ صرف دلچسپ ہو جاتا ہے بلکہ اس کے اندر ارتقا پیدا ہو جاتا ہے ورنہ وہ ایک ہی لکیر پر چلتا ہوا کردار نظر آتا ہے۔ اس کردار کے ذریعے مصنف ایک گینگسٹر کی نفسیاتی عمل پذیری بھی دکھاتا ہے۔ ایک گینگسٹر کس طرح سے ظلم کرتا ہے اور کس طرح سے اپنے ظلم کی راج دہانی کو قائم کرنے کی کوشش میں جتا رہتا ہے اور جس طرح سے عام گینگسٹرز کی کہانیاں ملتی ہیں کہ وہ عیاش اور بدکار بھی ہوتے ہیں۔ شراب و شباب کے رسیا ہوتے ہیں۔ وہ پہلو بھی مصنف نے اس ناول میں اجاگر کیا ہے۔ اس ناول میں تناوش کا کردار بھی بڑا جاندار ہے۔ تناوش اپنے بھائی کے قتل کا بدلہ لینا چاہتی ہے اور یہ کردار اپنا سب کچھ لٹا دیتا ہے۔ اپنی روح اپنا بدن اپنے جو کچھ بھی اس کے پاس ہے اس نے گویا کہ کبیر دادا کے پاس رہن رکھ دیا اور وہ ایک ہی اس کا مشن اور مقصد ہے اور وہ چاہتی ہے کہ دلاور شیخ جو کہ اس کے بھائی کا قاتل ہے۔ اسے قتل کر دیا جائے اور پھر وہ وقت آتا ہے جب دلاور شیخ کو کبیر دادا مار دیتا ہے۔ یہ اس لحاظ سے نہایت ارتقا پذیر کردار ہے۔ شروع سے لے کر آخر تک یہ کردار کسی جگہ بھی جامد نہیں ہے بلکہ یہاں ہمیں ہر لمحہ ہر منظر کے اندر ارتقا نظر آتا ہے۔ وہ وہ دلاور شیخ کو قتل کرانا چاہتی ہے اور وہ اپنے اس مشن میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اسی طریقے سے وہ کبیر دادا کو اپنی محبت کا اسیر کرنا چاہتی ہے اور وہ اس میں بھی کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس کردار کے اندر جہاں اپنے مقصد کو حاصل کرنے کا جذبہ موجود ہے۔ اس کردار میں محبت بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اس کا احساس ہمیں اس وقت بھرپور انداز میں ہوتا ہے جب کبیر دادا کو مارا جا رہا ہوتا ہے اور کبیر دادا کو لگنے والا ہر مکا اور ہر زخم گویا کہ تناوش کے دل پر لگ رہا ہوتا ہے اور اسی طرح سے جس طرح ایک مشرقی عورت اپنے شوہر بھلے جیسا بھی ہو کے ساتھ عمر بھر نباہ کرنا چاہتی ہے۔ یہ بھی اسی طرح سے جب کہ کبیر دادا اسے سمجھاتا ہے۔ اسے کبھی نہ کبھی مار دیا جائے گا لیکن یہ پیچھے نہیں ہٹتی ہے اور اس کا پورا پورا ساتھ دیتی ہے۔ یہاں تک کہ کبیر دادا دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ یہ کردار اپنے آپ کو مضبوط کرتا ہے۔ کبیر دادا کے ذریعے اس کردار کا مشاہدہ بہت گہرا ہے اور یہ بہت جلد نتائج کو اخذ کر لیتا ہے اس بھرپور کردار کے بعد دلاور شیخ کا کردار ہے جو تھوڑے عرصے کے لیے آتا ہے۔ یہ کٹھور ظالم قسم کا کردار ہے جس کے اندر رحم کی کمی پائی جاتی ہے اور اس میں کچھ زیادہ ارتقا نہیں ہے تھوڑے عرصے کے لیے یہ کردار آتا ہے اور پھر ہٹ جاتا ہے اسی طرح تناوش کی ماں کا کردار ہے۔ وہ بھی بہت زیادہ عرصے کے لیے نہیں چلتا۔ ایک دھیما سا کردار ہے جو زیادہ تر پس منظر میں موجود رہتا ہے۔ کردار نگاری کے حوالے سے اس ناول کو بہتر بلکہ بہترین کہا جا سکتا ہے۔ اس ناول کا پلاٹ شروع

سے آخر تک بہت بہترین طریقے سے بنا گیا ہے اور حادثات و واقعات کو کڑی در کڑی تسبیح کے دانوں کی طرح ایسے جوڑا گیا ہے کہ اگر کوئی واقعہ اس میں سے گم ہو جائے کوئی کڑی ہٹ جائے ٹوٹ جائے یا پھر تسبیح کا کوئی دانا اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو ایسا لگتا ہے۔ تسبیح ٹوٹ گئی ہے پلاٹ کے بعد دیکھتے ہیں کہ اس ناول میں تجسس موجود ہے شروع سے آخر تک تجسس پایا جاتا ہے۔ اس کردار کے اندر ہمیں منظر نگاری ملتی ہے ایک ایسی دنیا جس کے بارے میں زیادہ تر لوگوں کو علم نہیں ہے۔ مصنف اس دنیا کا نفسیاتی معاشی اور معاشرتی جائزہ پیش کرتا ہے وہاں کا سماج کیسا ہے۔ وہاں معیشت کیسی ہے معاشرت کیسی ہے وہاں کے لوگوں کی نفسیات کیسی ہے؟ ان کی زندگی گزارنے کا طور طریقہ کیسا ہے؟ مصنف اس کا نفسیاتی جائزہ پیش کرتا ہے یا کہیں کہیں ہمیں جزئیات نگاری بھی نظر آتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ اچھا ناول ہے اور جرم کی دنیا کے حوالے سے اور جرم کی دنیا کی پیشکش کے حوالے سے اس ناول کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

۴۔ ناول بردہ۔ ریاض عاقب کوہلر

ناول بردہ، ریاض عاقب کوہلر کا لکھا ہوا ناول ہے جو ماہنامہ حکایت مارچ، مئی، جولائی، اگست، اکتوبر اور نومبر ۲۰۱۹ء کے شماروں میں قسط وار شائع ہوا ہے۔ اس ناول میں عربوں کی تاریخ اور رسم و رواج کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ یہ اردو زبان و ادب میں لکھا ہوا ایک عظیم شاہکار تاریخی ناول ہے جس کی کہانی قدیم عرب قبائل اور ان کی روایت کے گرد گھومتی ہے۔ ناول بردہ کی تعریف کرتے ہوئے اس ڈائجسٹ کے حوالے سے لکھا گیا ہے:

> This is a great social, history, and social story in the Urdu language which is distributing in Hakayat Digest in the month to month scene. The author gave a lot of data about the antiquated Arab individuals and their traditions. He told about Quraish, which was a striking clan in Arab and took care of Kaba. The subjection was the convention in Arab, and the individuals carried on impolitely with them. (۴۱)

عربوں کی تاریخ پر مبنی کہانی میں قبیلہ قریش کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے جو عرب کا ایک بہت بڑا قبیلہ تھا اور خانہ کعبہ کی حفاظت کی تمام تر ذمہ داری اس قبیلے پر عائد ہوتی تھی۔ عرب کے دیگر قبائل ان کے ساتھ بے ادبی کے مرتکب ہوئے تو کس طرح ان پر مشکلات طاری ہو گئیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے عرب میں غلاموں کے ساتھ کیسا سلوک کیا جاتا تھا؟ ان حالات میں غلاموں کے ساتھ جو برتاؤ کیا جاتا تھا، کیا وہ اسلامی اقدار کے مطابق تھا یا اسلامی روایت کے برعکس تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان غلاموں کی قدر افزائی کے لیے کیا اقدامات اُٹھائے۔ قبل از اسلام غلاموں کی حالت زار پر کھل کر تبصرہ کیا گیا ہے۔ انھیں جو مشکلات، مسائل اور پریشانیاں درپیش تھیں، ان کے بارے میں بردہ کی کہانی میں تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ بردہ کی خوبصورت کہانی پر ریاض عاقب کوہلر کو علمی و ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ۔اس حوالے سے ان کی خدمات قابل قدر ہیں اور انھیں عام قارئین میں بھی بہت پذیرائی ملی۔

بردہ کا لفظ غلام کے لیے استعمال کیا گیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غلاموں کے ساتھ عرب قبائل کیسا سلوک کرتے تھے؟ قدیم عرب میں میلوں ٹھیلوں کا رواج عام تھا۔ ان میلوں میں لوگ عرب کی روایات کی عکاسی کرتے ہوئے غلاموں کی خرید و فروخت کرتے تھے، قیدیوں سے سلوک، سرداروں کی ذہنی عکاسی اور ان کی من مانیوں کے بارے میں تفصیل سے بتایا گیا ہے۔ اس حوالے سے بردہ کا ایک پیراگراف ملاحظہ کریں:

> ”جب وہ میلے پر جانے کے لیے تیار ہوئے تو نیا چاند ظاہر ہونے والا تھا۔ صحار کا میلہ عمان میں لگتا تھا۔ یہ یکم رجب سے پانچ رجب تک جاری رہتا تھا۔ عریسہ بنت منظر دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی کہ اسے کوئی نیک دل آدمی خریدے۔ سفر طویل ہونے کے باوجود انھوں نے قیدیوں کے لیے کسی سواری کا بندوبست نہیں کیا تھا۔ صرف عرسیہ بنت منظر کو عورت ہونے کی وجہ سے ایک اونٹ پر جگہ ملی تھی۔ قیدیوں کی تعداد تیس سے بھی زیادہ تھی۔ اس میں دس افراد تو شریک کے قبیلے بنو جساسہ کے تھے۔ کچھ افراد پہلے سے ان کی قید میں تھے اور باقی چند دن ہوئے ان کے ہاتھ چڑھے تھے۔ غنم بن سلول کی سفارش پر سردار نے اس کی بہن شموس کو بھی ساتھ رکھا تھا تاکہ بچے کو دودھ ملتا رہے“۔ (۴۲)

عرب قبائل میں جنگوں کا رواج عام تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بڑی بڑی جنگیں لڑی جاتی تھیں جس سے بہت سا جانی اور مالی نقصان ہوتا تھا۔ ہر قبیلے کے اپنے اصول اور قواعد وضوابط تھے۔ کوئی کسی کی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ طاقت ور قبائل کمزور قبائل کی جان لینے میں ذرہّ برابر بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ عرب اس قدر وحشی تھے کہ ان پر کسی کی نصیحت کا بھی کچھ اثر نہیں ہوتا تھا۔ غصّے کے اتنے دھنی تھے کہ انھیں جب غصّہ آجاتا تو ان کا دماغ کام کرنا چھوڑ دیتا تھا اس طرح وہ اپنا اور بھی زیادہ نقصان کر بیٹھتے تھے۔ اسی طرح جنگ کا ایک نقشہ پیش کرتے ہوئے مصنف لکھتا ہے:

> ”یشکر کے چہرے پر خوف وہراس کے بجائے غصے کے آثار تھے۔ وہ یک ٹک اس گرانڈیل وحشی کو اپنی جانب بڑھتا دیکھ رہا تھا۔ ”جانتے ہو بیٹے لڑائی جیتنے کا پہلا اصول کیا ہے؟“ اس کے دماغ میں سکندر کی آواز گونجی۔ ”کبھی ڈر کر مقابلہ نہ کرنا“۔ (۴۳)

عرب قریب پہنچ گیا تھا اس نے ہاتھ لہرا کر خنجر کا وار کیا، ہدف یشکر کا بازو تھا لیکن وہ اس سے دگنی رفتار سے بھی وار کرتا تو اسے چھو نہیں سکتا تھا۔ وہ ایک دم جھکائی دے کر ایک قدم پیچھے ہٹا۔ عربی کے دوسرے وار کو بھی اس نے جھکائی دے کر خطا کیا۔ عربی کی وحشت آسمان کو چھونے لگی تھی۔

جس معاشرے کے کچھ اُصول اور قواعد وضوابط ہوتے ہیں وہ اپنے غلاموں اور قبائل کے ساتھ اپنے اُصولوں کے مطابق حسن سلوک اور ان کی پذیرائی کرتے ہیں لیکن عرب قبائل اپنے اُصولوں کی موجودگی میں بھی بعض اوقات ان کی پاسداری نہیں کرتے تھے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے ان اصولوں کو ہمیشہ فراموش کر دیتے تھے۔ لوگ قافلوں کی صورت میں سفر کرتے تھے اور راستے میں جہاں کہیں قافلے پڑاؤ کرتے تو اپنے اصولوں کے مطابق پیرے داروں اور حفاظتی اقدامات کا خیال رکھتے تھے۔ اس حوالے سے مصنف لکھتا ہے :

> ”تمہارے بارے میں میرا اندازہ ٹھیک نہیں تھا۔ بلاشبہ تم تلوار چلانے کا سلیقہ رکھتے ہو۔ یشکر نے گردن میں ہلکا سا خم لاتے ہوئے کہا۔ شکریہ سردار۔ مالک تحسین آمیز لہجے میں بولا تم جیسے غلاموں کی ہم پذیرائی کرتے ہیں۔ غروبِ آفتاب کے بعد بھی ان کا سفر نہیں رکا تھا۔ شریم کو ڈر تھا کہ قزاق اپنے ساتھیوں کا بدلہ لینے کے لیے دوبارہ حملہ کر سکتے تھے۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ جب تھکے ہارے

قافلے نے بنو سلیم کے مضافات میں پڑاو ڈالا۔ رات کو شریم کے حکم پر پہلے سے زیادہ پہرے دار مقرر کیے گئے تھے"۔ (۴۴)

عرب کے چند قبائل سردار باہم کچھ اصول بناتے تھے جن پر عمل کرنا پورے قبیلے کی ذمہ داری ہوتی تھی۔ جو کوئی ان اصولوں پر عمل نہیں کرتا تھا اُس کے لیے سخت سزا مقرر کی جاتی تھی۔ اس طرح بہت سے جرائم پر قابو پالیا جاتا تھا۔ جن قبیلوں کے کچھ اصول ہوتے ہیں انھیں کسی دوسرے قبیلے کا سردار بھی توڑنے کی جرأت نہیں کرتا۔ عرب اپنے حسب و نسب کا بہت خیال رکھتے ہیں اور ان کی پہچان بھی حسب و نسب کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ درج ذیل پیراگراف سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

"دیکھو جوان ایک بات یاد رکھنا عربوں کے نزدیک سب سے پہلے حسب نسب اور خون کا رشتہ ہوتا ہے۔ اگر یہ سوچتے ہو کہ شہ زوری اور تلوار بازی کی صلاحیت کے بَل پر کوئی عالی نسب لڑکی تمھیں مل جائے گی تو یہ ایک سپنا ہی ہے۔ شریم تک بھی یشکر کے ہادیہ کو پسند کرنے کی خبر پہنچ چکی تھی۔ اس نے یشکر کو سمجھانے میں ایک لحظے کی بھی دیر نہیں کی تھی"۔ (۴۵)

اسلام سے قبل عرب قبائل مذہب پر بہت زیادہ کاربند تھے۔ انھیں جب بھی دین اسلام کی دعوت دی جاتی تو وہ ہمیشہ پس و پیش سے کام لیتے تھے۔ اگر کوئی اسلام قبول کر لیتا تو وہ اس کو چھپاتا تھا۔ اگر کسی قبیلے کے سردار کا انتقال ہو جاتا تو اس کی جگہ فوری دوسرا سردار مقرر کر دیا جاتا تھا۔ اگر کوئی نئے سردار کو ماننے میں پس و پیش کرتا تو اس کے خلاف اعلان جنگ کیا جاتا تھا۔ ایسے واقعات کے حوالے سے ناول نگار یوں وضاحت کرتا ہے:

"یوسانوس کا نام بطور حکمران لینے والے سالار نے ہمت مجتمع کرتے ہوئے کہا "میں یسوع مسیح کی قسم کھاتا ہوں کہ میں آج بھی عیسائی ہی ہوں۔ یہ ابتداء تھی ایک ایک کر کے تمام عہدہ داران نے حلف لے کر بتایا کہ وہ اب تک دین نصاریٰ پر قائم ہیں اور اپنے دین کو انھوں نے الیانوس کی وجہ سے چھپایا ہوا تھا۔

الیانوس کی تدفین سے فارغ ہو کر انھوں نے یوسانوس کی تاج پوشی کی۔ یوسانوس نے تاج پہنتے ہی پہلا حکم یہی دیا کہ رومن فوجوں کو اس علاقے سے نکالا جائے۔ کیونکہ صورت حال بالکل بھی ان کے حق میں نہیں تھی۔ ایک تو گرمی کا زور تھا

دوسرا خوراک کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا، وہ تین اطراف سے دشمن کے گھیرے میں تھے اور سب سے بڑھ کر ایرانی لشکر کی تعداد ان سے کہیں زیادہ تھی"۔ (۴۶)

میدان جنگ کا نقشہ بیان کرتے ہوئے ناول میں جابجا اس کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اہل عرب جب کسی سے الجھ پڑتے تو معمولی بات پر ایک دوسرے کو قتل کر دیتے تھے۔ وہ یہ بھی نہیں سوچتے تھے کہ اس قتل کا انجام کیا ہو گا۔ اپنے پیار کو پانے کے لیے کسی دوسرے کا قتل کرنا ان کے لیے معمولی بات تھی:

"یشکر نے ایک دم صاعقہ کو ہزیل کے دل میں گھونپ دیا۔ ہزیل اذیت بھرے انداز میں ہاتھ پاؤں جھٹکنے لگا تھا۔ دو تین لمحوں بعد اس کا جسم ساکت ہو گیا تھا۔ یشکر نے ہادیہ کے حصول کے لیے بنو نوفل جیسے قبیلے کے سردار زادے کو قتل کر دیا تھا۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ اس کا انجام آخر کیا ہو گا"۔ (۴۷)

عرب قبائل میں میلوں ٹھیلوں اور تہواروں پر جشن منانے کا رواج عام پایا جاتا تھا۔ ان تہواروں پر ایک مخصوص انداز میں قبائل سرداروں کی خدمت کی جاتی تھی۔ ان کے لیے مہ نوشی کے ساتھ ساتھ دیگر عیاشیوں کا بھی خیال رکھا جاتا تھا۔ ان کی خدمت مدارت کے لیے بہت سے غلاموں کو مامور کیا جاتا تھا تاکہ انھیں ہر طرح کی سہولیات میسر رہیں۔ انہی تہواروں کی تصویر کشی کرتے ہوئے مصنف بتاتا ہے کہ :

"جشن کے اختتام پر جس کو جگہ جہاں جگہ ملی وہ لیٹ گیا تھا۔ بنو نوفل کے سردار زادے کے آرام کے لیے ایک حویلی مخصوص کی گئی تھی۔ اگلے دن اس نے ہادیہ کو ساتھ لے کر جانا تھا۔ جشن میں وہ خوب مہ نوشی کر چکا تھا۔ رات گئے وہ لڑکھڑاتا ہوا اپنے لیے مخصوص خواب گاہ میں پہنچا اور نرم بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ رات آہستہ آہستہ اختتام کو سرک رہی تھی۔ ساز باجے کے شور وغل کے بعد چھا جانے والی خاموشی نے ماحول پر مایوسی طاری کر دی تھی۔ دور کہیں گیدڑوں کی ہوہو کی منحوس آوازیں ایک تسلسل سے آ رہی تھیں۔ کتوں کے بھونکنے کی آواز بھی گیدڑوں کی آواز کے ساتھ شامل ہو گئی تھی"۔ (۴۸)

ناول میں جہاں غلاموں کے ساتھ ناروا سلوک کرنے قبائل کے سرداروں کی عیاشیوں کا ذکر بھی بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ عرب قبائل میں سرداروں کو پُر تکلف انداز میں سہولیات فراہم کی جاتی ہیں۔ اُن کے کھانے پینے، رہنے سہنے اور سونے جاگنے کے اوقات اور آرام کا بہت خیال رکھا جاتا ہے تاکہ وہ سکون کے ساتھ

اپنی زندگی بسر کر سکیں۔ رعایا کو یہ حق اور جرأت بالکل نہیں ہوتی کہ وہ سرداروں کے آرام میں خلل انداز ہوں۔ ناول میں اس کا اظہار یوں کیا گیا ہے:

> ”میں نہیں چاہتی کہ تمہاری یاد ہمیشہ نفرت کی صورت ہی میرے دل میں جاگزیں رہے۔ ہادیہ کے اس فقرے میں کوئی ایسا پیغام پوشیدہ تھا کہ وہ سونے میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ گویا وہ اس سے نفرت ترک کرنے کی متمنی تھی اور نفرت کے بعد اگلا قدم ہمدردی اور اس کے بعد محبت کا ہوتا ہے۔ وہ رات گئے تک جاگتا رہا۔ اس نے اپنی سوچوں کو ہادیہ کے سحر انگیز وجود سے پھیرنے کی بہت کوشش کی مگر نہ تو سکندر کی یادیں اس کی جان چھڑا سکیں، نہ سیرینہ کی موہنی صورت ہادیہ کی جگہ لے سکی۔ اپنی منھ بولی بہنوں وتینہ، سلمٰی اور ثانیہ کا خیال بھی اس ضمن میں کسی کام نہیں آ سکا تھا۔ اس کی سوچیں ہادیہ سے شروع ہو گا اسی پر اختتام پذیر ہو رہی تھیں“۔ (۴۹)

بردہ میں ہر طرح کے غلام شامل ہوتے تھے جن میں مرد اور خواتین بھی شامل ہوتی تھیں۔ میلوں ٹھیلوں میں غلاموں کی خرید و فروخت کی زیادہ تر تعداد خواتین کی ہوتی تھی۔ بڑے سردار عورتوں کو خرید لیتے اور اپنے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے تھے۔ بہت سی عورتوں کو سردار باندھی بنا کر رکھتے تھے اور اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ان عورتوں میں بہت سی بہادر خواتین ہوتی تھیں جو سرداروں کا آلہ کار بننے سے انکار کر دیتی تھیں۔ ہادیہ بھی ایسی ہی بہادر عورتوں میں سے ایک ہیں۔ ہادیہ اپنے آقاؤں کے سامنے ڈٹ جاتی ہے اور اپنے جذبات کا اظہار یوں کرتی ہے:

> ”نہ میں ڈرتی ہوں کسی سے اور نہ کسی کی جرأت ہے کہ ہادیہ بنت شیبہ کو باندی بنا سکے۔ اس لیے تمھیں مرنا تو پڑے گا۔ اور اسی ۔۔۔۔۔ یہ الفاظ اس کے منھ میں تھے کہ چھت سے ایک سانپ گھرا جو سیدھا اس کے قدموں میں آ گرا تھا۔ ملگجی روشنی میں کریہہ شکل کے کیڑے پر نظریں پڑتے ہی ہادیہ کے ہونٹوں سے زوردار چیخ نکلی۔ اگلے ہی لمحے تلوار نیچے پھینکتے ہوئے اس نے کونے کی طرف چھلانگ لگائی۔ یشکر کے منہ سے زوردار قہقہہ بلند ہوا تھا۔ دھاری دار سانپ فرش پر گرتے

ہی کونے کی جانب رینگنے لگا۔ مسلسل بارش سے اچھی خاصی سردی پھیلی تھی۔ سانپ کا رُخ اسی کونے کی طرف تھا جدھر ہادیہ نے پناہ لی تھی"۔ (۵۰)

جنگوں میں سرداروں کے سامنے ان کے غلام بہادری کے جوہر دکھاتے تھے۔ اپنی جان کو داؤ پر لگا کر جنگ لڑتے تھے۔ عرب قبائل جنگ میں دشمنوں سے انسانیت سلوک کرتے تھے۔ بعض جنگوں میں دشمن کو باندھ کر تیز اندازی کی جاتی تھی تاکہ دشمن آسانی سے تڑپ بھی نہ سکے۔ ان کو تکلیف میں دیکھ کر محظوظ ہوتے تھے۔ ان کے دلوں میں ذرا بھی رحم نہیں آتا تھا۔ البتہ عورتوں کے دل نرم ہوتے ہیں۔ وہ کسی کو تکلیف میں دیکھ سکتیں۔ اس لیے وہ کسی کو تکلیف میں دیکھ کر ہمدردی کا اظہار کرتی تھیں۔ کونتیلہ بھی ایک لڑکی ہے مگر اس کی بہادری کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ اس کے دل میں ہمدردی اور محبت کے جذبات مفقود ہیں۔ وہ بھی مردوں کے ساتھ شامل ہو کر جنگ کے تکلیف دہ مناظر سے محظوظ ہو رہی تھی۔ اس کے حوالے سے ناول میں یوں منظر کشی کی گئی ہے:

"دھرم نے دوبارہ کوشش کی۔ دوسری مرتبہ تیر گلاب کی ٹانگ میں پیوست ہوا تھا۔ وہ بیچارہ اتنی مضبوطی سے بندھا تھا کہ صحیح طریقے سے تڑپ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کی تکلیف سے بے نیاز قتیلہ نے قہقہہ لگایا۔ امید ہے بھاگتے ہوئے دشمن کو زخمی کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ باقی تمام بھی ہنسنے لگے تھے۔ لڑکیاں البتہ زخموں سے کراہتے گلاب کی حالت پر بے اطمینانی محسوس کرنے لگی تھیں کہ صنفِ نازک طبعاً رحم دل اور ہمدرد ہوتی ہیں اور کسی کو تکلیف میں دیکھنا انہیں پریشان کر دیتا ہے۔ کونتیلہ بھی لڑکی تھی لیکن اس میں ایسے جذبات محبت مفقود تھے۔ وہاں سب سے زیادہ وہی لطف اندوز ہو رہی تھی"۔ (۵۱)

غرض کہ ناول "بردہ" میں عرب قبائل کی اسلام سے قبل تمام تر برائیوں، معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں اور رسم و رواج کا تذکرہ بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ فنی نقطہ نظر سے بھی اس ناول کی کہانی کا جائزہ لیا جائے تو اسے ایک منظم صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ ناول کی اہمیت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب یہ معاشرتی ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخی بھی ہو۔

یہ ناول جہاں تاریخی ہے وہی معاشرتی بھی کہا جا سکتا ہے۔ اگر یہ کہیں کہ اس ناول کے اندر تحقیق اور تنقید کا عمل دخل ہے تو غلط نہ ہو گا اس ناول کو تکمیل تک پہنچانے میں ناول نگار نے تاریخ کی نامعلوم

کون کون سی غلام گردشوں کا طواف کیا ہے۔ اس ناول کو لکھتے ہوئے پڑھتے ہوئے یقیناً ناول نگار نے بہت عرق ریزی سے کام لیا ہے۔ کہانی کا موضوع ایک طرف تاریخی ہے، دوسری طرف معاشرتی اور سماجی پہلو لیے ہوئے ہیں۔ ناول کی کہانی شروع سے آخر تک اپنے اندر سمیٹ کر رکھ دی ہے۔ موضوع بہت جاندار ہے، اس جاندار اور اعلیٰ مرتبہ موضوع کی وجہ سے ریاض عاقب کو ادبی سرکلز میں بہت اہمیت حاصل ہو گئی اور آج بھی وہ اس ناول کی وجہ سے بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ اس ناول کا موضوع اچھوتا، انوکھا ہے۔ اردو ادب کے اندر ہی نہیں عالمی ادب میں بھی اس موضوع پر بہت زیادہ ناول نہیں لکھے گئے۔ چند ناولز کا نام لیا جا سکتا ہے پھر اس موضوع کو منتخب کرنے کے بعد جس طرح ناول نگار نے نبھایا ہے۔ وہ داد کا مستحق ہے۔ اس ناول کو پڑھنے والے مخصوص قارئین ہی ہو سکتے ہیں کیونکہ تاریخ سے وابستہ اور معاشرتی و سماجی ناول کو پڑھنے والے خاص لوگ ہوتے ہیں جن کی دلچسپی تاریخ سے سماج سے اور معاشروں سے ہوتی ہے۔ اس کہانی کا جہاں تک تعلق ہے۔ اس کے کتنے ہی موڑ آتے ہیں جس طرح کی تاریخ کے اندر عروج و زوال کی ہزار داستانیں موجود ہیں۔ اسی طرح اس ناول کے اندر بھی تاریخ کی کہانی کے اندر تاریخ کی ہزار داستانیں موجود ہیں۔ تاریخ کے ہر موڑ پر کچھ نئی داستان رقم ہوتی ہے کچھ نئی کہانی بنی جاتی ہے اور یہ ایسی کہانی نہیں جو من گھڑت ہے جو ناول کے تصور کا شاخسانہ ہے۔ بلکہ یہ کہانی انسانوں کی ہے وہ جو کبھی آقا تھے اور کبھی غلام۔ یہ کہانی ہزاروں سال کی کہانی ہے اور اس کے اندر عروج و زوال کا بے پناہ ذخیرہ موجود ہے۔ اس کہانی کے اندر کتنے ہی کردار آتے ہیں۔ یہ کہنا کہ کسی مخصوص کردار کا ذکر کیا جائے وہ یہاں موجود نہیں ہے۔ اس کہانی کا کوئی نسوانی یا مردانہ مرکزی کردار نہیں ہے بلکہ جس طرح شیکسپیئر نے کہا تھا کہ انسان ایکٹر ہے، اداکار ہے، دنیا کی سٹیج پر اداکاری کرنے کے لیے آتا ہے، اپنا کردار نبھاتا ہے اور چلتا بنتا ہے۔ اسی طرح ہمیں اس ناول کے اندر بیسیوں، سینکڑوں کردار ملتے ہیں۔ اپنا کردار نبھانے کے لیے زندگی کے اسٹیج پر یا دوسرے الفاظ میں یہاں زندگی کے اوراق پر نمودار ہوتے ہیں۔ مراد ناول کے اور اوراق پر نمودار ہوتے ہیں اور پھر آگے بڑھتے ہیں۔ رخصت ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے کردار جلوہ گر ہو جاتے ہیں۔ یوں یہ انسانوں کی کہانی ہے ان کے عروج و زوال کی کہانی ہے اور اس کے کردار نسل در نسل انسان ہیں۔ اس لیے کسی ایک مخصوص کردار کا ذکر کرنا نامناسب معلوم ہوتا ہے اس کہانی کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کی نفسیات کا گہرا مشاہدہ کیا گیا ہے۔ ایک شخص جو ابھی کل ایک اچھے عزت دار گھرانے کا فرد تھا۔ جگ میں غلام بن جانے کے بعد وہ بکتا ہے اور اس کے لیے منڈیاں لگائی جاتی ہیں،

اس کے لیے میلے سجائے جاتے ہیں، اور پھر اس ناول کے اندر دیکھتے ہیں کہ اس غلام کا نفسیاتی تجزیہ پیش کیا گیا ہے وہ کیا سوچتا ہے وہ کیا خیال کرتا ہے اور اس کے ساتھ تصورات و خیالات کی سطح پر کیا کچھ ہو رہا ہوتا ہے۔ اس ناول کے اندر نفسیات کے علاوہ تاریخ قدم بقدم موجود ہے۔ اگر یہ کہیں کہ ایک تاریخی سفر ہے جو انسانوں سے وابستہ ہے اور تاریخ اور سماج بطور ایک کردار کے یا موجود ہیں تو وہ غلط نہ ہو گا۔ سماج ، معاشرت، معاشرہ اور تاریخ ہمیشہ سے ایک دوسرے کے ساتھ باہوں میں باہیں ڈالیں آگے کا سفر کرتے رہے ہیں۔ یہ سفر جاری و ساری ہے شروع سے آخر تک یہ سفر انسانوں کا یہ سفر اس کے کرداروں کا سفر جاری رہتا ہے۔ اس ناول کے اندر تجسس بدرجہ اتم موجود ہے اگر یہ تجسس شدہ ہوتا تو شاید ایک سماجی معاشرتی سائنس اور تاریخ سے متعلقہ کہانی اپنے جلو میں زیادہ توانائی نہ رکھ سکتی۔ یہ مصنف کا کمال ہے کہ وہ واقعات و حادثات کو اور کہانی کو کچھ یوں آگے لے کر چلتا ہے کہ پڑھنے والا ہر موڑ پر حیرت کے کسی جزیرے کا منظر بن جاتا ہے اور پھر اس کہانی کو آگے اور آگے اور آگے پڑھتا چلا جاتا ہے۔ گویا کہ مصنف نے تجسس بھی برقرار رکھا ہے چونکہ تاریخ کا سفر تھا اور قدیم معاشرے اور پھر اسلامی معاشرے کا ذکر تھا۔ مصنف بار بار اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد کہ درپیش مناظر ہی انہیں دکھاتا ہے یہاں بہت جگہ تجسس موجود ہے اس ناول کے اندر نگاری بھی پائی جاتی ہے۔ کہیں کہیں محاکات نگاری بھی پائی جاتی ہے اگر اسے اردو ناول یا اردو فکشن کا رزم نامہ کہیں تو غلط نہ ہو گا کیونکہ یہاں جنگجویانہ انداز زیادہ ملتا ہے اور ایسا لگتا ہے جیسے کہ یہ رزمیہ مصنف ہیں۔ بہت گہری سوچ و بچار کے بعد تحریر کیا گیا۔ اس کے اندر رزمیہ عناصر باقاعدہ طور پر موجود ہیں۔ اس ناول کا اسلوب تاریخی ہے، اس کے اندر اپنے الفاظ نام واقعات اور اوزاروں کے نام ہمیں تاریخی پس منظر میں دکھائی پڑتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ بہر حال بہت دلچسپ اور اعلیٰ قسم کا ناول ہے جو پڑھنے والے پر ہمیشہ کے لیے اپنے اثرات مرتب کر جاتا ہے۔

ماہنامہ اردو ڈائجسٹ، حکایت اور سیارہ کا تقابل:

اردو ڈائجسٹ ،سیارہ ڈائجسٹ اور حکایت ڈائجسٹ میں مقالے کی مخصوص مدت کے دوران ۱۸ افسانے شائع ہوئے۔ ان میں سے نو افسانے اردو ڈائجسٹ، دو افسانے حکایت ڈائجسٹ جبکہ سات افسانے سیارہ ڈائجسٹ میں شائع ہوئے۔ بلاشبہ افسانے کی ترویج اور افسانہ نگاروں کے کام کو قارئین تک پہنچانے میں ان ڈائجسٹوں کا قابل قدر کام ہے۔ اگر شائع شدہ ان ۱۸ افسانوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے تینوں ڈائجسٹوں کا فکری

سطح پر موازنہ کرنا مقصود ہو تو ان میں سے سب سے زیادہ افسانے اردو ڈائجسٹ نے شائع کیے۔ اس کے بعد سیارہ ڈائجسٹ جب کہ حکایت ڈائجسٹ نے محض دو ہی افسانے شائع کرنے پر اکتفا کیا۔ ان افسانوں کے افسانہ نگاروں کے ناموں پر غور کیا جائے تو سبھی اہم نام شامل ہیں، یعنی اپنے عہد کے بڑے افسانہ نگار شائع کیے گئے ہیں۔ اس سے اس دلیل کو تقویت ملتی ہے کہ ہمارے ڈائجسٹوں کے اندر ان افسانہ نگاروں کو اہمیت دی جاتی ہے جو اردو ادب کے اندر اپنا ایک خاص مقام بنا چکے ہوتے ہیں۔ خاص طور پر اگر حکایت ڈائجسٹ کی بات کی جائے تو اس میں محض دو ہی افسانے شائع کیے گئے ہیں اور وہ بھی ممتاز مفتی اور منشایاد کے افسانے ہیں، گویا کہ یہ دونوں بڑے نام ہیں، ممتاز مفتی اور منشایاد کے علاوہ اس مخصوص مدت میں کسی اور افسانہ نگار کا افسانہ شائع نہیں کیا گیا۔ اسی طرح اردو ڈائجسٹ میں شائع کردہ افسانوں کی فہرست پر نظر دوڑائیں تو ہمیں یہاں مرزا ادیب، خدیجہ مستور، انتظار حسین، رضیہ بٹ، غلام عباس جیسے افسانہ نگاروں کے نام ملتے ہیں۔ تبرک کے طور پر شکیلہ رفیق کا ایک افسانہ پردے کے پیچھے کی عورت شائع کیا گیا ہے یا پھر نجم الحسن رضوی کا افسانہ مردہ گھر۔ تاہم سیارہ ڈائجسٹ کسی حد تک اس روایت سے روایت شکنی کرتا نظر آتا ہے۔ یہاں پرکاش کرشن، ڈاکٹر محمد علی آسناتھ کنول، نائلہ بلیغ الرحمن کے نام بھی ملتے ہیں اور اس سے ایک بات واضح ہوتی ہے کہ سیارہ ڈائجسٹ نئے افسانہ نگاروں کو حوصلہ شکن جواب نہیں دیتا بلکہ حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ یہاں بلونت سنگھ، جمیل احمد پال اور انتظار حسین کا نام بھی ملتا ہے۔ اگر ان تینوں ڈائجسٹوں کا اس حوالے سے موازنہ کریں کہ کون نئے افسانہ نگاروں کی زیادہ حوصلہ افزائی کر رہا ہے تو سیارہ ڈائجسٹ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، جو اردو ادب کے لیے اور نئے لکھنے والوں کے لیے اہمیت کی حامل بات ہے۔ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے کیونکہ جس وقت ایک ادیب کی، ایک افسانہ نگار کی کہانی شائع ہوتی ہے تو یہی دراصل اس کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور اس حوصلہ افزائی کے نتیجے میں وہ مزید لکھتا ہے اور ایک وقت آتا ہے جب وہ قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور، انتظار حسین یا پھر اسی قبیل کا بڑا افسانہ نگار یا ناول نگار بن جاتا ہے۔ اس امر سے اس افسانہ نگار یا ناول نگار کو پختگی عطا کرنے کے ساتھ ساتھ معاشرے کو ایک اچھا ادیب میسر آجاتا ہے۔ ایک اور نقطہ نظر سے اگر غور کریں کہ ان تینوں ڈائجسٹوں میں سے سب سے زیادہ افسانے کی ترویج میں اہم کردار کس کا ہے یعنی کس ڈائجسٹ نے افسانے کے شائع کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے تو وہ اردو ڈائجسٹ ہے، کیونکہ تفویض شدہ وقت یا دورانیے کے دوران سب سے زیادہ اردو ڈائجسٹ نے یعنی نو افسانے اردو ڈائجسٹ نے شائع کیے ہیں اور اس حوالے سے سب سے کم کام حکایت ڈائجسٹ میں نظر آتا ہے۔ اردو ڈائجسٹ نے اور سیارہ ڈائجسٹ نے خاص

طور پر افسانے کی ترویج، اس کے ارتقا اور نئے لکھنے والوں کو اہمیت دی ہے۔ عام طور پر ڈائجسٹ کی تحریروں کو اعلیٰ ادبی تحریر خیال نہیں کیا جاتا لیکن ان ڈائجسٹوں کے اندر شائع ہونے والے افسانوں پر غور کیا جائے تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ یہ تینوں ڈائجسٹ اول درجے کا ادب شائع کر رہے ہیں۔ مرزا ادیب، خدیجہ مستور، انتظار حسین ،غلام عباس، ممتاز مفتی بلونت سنگھ، منشایاد، جمیل احمد پال بڑے نام ہیں اور ان کا کام بھی عامیانہ سطح کا نہیں ہے۔ ان کا اسلوب، ان کے موضوعات بلاشبہ اردو افسانے کی زندگی میں بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں، بلکہ ایک طرح سے پچھلی چند دہائیوں سے یہی لوگ اردو افسانے کو ارتقا کی منزل سے فیض یاب کر رہے ہیں۔ اگر موضوعات اور افسانے کی تعداد اشاعت پر غور کیا جائے تو اس حوالے سے اردو ڈائجسٹ کو فوقیت حاصل ہے۔

تینوں ڈائجسٹ اردو زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں اور ان میں شائع کردہ زیادہ تر اچھے موضوعات، کردار، پلاٹ اور اسلوب کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ پر شائع شدہ افسانوں پر نظر دوڑائی جائے یا ان کا بغور مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان افسانوں کا معیار بلند ہے۔ اگر ان تینوں ڈائجسٹوں میں موضوعاتی سطح پر افسانوں کا تجزیاتی موازنہ کریں تو اس حوالے سے بھی ہمیں یہ تینوں ڈائجسٹ وقیع نظر آتے ہیں۔ اردو ڈائجسٹ کی بات کی جائے تو یہاں نو افسانے مراد نو موضوعات شائع کیے گئے ہیں۔ ان موضوعات پر غور کرنے سے ایک بات مترشح ہوتی ہے کہ زیادہ تر وہ موضوعات شائع کیے گئے ہیں، جو روایتی قسم کے ہیں۔ اردو ادب میں ان روایتی موضوعات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور اردو ڈائجسٹ میں بھی بہت سے یہی موضوعات شائع کیے گئے ہیں۔ مثلاً سہرا خدیجہ مستور کا لکھا ہوا افسانہ ہے جس میں ماں چاہتی ہے کہ وہ اپنے بیٹے کا سہرا دیکھے، اس کی دلہن تلاش کرے اور پھر خود اپنے بیٹے کا گھر بسائے یا پھر وہ اپنے دوسرے بیٹے ساجد کو ہمیشہ اپنے پاس رکھنا چاہتی ہے اور چاہتی ہے کہ شادی کے بعد بھی ساجد اسی کے پاس، اسی کے کمرے میں سویا کرے۔ یہ موضوع روایتی قسم کا ہے اور اس حوالے سے اور افسانے بھی یا اسی موضوع سے ملتے جلتے مامتا کی محبت کے حامل افسانے لکھے گئے ہیں۔ انتظار حسین نے دوسرا راستہ افسانہ اس ڈائجسٹ کے اندر شائع کروایا ہے۔ اس افسانے کے اندر علامت موجود ہے۔ افسانے میں ا ایک بس کا سفر دکھایا گیا ہے جو علامتی طور پر پاکستان کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ آزادی کے پس منظر میں لکھا گیا افسانہ ہے۔ آزادی پر بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس موضوع پر افسانے ،ناول، فلم ڈرامہ بہت کچھ لکھا اور دکھایا جا چکا ہے۔ آنندی بلاشبہ اردو ڈائجسٹ کے اندر ایک اعلیٰ افسانہ ہے، لیکن اس کا موضوع طوائف ہے۔ اس میں شک

نہیں کہ اس موضوع کو نئے انداز سے لکھا گیا ہے تاہم اس موضوع پر بھی بہت سا کام کیا جا چکا ہے، بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، مینوں لے چلا بابلا خدیجہ مستور کا افسانہ ہے اور یہ بھی آزادی کے پس منظر میں لکھا گیا افسانہ ہے ۔ ٹھنڈا میٹھا پانی جنگ ۶۵ یا جنگ ۷۱ کے پس منظر میں لکھا گیا افسانہ ہے اور اس پس منظر پر بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے گویا کہ اردو ڈائجسٹ میں زیادہ تر جو افسانے شائع ہوئے ہیں وہ روایتی موضوعات پر لکھے گئے ہیں۔ تاہم اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اردو ڈائجسٹ میں شائع ہونے والے افسانوں میں نئے موضوعات یا متنوع موضوعات یا نئے دور میں پیش آنے والے موضوعات پر افسانہ نہیں لکھا گیا۔ نجم الحسن رضوی کا افسانہ مردہ گھر میں دہشت گردی کو موضوع بنایا گیا ہے دہشت گردی کے نتیجے میں فوت شدگان اور ان فوت شدگان کی روحیں اپس میں بحث یا گفتگو کرتی نظر آتی ہیں۔ دہشت گردی ۲۱ویں صدی کا خاص موضوع بن گیا ہے۔ اس موضوع پر بہت لکھا گیا ہے، لیکن پاکستان کے پس منظر میں اور موضوع کے تنوع کے حوالے سے یہ ایک نئی صورت گری ہے۔ مرزا ادیب کا افسانہ اصول کی خاطر میں ایک پراپرٹی ڈیلر بھتیجے کا نفسیاتی تجزیہ پیش کیا گیا ہے اور اس سے پراپرٹی ڈیلر ذہن کو بیان کیا گیا ہے۔ پراپرٹی ڈیلر اس معاشرے کے اندر بہت اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن یہ سچ ہے کہ پراپرٹی ڈیلر کے حوالے سے اردو زبان و ادب میں لکھے گئے افسانے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یہ ایک نیا اچھوتا موضوع اردو ڈائجسٹ میں شائع کیا گیا۔ پردے کے پیچھے کی عورت شکیلہ رفیق کا افسانہ ہے جس میں ووٹ دینے والے فرد کی نفسیات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ نیا موضوع نہیں ہے، الیکشن انتخاب، ووٹ ، فرد، فرد کا ووٹ ڈالنا یہ موضوعات ہمارے ہاں مدت مدید سے زیر بحث رہے ہیں۔ شکیلہ رفیق نے اس میں کوئی نیا شامل نہیں کیا بلکہ پہلے سے موجود لکیر کے اوپر ہی انہوں نے آگے قدم بڑھایا ہے۔ تاہم رضیہ بٹ کا افسانہ اکتالیس منزل جدید ترقی یافتہ دور میں پیش آمدہ موضوعات کے حوالے سے ایک اہم افسانہ ہے۔ اس افسانے میں رضیہ بٹ جدید دور کی بلند ترین منازل اور پھر ان میں لفٹ کے ذریعے بلند ترین منزل پر پہنچنا اور اگر لفٹ خراب ہو جائے تو اس کے نتیجے میں لفٹ کے ذریعے سفر کرنے والوں کی ذہنی اور جسمانی تھکاوٹ کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ موضوع جدید دور کا ہے اور اس موضوع پر بہت کم لکھا گیا ہے، یوں اگر موضوع کے حوالے سے بات کریں تو اردو ڈائجسٹ میں جہاں روایتی موضوعات پر مشتمل افسانے شائع کیے گئے ہیں وہیں جدید دور سے متعلقہ موضوعات پر بھی بات ہوئی ہے۔ تاہم یہ حقیقت بہر حال تسلیم شدہ ہے کہ اردو ڈائجسٹ میں زیادہ تر افسانے روایتی موضوعات پر شائع کیے گئے اور ایسے موضوعات جن کا تعلق جدید دور سے ہے وہ تعداد میں کم ہیں، تاہم اس سے یہ مراد بھی نہیں ہے کہ اردو ڈائجسٹ نے محض روایتی مضامین پر زور دیا ہے

بلکہ جدید دور کے مسائل پر بھی توجہ مرکوز کی ہے۔ اردو ڈائجسٹ نے نا صرف روایت کا خیال رکھا ہے بلکہ تنوع، جدت اور عہد حاضر میں پیش آنے والے موضوعات پر بھی توجہ مرکوز کی ہے۔

مقالے کی تفویض شدہ مدت کے دوران جو افسانے "اردو ڈائجسٹ، سیارہ ڈائجسٹ اور حکایت ڈائجسٹ میں شائع کیے گئے۔ ان کا فکری اور فنی نیز تجزیاتی موازنہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اردو ڈائجسٹ میں جو افسانے شائع کیے گئے۔ ان میں سے بہت کم ایسے افسانے ہیں جنہیں ماٹھا افسانہ کہا جا سکتا ہے۔ زیادہ تر افسانے، ان کے موضوعات فکری اور فنی لحاظ سے پختگی کے حامل ہیں اور انہیں اعلیٰ ادب میں شامل کیا جا سکتا ہے، خاص طور پر آنندی کو اس حوالے سے اہمیت حاصل ہے۔ انتظار حسین کا "دوسرا راستہ "نجم الحسن رضوی کا "مردہ گھر" شکیلہ رفیق کا "پردے کے پیچھے کی عورت" مرزا ادیب کا "اصول کی خاطر" وغیرہ ایسے افسانے ہیں جنہیں اعلیٰ ادب میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ ان کے موضوعات پر غور کیا جائے، ان کی فکری اور فنی خصوصیات کا جائزہ لیا جائے تو یہ اعلیٰ افسانے ہیں، تاہم خدیجہ مستور کا "سہرا" اور خدیجہ مستور ہی کا "ٹھنڈا میٹھا پانی" نیز رضیہ بٹ کا اکتالیس منزل" ایسے افسانے ہیں، جنہیں کسی حد تک ماٹھا افسانہ کہہ سکتے ہیں۔ خاص طور پر خدیجہ مستور کا افسانہ "ٹھنڈا میٹھا پانی" اپنے اختتام تک بھی قاری پر زیادہ اثرات مرتب کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ اگر مجموعی طور پر افسانوں کے معیار کی بات کی جائے تو اردو ڈائجسٹ کے افسانے شائع کرنے کا معیار بلند ہے۔

اردو ڈائجسٹ میں شائع شدہ ان افسانوں کے کرداروں کا تجزیہ کیا جائے تو ہمیں زیادہ تر کردار پختہ منجھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تاہم کہیں کہیں ایسے کردار بھی تخلیق کیے گئے ہیں جنہیں اعلیٰ کردار نگاری کی مثال کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ نجم الحسن رضوی کے افسانے "مردہ گھر" میں بہت سے کردار پیش کیے گئے ہیں، لیکن مرکزی کردار یہاں موجود نہیں ہے اور مختلف کردار بحث و تمحیص کرتے نظر آتے ہیں۔ مباحثہ کر رہے ہیں اور غور کر رہے ہیں کہ انہیں بم دھماکہ کے نتیجے میں مار دیا گیا۔ ان کی زندگیاں چھین لی گئیں۔ ایسا کیوں ہوا۔ ان کا کیا قصور تھا۔ اس بات کو مختلف کردار اگے بڑھاتے ہیں اور یہ کہنا کہ یہاں اس افسانے "مردہ گھر" کا کوئی مرکزی کردار موجود ہے، درست نہیں۔ مصنف ایسا کوئی کردار تخلیق نہیں کر پائے۔ اس افسانے کو مکالماتی افسانے کے روپ میں دیکھ سکتے ہیں یا پھر بیانیہ افسانہ کہہ سکتے ہیں۔ مرزا ادیب کا افسانہ "اصول کی خاطر" میں بھتیجے کا کردار بہت بہتر انداز میں تخلیق کیا گیا ہے چچا کا کردار جس طرح سے تخلیق ہوا ہے، ایک سادہ عام سا آدمی لیکن بھتیجے کا کردار بہت ہی محنت سے تخلیق کیا گیا ہے اور جو مکالمے یا گفتگو بھتیجے کی

زبان سے ادا کی گئی ہے وہ بھی اچھی ہے۔ یوں کہہ سکتے ہیں کہ مرزا ادیب نے حسب معمول دو اچھے کردار اپنے اس افسانے میں تخلیق کیے ہیں۔ چچا اور بھتیجا۔ بھتیجے کا کردار چچا کی نسبت زیادہ بہتر ہے اور یہی مرکزی کردار کہا جا سکتا ہے۔ خدیجہ مستور کا افسانہ "سہرا" میں ماں اور اس کے دو بیٹے ماجد اور ساجد بنیادی طور پر تین ہی کردار ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ماجد کا کردار بہت تھوڑی دیر کے لیے ہمارے سامنے موجود رہتا ہے جبکہ ساجد کا کردار اخری وقت تک یہاں موجود ہے۔ ساجد کا کردار مرکزی کردار ہے اور ایک ایسا کردار تخلیق کیا گیا ہے جو ہمارے معاشرے میں کہیں کہیں نظر آتا ہے، جو اپنا مستقبل داؤ پر لگا کر بھی ماں کا بہت زیادہ خیال رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ ماں کے پاس ہی، اس کے کمرے میں وہ آرام کرتا ہے۔ ماں کا کردار، مامتا میں گھلا ہوا مرکزی نسوانی کردار ہے۔ جبکہ ساجد کا کردار ایک مشرقی بیٹے کا کردار نظر آتا ہے انتظار حسین کا افسانہ "دوسرا راستہ" میں بس کو اگر مرکزی کردار کہیں تو زیادہ درست ہو گا، کیونکہ جو چند کردار ہیں وہ ہلکی پھلکی گفتگو کر رہے ہیں۔ بس کہاں جا رہی ہے۔ ڈرائیور تمام لوگوں کا مرکز نگاہ ہے اور وہ بس کو لے کر کہاں جا رہا ہے اور ہوتے ہوتے یہ افسانہ جلوس سے نکل کر، ڈرائیور کے کردار سے نکل کر علامت کے اندر بدل جاتا ہے۔ "پردے کے پیچھے کی عورت" شکیلہ رفیق کا افسانہ ہے اور اس افسانے میں میاں اور بی بی بنیادی کردار ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ میاں کا کردار بنیادی طور پر مرکزی کردار ہے اور جو خاتون ہے اسے مرکزی نسوانی کردار کہا جا سکتا ہے اور ان کے درمیان گفتگو جاری رہتی ہے۔ لیکن یہاں شکیلہ رفیق کوئی جاندار اور یادرہ جانے والا کردار تخلیق نہیں کر پائیں۔ اسی طرح رضیہ بٹ کا افسانہ "اکتالیس منزل" اگرچہ کہانی، پلاٹ، موضوع کے اعتبار سے اعلیٰ افسانہ ہے، لیکن دو کرداروں کے مکالمے، ان کی گفتگو کے باوجود ایسا کردار نظر نہیں آتا جس سے زندہ رہ جانے والا یا قاری کے ذہن میں نقش ہو جانے والا کردار قرار دے سکیں۔ غلام عباس کا افسانہ "اننڈی" بھی ایسا ہی ایک افسانہ ہے جس میں بہت سے کردار ہیں اور معاشرہ بنیادی کردار بن جاتا ہے۔ طوائف ایک اور کردار کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے لیکن اس میں کوئی ایک کردار سارے ماحول پر چھا جانے والا کردار نہیں ہے۔ یہاں طوائف سمٹ کر باقاعدہ کردار کی صورت میں اجاتا ہے معاشرہ یا اس کے اندر جو مولوی صاحب ہیں کسی کردار کو مرکزی کردار نہیں کہہ سکتے۔ "مینوں لے چلا بابلا" خدیجہ مستور کا آزادی کے حوالے سے اہم افسانہ ہے۔ اس میں اغوا ہونے والی اور زیادتی کا نشانہ بننے والی بچی کا کردار مرکزی کردار قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک ایسا کردار ہے جو قاری کے ذہن میں نقش ہو جاتا ہے اور قاری اسے بھلا نہیں سکتا۔ بلوائی ایک اور کردار کی صورت نظر آتے ہیں، لیکن وہ مرکزی کردار نہیں ہیں، بچی ہی مرکزی کردار ہے۔

اس کے علاوہ خدیجہ مستور ہی کا ایک اور افسانہ "ٹھنڈا میٹھا پانی" میں ماں کا کردار مرکزی کردار ہے، جو جنگ کے خدشات اور اس کے نتیجے میں ہونے والی تباہی سے بچانے کے لیے اپنے بچوں کو ملتان لے جاتی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو اس افسانے کے اندر ماں کا کردار اہم کردار کہا جاسکتا ہے اور بہت حد تک ایک اچھی تخلیق یا اچھا تخلیقی کردار نظر آتا ہے۔ اردو ڈائجسٹ کے اندر حیران کن طور پر جو افسانے پیش کیے گئے ان میں سے خواتین افسانہ نگاروں نے نسوانی کرداروں کو زیادہ اہمیت دی اور ان کے اوپر زیادہ محنت صرف کی اور انہیں اچھا بہترین اور اعلیٰ کردار تخلیق کیا، جبکہ مرد افسانہ نگاروں نے زیادہ تر مرد کرداروں کے پر توجہ مرکوز کی ہے۔ مرد افسانہ نگاروں نے اچھے مردانہ کردار تخلیق کیے جب کہ خواتین افسانہ نگاروں کے ہاں ایسا نظر آتا ہے کہ انہوں نے اپنی تمام تر توانائیاں نسوانی کرداروں کو تخلیق کرنے میں، انہیں بنانے سجانے اور سنوارنے میں صرف کر دی ہیں۔ مجموعی حیثیت سے کردار نگاری کے حوالے سے اردو ڈائجسٹ میں شائع ہونے والے افسانوں کا جائزہ لیں تو اس میں سے چند کردار ایسے ہیں جنہیں زندگی نصیب ہوئی ہے۔ زیادہ تر کردار بہت اعلیٰ درجے کے تخلیق نہیں ہوئے۔

"اردو ڈائجسٹ" کے اندر شائع کیے جانے والے نو افسانوں کا پلاٹ کیسا ہے؟ اس حوالے سے بات کی جائے تو کچھ افسانوں کا پلاٹ بہت اعلیٰ ہے اور کچھ افسانوں کا پلاٹ بہت اعلیٰ نہیں ہے۔ ڈھیلا ڈھالا ہے منجھا ہوا نہیں ہے۔ مثلاً "مردہ گھر" افسانہ میں روحوں کے مابین گفتگو طوالت اختیار کر جاتی ہے اور اس وجہ سے پلاٹ کے اوپر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں اور وہ منجھا ہوا پلاٹ نہیں رہتا جبکہ مرزا ادیب کا افسانہ "اصول کی خاطر" ایک بہترین افسانہ ہے اور اس میں پلاٹ کے پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ "سہرا" خدیجہ مستور کا افسانہ ہے۔ یہاں اگرچہ محض تین کردار موجود ہیں لیکن ان کی گفتگو اور کہانی اتنی طوالت اختیار کر جاتی ہے کہ خدیجہ مستور کے دیگر افسانوں کی مانند پلاٹ منجھا ہوا باقی نہیں رہتا خدیجہ مستور جہاں ایک بہت اعلیٰ پائے کی ناول نگار ہے وہاں انہیں اس مقام کی افسانہ نگار نہیں کہا جاسکتا۔ "ٹھنڈا میٹھا پانی" میں بھی یہ صورتحال نظر آتی ہے بلکہ اس کہانی کے اندر تو کئی جھول نظر آتے ہیں اور کہیں کہیں تو بہت سی ایسی باتیں ملتی ہیں جو بعید از قیاس ہیں۔ انتظار حسین کا "دوسرا راستہ" ہو رضیہ بٹ کا افسانہ "اکتالیس منزل" یا پھر غلام عباس کا "انندی" خدیجہ مستور ہی کا "مینوں لے چلا بابلا" ایسے افسانے ہیں جن کا پلاٹ، اس کی بنت اعلیٰ پائے کی ہے اور ریاضیاتی سطح پر اس پلاٹ کی تخلیق کی گئی ہے۔ خاص طور پر آنندی کی بات کریں تو یہاں پلاٹ بہت ہی محنت کے ساتھ، سمجھ بوجھ

کے ساتھ، فکر کے ساتھ تخلیق کیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ افسانہ دیگر خوبیوں کے ساتھ ساتھ پلاٹ کے لحاظ سے بھی اعلیٰ افسانہ اور اعلیٰ ادب قرار دیا جاتا ہے۔ "پردے کے پیچھے کی عورت" کا پلاٹ گٹھا ہوا نہیں ہے ۔اس کو بہت ہی اعلیٰ پایا کا افسانہ نہیں کہا جاسکتا کیونکہ پلاٹ کے اندر کچھ غیر ضروری تفاصیل کا درانا، افسانے کا اغاز، منتہا اور انجام کو ریاضیاتی سطح پر انجام دیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے پلاٹ کے اندر مسائل پیدا ہوئے ہیں۔ اردو ڈائجسٹ میں شائع ہونے والے ان نو افسانوں میں سے زیادہ تر افسانوں کے پلاٹ کی بنت اعلیٰ درجہ پر کی گئی ہے۔ اس لیے انہیں اعلیٰ درجے کا افسانہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

اردو ڈائجسٹ میں شائع ہونے والے افسانوں کا اسلوب سلیس اور رواں ہے، تاہم تمام افسانوں کا اسلوب ایک سا نہیں ہے۔ چونکہ یہ افسانے مختلف افسانہ نگاروں نے تحریر کیے ہیں اس وجہ سے تمام افسانوں کا اسلوب یکساں ہو بھی نہیں سکتا، تاہم ایک بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ افسانوی مجموعے، ناول اور ڈائجسٹ کا اسلوب مختلف ہوتا ہے۔ ڈائجسٹ کا قاری زیادہ تر عام آدمی ہوتا ہے۔ بہت کم ادیب یا شاعر ڈائجسٹ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ زیادہ تر گھریلو خواتین یا عام قاری ڈائجسٹ سے استفادہ کرتا ہے، چنانچہ ڈائجسٹ کا اسلوب قاری کو مد نظر رکھ کر ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود اردو ڈائجسٹ میں کچھ افسانوں کا اسلوب بہت اعلیٰ پایا کا ہے۔ مثال کے طور پر آنندی کا اسلوب عامیانہ اسلوب نہیں ہے۔ غلام عباس نے زندگی میں بہت بڑی تعداد میں افسانے تحریر نہیں کیے لیکن جتنے افسانے انہوں نے تخلیق کیے ہیں۔ ان کا اسلوب بہت محنت سے تخلیق کیا گیا ہے۔ آنندی جہاں باقی خوبیوں کے لحاظ سے غلام عباس کا شاہکار ہے۔ وہیں اسلوب کے حوالے سے بھی یہ غلام عباس کا شاہکار افسانہ ہے۔ اسی طرح انتظار حسین کا افسانہ دوسرا راستہ نیز مرزا ادیب کا افسانہ اصول کی خاطر اسلوب کا شاہکار کہے جاسکتے ہیں۔ رضیہ بٹ بھی بہت حد تک اچھا اسلوب تخلیق کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں۔ انتظار حسین اور غلام عباس کا اسلوب عام قاری کی سطح سے اوپر اٹھتا ہوا نظر آتا ہے۔ جبکہ خدیجہ مستور اور رضیہ بٹ کا اسلوب نیز شکیلہ رفیق اور نجم الحسن رضوی وغیرہ کا اسلوب عام قاری کی سطح کا اسلوب ہے۔ مردہ گھر، سہرا، اکتالیس منزل، مینوں لے چلے بابلا، ٹھنڈا میٹھا پانی، ان تمام کا اسلوب رواں ہیے، سادہ ہے، سلیس ہے اور عام قاری کی سطح کا اسلوب ہے۔ اگر یہ کہیں کہ یہ اسلوب ڈائجسٹ کی سطح کا اسلوب ہے تو غلط نہ ہو گا۔ تاہم آنندی، اصول کی خاطر اور دوسرا راستہ کا اسلوب عام قاری کی سطح سے بلند ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ مجموعی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ اردو ڈائجسٹ میں زیادہ افسانے ڈائجسٹ کے اسلوب اور قاری کو مد نظر رکھ کر

شائع کیے گئے ہیں جبکہ تھوڑے افسانے ایسے ہیں جنہیں ادب کی خاطر یا اعلیٰ اسلوب کے پیش نظر شائع کیا گیا ہے۔

ہمارے پیش نظر ان افسانوں کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ جائزہ لینا ہے کہ کیا یہ افسانے ادب عالیہ میں شمار ہوتے ہیں، مقبول عام ادب میں شمار ہوتے ہیں یا پھر انہیں پلپ ادب کا حصہ خیال کیا جائے۔ کسی بحث کو نتیجہ خیز بنانے کے لیے اس بحث کا آغاز مختلف پیرامیٹرز کو مد نظر رکھ کر کیا جاتا ہے۔ اردو ڈائجسٹ میں شائع ہونے والے افسانوں کا موضوعاتی سطح پر جائزہ لیا تو اس کی کہانی، پلاٹ کردار نگاری اور اسلوب پر تفصیل سے بات کی اور موضوع، کہانی، کردار نگاری، پلاٹ کی بنت اور اسلوب کی نگارش کے مد نظر ہمیں یہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے کہ اردو ڈائجسٹ میں شائع شدہ ان افسانوں کو کس ادب کی قبیل میں شامل کیا جائے ۔اردو ڈائجسٹ اردو زبان و ادب کا ایک بلند پایا اور قابل اعتبار ڈائجسٹ ہے جسے ایک گھر کے مختلف افراد ماں بیٹا، باپ بیٹی سبھی پڑھ سکتے ہیں۔ یہ ایسا ڈائجسٹ نہیں کہ جس میں ایسا ادب شامل ہو جسے ہمارے روایت پسند یا مذہبی گھرانوں میں ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ جب ان تمام افسانوں کا بلا تعطل مطالعہ کرتے ہیں اور ان افسانے کی پرکھ مختلف اصولوں کی روشنی میں کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو ڈائجسٹ میں شائع شدہ افسانوں میں سے کوئی بھی افسانہ پلپ ادب میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں پر نہ اس طرح کا کہیں اسلوب ہے نہ ہی کوئی ایسے کردار تخلیق کیے گئے ہیں، نہ ہی ایسی کہانی ہے چنانچہ پلپ کی ذیل میں کوئی افسانہ نہیں اتا۔ چنانچہ دو کیٹگریز میں یعنی ادب عالیہ اور مقبول عام ادب میں کن افسانوں کو شامل کیا جا سکتا ہے اور کن افسانوں کو شامل نہیں کیا جا سکتا اگر درج بالا اصولوں کی روشنی میں دیکھیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو ڈائجسٹ میں غلام عباس کا افسانہ آنندی، مرزا دیب کا افسانہ اصول کی خاطر، انتظار حسین کا افسانہ دوسرا راستہ، خدیجہ مستور کا افسانہ مینوں لے چلے بابلا، نجم الحسن رضوی کا افسانہ مردہ گھر بہت حد تک اعلیٰ ادبی سرمائے میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ بلاشبہ ان تمام افسانوں میں ادب عالیہ کا شاہکار آنندی کو قرار دیا جائے گا۔ اس کے بعد مذکورہ بالا باقی افسانے ادب عالیہ میں شامل ہوں گے۔ مقبول عام نثر یا مقبول عام ادب میں خدیجہ مستور کا سہرا، خدیجہ مستور ہی کا ٹھنڈا میٹھا پانی، رضیہ بٹ کا ۴۱ منزل، شکیلہ رفیق کا پردے کے پیچھے کی عورت وغیرہ کو شامل کیا جائے گا اور مقبول عام نثر یا جس سے ڈائجسٹ کی نثر کہا جا سکتا ہے یا ڈائجسٹ کی کہانی کہا جا سکتا ہے۔ یہ افسانے ڈائجسٹ کی

نسل یا ڈائجسٹ کے افسانے یا مقبول عام نثر پر پورا اترتے ہیں۔ اس کی وجوہات اور اس کے اصول کے تقاضے تفصیل کے ساتھ ابتدا ہی میں پیش کر دیے گئے ہیں۔

حکایت ڈائجسٹ میں صرف دو افسانے شائع ہوئے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اردو ڈائجسٹ اور سیارہ ڈائجسٹ افسانہ چھاپنے یا شائع کرنے کے حوالے سے بہت زیادہ سنجیدہ ہیں جبکہ حکایت ڈائجسٹ نے محض دو افسانے شایع کیے اور یہ بھی مشہور افسانہ نگاروں کے افسانے ہیں۔ مثلاً ایک حقیقت ایک افسانہ ممتاز مفتی کی تحریر ہے جبکہ تماشہ منشایاد کی تحریر ہے۔ گویا کہ حکایت ڈائجسٹ نے ایک بھی افسانہ ایسا شائع نہیں کیا جو بنیادی طور پر کسی عام یا نئے لکھنے والے کا ہو۔ ان دونوں افسانوں میں بلا شبہ ممتاز افسانہ نگاروں کے نام آتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ممتاز مفتی کا افسانہ ایک حقیقت ایک افسانہ کوئی بہت معیاری یا شاہکار افسانہ نہیں ہے۔ اس افسانے کی کہانی اگرچہ لڑکی اور لڑکے کے حوالے سے حقیقت پسندانہ ہے لیکن گاؤں تار جانا اور پھر پورے گاؤں کا اس تار کو نہ پڑھنا اور تار کی ڈر سے کہ ضرور ہیرو کو کچھ ہو گیا ہے گاؤں والوں کا بھاگے چلے آنا بالکل بھی حقیقت سے بعید از قیاس نظر آتا ہے۔ اسی طرح جب اس افسانے کی کہانی پر غور کرتے ہیں تو وہ بہت زیادہ حقیقت کے قریب نظر نہیں آتی۔ جہاں تک ہیرو اور کس حد تک نسوانی بنیادی کردار کی بات ہے تو وہ حقیقت سے قریب تر ہے لیکن گاؤں والوں کا اس طرح سے وارد ہو جانا یہ بعید از قیاس نہیں ہے۔ اس افسانے کے اندر محض تین کردار نظر آتے ہیں ایک افسانے کا ہیرو افسانے کی ہیروئن اور ہیرو کا دوست جن جو آپس میں گفتگو کرتے نظر آتے ہیں ہیروئن نہ تو بولتی ہے، نہ محض اس کی ایک جھلک ہمیں نظر آتی ہے اور ہمیں اس بات کے علم نہیں ہے کہ وہ محبت کرنے کے علاوہ اس کے نظریات اس کے خیالات جذبات تصورات تفکرات کیا ہیں جبکہ ہیرو بھی ایک سست کاہل اور غیر متحرک فرد کے طور پر ہمارے سامنے آتا ہے جو محض بات کرتا ہے۔ جذبے کا اظہار کرتا ہے اور اس میں حق حقیقت کا سامنے سامنا کرنے یا ہیروئن کو حاصل کرنے کا کوئی جذبہ یا تحرک نظر نہیں آتا۔ اسی طرح اس کا دوست بھی کوئی بہت متحرک کردار نہیں نظر آتا گویا کہ یہ تینوں کردار ہی جامد کردار ہیں جہاں تک افسانے کے پلاٹ کا تعلق ہے تو وہ بھی ڈھیلا ڈالا سا پلاٹ ہے اور اس کی بنیاد ابتدا انتہا یا انت انجام کوئی بہت ہی سوچے سمجھا بہت اعلیٰ قسم کا نہیں ہے۔ اس کے اندر بہترین کردار نگاری نظر نہیں آتی۔ کہانی کوئی بہت اعلیٰ نہیں ہے۔ اسلوب بہر حال ممتاز مفتی کا اعلیٰ ہے چنانچہ اگر یہ کہیں کہ سب افسانے کے اندر کوئی خوبی ہے تو وہ ممتاز مفتی کا اسلوب ہی ہے۔

اردو ڈائجسٹ میں شائع ہونے والے افسانوں کا اسلوب سلیس اور رواں ہے، تاہم تمام افسانوں کا اسلوب ایک سا نہیں ہے۔ چونکہ یہ افسانے مختلف افسانہ نگاروں نے تحریر کیے ہیں اس وجہ سے تمام افسانوں کا اسلوب یکساں ہو بھی نہیں سکتا، تاہم ایک بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ افسانوی مجموعے، ناول اور ڈائجسٹ کا اسلوب مختلف ہوتا ہے۔ڈائجسٹ کا قاری زیادہ تر عام آدمی ہوتا ہے۔ بہت کم ادیب یا شاعر ڈائجسٹ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ زیادہ تر گھریلو خواتین یا عام قاری ڈائجسٹ سے استفادہ کرتا ہے ، چنانچہ ڈائجسٹ کا اسلوب قاری کو مد نظر رکھ کر ترتیب دیا جاتا ہے۔اس کے باوجود اردو ڈائجسٹ میں کچھ افسانوں کا اسلوب بہت اعلیٰ پائے کا ہے۔ مثال کے طور پر آنندی کا اسلوب عامیانہ اسلوب نہیں ہے۔ غلام عباس نے زندگی میں بہت بڑی تعداد میں افسانے تحریر نہیں کیے لیکن جتنے افسانے انہوں نے تخلیق کیے ہیں۔ ان کا اسلوب بہت محنت سے تخلیق کیا گیا ہے۔ آنندی جہاں باقی خوبیوں کے لحاظ سے غلام عباس کا شاہکار ہے۔ وہیں اسلوب کے حوالے سے بھی یہ غلام عباس کا شاہکار افسانہ ہے۔ اسی طرح انتظار حسین کا افسانہ دوسرا راستہ نیز مرزا ادیب کا افسانہ اصول کی خاطر اسلوب کا شاہکار کہے جاسکتے ہیں۔ رضیہ بٹ بھی بہت حد تک اچھا اسلوب تخلیق کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں۔ انتظار حسین اور غلام عباس کا اسلوب عام قاری کی سطح سے اوپر اٹھتا ہوا نظر آتا ہے۔ جبکہ خدیجہ مستور اور رضیہ بٹ کا اسلوب نیز شکیلہ رفیق اور نجم الحسن رضوی وغیرہ کا اسلوب عام قاری کی سطح کا اسلوب ہے۔ مردہ گھر، سہرا، اکتالیس منزل، مینوں لے چلے بابلا، ٹھنڈا میٹھا پانی، ان تمام کا اسلوب رواں، سادہ اور سلیس ہے اور عام قاری کی سطح کا اسلوب ہے۔

یہ اسلوب ڈائجسٹ کی سطح کا اسلوب ہے تو غلط نہ ہو گا۔ تاہم آنندی، اصول کی خاطر اور دوسرا راستہ کا اسلوب عام قاری کی سطح سے بلند ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ مجموعی طور پر اردو ڈائجسٹ میں زیادہ افسانے ڈائجسٹ کے اسلوب اور قاری کو مد نظر رکھ کر شائع کیے گئے ہیں جبکہ تھوڑے افسانے ایسے ہیں جنہیں ادب کی خاطر یا اعلیٰ اسلوب کے پیش نظر شائع کیا گیا ہے۔

حکایت ڈائجسٹ کے بعد سیارہ ڈائجسٹ کی بات کریں گے۔ سیارہ ڈائجسٹ میں سات افسانے شائع کیے گئے اور یہ افسانے اچھے بھی ہیں۔ اس میں کمزور افسانے بھی ہیں۔ اعلیٰ پائے کے افسانے بھی ہیں ایک ملا جلا رجحان نظر آتا ہے لیکن یہ بات اپنی جگہ بہت بڑی حقیقت ہے کہ جہاں اردو ڈائجسٹ نے نو افسانے شائع کیے۔ وہیں سیارہ ڈائجسٹ نے سات افسانے شائع کیے۔ یوں اردو کے بعد سیارہ ڈائجسٹ کے افسانے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں اور اس کے بعد حکایت ڈائجسٹ کی بات کی جائے گی۔

اگر یہ کہیں کہ حکایت ڈائجسٹ نے جو افسانے شائع کیے۔ان میں سے ۵۰ فیصد اعلیٰ پائے کے افسانہ شائع کیے جب کہ ۵۰ فیصد اعلیٰ پایا کا افسانہ نہیں ہے۔یوں اگر یہ کہا جائے کہ اردو ڈائجسٹ کے افسانے اس حوالے سے زیادہ وکی اور زیادہ اعلیٰ پائے کے ہیں تو ہمیں اس بات کو تسلیم کرنا پڑے گا۔

ہمارے پیش نظر اس باب میں چار ناولز ہیں جن میں سے پہلا ناول "بھکاری" شہزادہ مارک ٹوین کی تخلیق ہے اور یہ ماہنامہ اردو ڈائجسٹ جون ۲۰۱۹ء اور ۲۰۱۷ء کے شمارے میں شائع کیا گیا۔ اس کے بعد سید وسیم رضا کا تخلیق کردہ ناول "تاروں بھری رات" ماہنامہ حکایت میں شائع کیا گیا اور یہ ناول ماہنامہ حکایت کے جولائی ۲۰۱۷ء مئی جولائی، اگست اور ستمبر کے شماروں میں قسط وار شائع ہوا۔ تیسرا ناول جو ہمارے پیش نظر ہے وہ ہے "رکھیل" ریاض عاقب کولر کا تخلیق کردہ ناول ہے اور یہ ناول بھی ماہنامہ حکایت کے شمارہ جنوری ۲۰۱۷ء فروری مارچ، مئی ،جون، جولائی، اگست ،اکتوبر ، ستمبر، نومبر اور دسمبر ۲۰۱۹ ء میں قسط وار شائع ہوا۔ چوتھا ناول جو اس باب میں شامل کیا گیا ہے وہ ہے "بردہ" یہ ناول بھی ریاض عاقب کی تصنیف ہے۔ یہ ناول ماہنامہ حکایت کے مارچ مئی جولائی اگست اکتوبر اور نومبر ۲۰۱۹ کے شماروں میں قسط وار شائع ہوا چونکہ اس باب میں ہمارے پیش نظر یہی چار ناول ہیں ان کا آپس کا موازنہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارا مطالعہ اور تحقیق ثابت کرتی ہے کہ یہ چار ناول صرف دو ڈائجسٹوں کے اندر شائع ہوئے۔ پہلا ناول "بھکاری شہزادہ" اردو ڈائجسٹ میں شائع کیا گیا جب کہ باقی تین ناول یعنی "تاروں بھری رات"، "رکھیل" اور بردہ ماہنامہ حکایت میں شائع کیے گئے گویا کہ ماہنامہ سیارہ میں اس دوران ایک بھی ناول شائع نہیں ہوا۔ یوں اس موازنے سے ماہنامہ سیارہ کو خارج کیا جائے گا یا سمجھا جائے گا اس کے بعد صرف دو ناول یعنی اردو ڈائجسٹ اور ماہنامہ حکایت میں شائع ہوئے حقیقت تو یہ ہے کہ ان چاروں ناولوں کا مزاج اور چاروں کا موضوع یا کہانی بہت دلچسپ ہے اور ان کے موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے۔ شاید ہی اردو زبان و ادب میں بھکاری شہزادہ جیسا جیسے موضوع پر پہلے ناول تحریر کیا گیا ہو۔ اگرچہ اس ناول کے اندر حقیقت سے قریب تر بات کم ہے جبکہ جو ماہنامہ حکایت میں ناول شائع کیے گئے ان میں حقیقت سے قریب تر زیادہ باتیں ملتی ہیں۔ "بھکاری شہزادہ" اپنی دلچسپی توجہ بر قرار رکھتا ہے، تجسس بھی اس کے اندر موجود ہے اور اسی طرح کردار نگاری بھی محنت سے کی گئی ہے، منظر نگاری اور محاکات نگاری بھی ہے، گویا کہ اس کی فکری اور فنی لحاظ سے اسے ایک بہترین ناول قرار دیا جا سکتا ہے لیکن اس کو داستانوی رنگ میں تو دیکھ سکتے ہیں یعنی آپ دیکھیے کہ اس کے اندر جس طرح سے ایک شہزادہ عام سڑک

پر آجاتا ہے اور بھکاری بن کے رہ جاتا ہے اور بھکاری شہزادے کا روپ دھار لیتا ہے کیا یہ داستانوی رنگ نہیں ہے۔ یہاں ناول سے بڑھ کے ہمیں داستانوی رنگ نظر آتا ہے کیونکہ حقیقت میں حقیقت کی دنیا میں ایسا ممکن نہیں ہے۔ شہزادہ شہزادہ ہوتا ہے اور بھکاری بھکاری ہوتا ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ شہزادی کی جگہ بھکاری لے لے اور بھکاری کی جگہ شہزادہ لے لیے، پھر بھی اگر شہزادہ بھکاری بن جائے تو یا بھکاری پن کا روپ دھار لے تو یہ بعید از قیاس نہیں ہے اور عوام اسے پہچان نہ سکیں لیکن بھکاری شہزادہ بن جائے شہزادے کے روپ دھار لیں اور سلطنت میں کسی کو پتہ نہ چل سکے۔ اس کے طور اطوار اس کے رہن سہن اس کا حسن ایک ایک چیز ہوتی کو پرکھا جاتا ہے اور کسی کو پتہ نہ چل سکے تو یہ بڑی بعید از قیاس بات نظر آتی ہے۔ یوں ہمیں اس کے اندر داستانوی رنگ نظر آتا ہے یا ایک مافوق الفطرت کردار یا مافوق الفطرت فضا ملتی ہے۔ یوں یہ ناول ناول پن سے قریب تر نہیں ہے بلکہ یہ داستان سے قریب تر ہے۔ اردو ڈائجسٹ میں عام طور پر جو ناول اور کہانیاں شائع ہوتی ہیں۔ وہ اعلیٰ پائے کی ہیں۔

جب بقیہ تین ناول جو ماہنامہ حکایت میں شائع ہوئے اس کے ساتھ موازنہ کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ماہنامہ حکایت میں شائع ہونے والے یہ تین ناول ماہنامہ اردو ڈائجسٹ میں شائع ہونے والے ناول "بھکاری شہزادہ" سے قدرے بہتر ہیں۔ "تاروں بھری رات" ہی کو دیکھیے کہ یہاں مطالعہ مشاہدہ گھل مل گئے ہیں اور پھر جس طرح سے ثقافت اس میں شامل ہوئی ہے۔ مختلف انداز میں رحم دلی کے جذبات آگئے ہیں اور مختلف رنگوں میں گوند کر جس طرح اس کہانی کی بنت ہوئی ہے۔ وہ لاجواب ہے خاص طور پر جس طرح سے علاقائی کلچر کو اس کہانی کے اندر سمویا گیا ہے۔ وہاں اس کی تعریف نہ کرنا بے جا ہوگا کیونکہ عاقب ریاض کوہلر نے واقعی اس کے لیے بڑی محنت کی ہے اور بہت ہی کام کیا ہے۔ اس کے بعد کا جو دوسرا ناول ہے عاقب ریاض کوہلر کا جو ماہنامہ حکایت میں شائع ہوا ہے۔ "رکھیل" کو جب پڑھتے ہیں تو "یہ تاروں بھری رات" کے برابر تو نہیں ہے، یہ اس سے کم تر موضوع اور کہانی کا ناول ہے کیونکہ ناول کے لیے ایک بات یہ ضروری ہے کہ بھلے اس کے کردار اس کے منظر اس کی کہانی یا دیگر فنی لوازمات پورے ہوں، جامع ہوں، مکمل ہوں لیکن اگر وہ ناول حقیقت سے قریب تر نہیں ہے۔ زندگی کو حقیقت کی آنکھ سے نہیں دیکھتا تو اس میں کچھ کمی بہر حال باقی رہ جاتی ہے۔ ہمیں یہ ناول پڑھ کے کہیں کہیں یہ کمی محسوس ہوئی ہے تو بے شک فنی لحاظ سے اور کئی لحاظ سے ناول اعلیٰ پائے کا ہے لیکن جس وقت اس ناول کا موازنہ "تاروں بھری رات" سے کرتے ہیں تو پھر یہ اچھا خاصا پیچھے

نظر آتا ہے اور "تاروں بھری رات" اس کی بنسبت زیادہ بہتر اور اعلیٰ پائے کا ناول نظر آتا ہے۔ ہاں یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ تناوش کا کردار خوبصورت ہے اعلیٰ کردار ہے۔ اس کے بعد ناول "بردہ" تخلیق مطالعہ مشاہدہ اور تحقیق کے نتیجے میں تخلیق ہونے والی ایک اعلیٰ پائے کی کہانی ہے۔ خاص طور پر اس ناول کے اندر تحقیق اور مطالعہ کا عنصر غالب نظر آتا ہے کیونکہ یہ تاریخی ناول ہے جہاں "تاروں بھری رات" ایک معاشرتی ناول ہے ،وہاں "رکھیل" معاشی ناول ہے وہاں "بردہ" تاریخی ناول ہے اسی طریقے سے جو اردو ڈائجسٹ کا ناول ہے "بھکاری شہزادہ" وہ بھی کسی حد تک تاریخ کے ساتھ لگا کھاتا ہے اور اسی طرح سے اور اس میں داستانوی رنگ غالب ہے۔ اسے معاشرتی نہیں کہہ سکتے۔ اسے نفسیاتی یا تاریخی نہیں کہہ سکتے۔ وہ کیسا ناول ہے جو جس کے اندر داستانوی رنگ زیادہ پایا جاتا ہے جبکہ جو بقیہ تینوں ناول ہیں ان میں داستانوی رنگ نہیں ہے۔ ہاں ان میں کمی اور بیشی بہر حال موجود ہے یعنی دیکھا جائے تو "بردہ" ناول باقاعدہ طور پر عرب تاریخ پر لکھا گیا ایک ناول ہے جس میں مصنف بار بار تاریخ کی جانب پلٹتا ہے اور ہمیں تاریخ کے عروج و زوال انسانی معاشروں اور عرب معاشروں کی شکست ان کے رواج ان کے طور طریقے ان کا انداز جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے ہمارے سامنے یہ سوال کیا جائے کہ کیا ناول "بھکاری شہزادہ" اعلیٰ تخلیق ہے یا پھر "بردہ"، "رکھیل" اور "تاروں بھری رات" تو ہمیں یہ کہنے میں بہر حال باغی نہیں ہونا چاہیے کہ ماہنامہ حکایت میں شائع شدہ ناول دراصل دعوے ہیں اور ان کا قد کاٹھ ان کی فکر ان کے موضوعات اور ان کے کردار ان کی کہانی فکری اور فنی ہر حوالے سے اردو ڈائجسٹ میں چھپنے والے ناول "بھکاری شہزادہ" کے بنسبت بہت زیادہ بہتر ہیں۔

ماہنامہ حکایت میں جو تین ناول شائع کیے گئے یعنی "تاروں بھری رات"، "بردہ" اور "رکھیل" تو ان تینوں کا جب موازنہ کرتے ہیں کہ بردہ بقیہ تین ناولوں میں بہت بہتر ہے لیکن اگر اپنے معاشرے کو معاشرتی پس منظر کی جانچ کے حوالے سے بات کریں تو ان تینوں ناولوں میں جو ناول "تاروں بھری رات" ہے۔ وہ ہمیں اپنی کشش میں لے لیتا ہے. ماہنامہ حکایت میں شائع شدہ دو ناول یعنی "تاروں بھری رات" اور "بردہ "دوسرا ناول ہے۔ "بردہ" دونوں فنی لحاظ سے بڑے ناول کہے جاسکتے ہیں ان کی کہانی اور ان کے فکری و فنی لوازمات بہت خوب اور اعلیٰ ہیں۔

اس باب میں اگر یہ بات کریں کہ کس ڈائجسٹ نے زیادہ بہتر سے تخلیق پہ تخلیق کو پیش کیا ہے تو بلا شبہ یہ کہنا مشکل نہیں ہے کہ ماہنامہ اردو ڈائجسٹ نے اس میدان میں کچھ بڑی کامیابی کے جھنڈے نہیں

گاڑے جبکہ ماہنامہ حکایت جس کا نام ہی حکایت ہے یعنی کہانی ہے۔ ماہنامہ حکایت میں چھپنے والے جو ناول ہیں۔ وہ زیادہ اعلیٰ درجے کی تخلیقات ہیں اور ان کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے اور وہ کوئی رحم کی خاطر نہیں کوئی منت سے نہیں بلکہ وہ اس قابل ہیں کہ ان پر بات کی جائے پھر یہ کہ ان تینوں چاروں ناولز کے اندر کرداروں کا بہت سا فرق پایا جاتا ہے جو "بھکاری شہزادہ" ہے وہ بہت اعلیٰ پائے کے کردار تخلیق نہیں کر پایا جبکہ "بردہ" یا "تاروں بھری رات" اچھا تاثر رکھ پائے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ نجم الحسن رضوی، مردہ گھر، مشمولہ، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۷، شمارہ ۷)، لاہور، ۳۲۵-جی تھری، جوہر ٹاؤن، جولائی ۲۰۱۷ء، ص ۲۰۲

۲۔ مرزا ادیب، اُصول کی خاطر، مشمولہ، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۷، شمارہ ۸)، لاہور، اگست ۲۰۱۷ء، ص ۱۱۵

۳۔ خدیجہ مستور، سہرا، مشمولہ، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۷، شمارہ ۹)، لاہور، ستمبر ۲۰۱۷ء، ص ۱۴۳

۴۔ انتظار حسین، دوسرا راستہ، مشمولہ، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۷، شمارہ ۹)، لاہور، ۳۲۵-جی تھری، جوہر ٹاؤن، ستمبر ۲۰۱۷ء، ص ۲۱۹

۵۔ ناصر کاظمی کا شہر (غزل)، مرتب: تنویر الرحمٰن، اسلامک بک سنٹر، لاہور، اگست ۲۰۱۰ء، ص ۵۵

۶۔ شکیلہ رفیق، پردے کے پیچھے کی عورت، مشمولہ، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۸، شمارہ ۳)، لاہور، مارچ ۲۰۱۸ء، ص ۱۳۷

۷۔ رضیہ بٹ، اکتالیس منزل، مشمولہ، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۸، شمارہ ۷)، لاہور، اپریل ۲۰۱۸ء، ص ۸۶۔۸۷

۸۔ غلام عباس، آنندی، مشمولہ، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۸، شمارہ ۲)، لاہور، جولائی ۲۰۱۸ء، ص ۲۳۰

۹۔ خدیجہ مستور، مینوں لے چلے بابلا لے چلے وے، مشمولہ، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۸، شمارہ ۸)، لاہور، اگست ۲۰۱۸ء، ص ۱۴۳

۱۰۔ خدیجہ مستو، ٹھنڈا میٹھا پانی، مشمولہ، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۹، شمارہ ۵)، لاہور، مئی ۲۰۱۹ء، ص ۱۷۱

۱۱۔ ناصر کاظمی کا شہر (غزل)، مرتب: تنویر الرحمٰن، اسلامک بک سنٹر، لاہور، اگست ۲۰۱۰ء، ص ۵۶

۱۲۔ ممتاز مفتی، ایک حقیقت ایک فسانہ، مشمولہ، ماہنامہ حکایت (جلد ۴۹، شمارہ ۸)، لاہور، ۲۶- پٹیالہ گراؤنڈ، لنک میکلوڈ روڈ، اپریل ۲۰۱۹ء، ص ۲۱۵

۱۳۔ منشایاد، تماشا، مشمولہ، ماہنامہ حکایت (جلد ۴۹، شمارہ ۱۰)، لاہور، جون ۲۰۱۹ء، ص ۹۵

۱۴۔ نائلہ بلیغ الرحمٰن، لاڈلے میاں، مشمولہ، ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ (جلد ۵۷، شمارہ ۶)، لاہور، اللہ والا پرنٹرز، ریواز گارڈن، جون ۲۰۱۷ء، ص ۹۳

۱۵۔ بلونت سنگھ، چاند اور گلشن، ایضاً، ص ۱۲۱-۱۲۲

۱۶۔ جمیل احمد پال، ماسٹر جی، مشمولہ، ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ (جلد ۵۵، شمارہ ۳)، لاہور، مارچ ۲۰۱۸ء، ص ۴۳

۱۷۔ پرکاش کرشن، صاحب بہادر، ایضاً، ص ۴۶

۱۸۔ انتظار حسین، صبح کے خوش نصیب، مشمولہ، ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ (جلد ۵۶، شمارہ ۴)، لاہور، اپریل ۲۰۱۹ء، ص ۴۵

۱۹۔ محمد علی ڈاکٹر، بریک ڈاؤن، ایضاً، ص ۱۳۴

۲۰۔ ایضاً

۲۱۔ آسناتھ کنول، وحشتیں کیسی؟، مشمولہ، ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ (جلد ۵۶، شمارہ ۹)، لاہور، ستمبر ۲۰۱۹ء، ص ۴۷۔۴۸

۲۲۔ مارک ٹوین، بھکاری شہزادہ، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۷، شمارہ ۶)، لاہور، جون ۲۰۱۷ء، ص ۲۱۳

۲۳۔ سید وسیم رضا، تاروں بھری رات، ماہنامہ حکایت (جلد ۴۷، شمارہ ۱۱)، لاہور، جولائی ۲۰۱۷ء، ص ۳۶

۲۴۔ ایضاً، اگست ۲۰۱۷ء، ص ۳۷

۲۵۔ ایضاً، مئی ۲۰۱۸ء، ص ۸۸

۲۶۔ ایضاً، جولائی ۲۰۱۸ ء، ص ۴۱

۲۷۔ ایضاً، اگست ۲۰۱۸ء، ص ۸۰

۲۸۔ ایضاً، ستمبر ۲۰۱۸ء ص ۷۲

۲۹۔ ریاض عاقب کوہلر، رکھیل، مشمولہ، ماہنامہ حکایت (جلد ۴۹، شمارہ ۵)، لاہور، جنوری ۲۰۱۹ء، ص ۶۷

۳۰۔ ایضاً، فروری ۲۰۱۹ء، ص ۵۶-۵۷

۳۱۔ ایضاً، مارچ ۲۰۱۹ء، ص ۲۱۵

۳۲۔ ایضاً، مئی ۲۰۱۹ء، ص ۲۳۱

۳۳۔ ایضاً، جون ۲۰۱۹ء، ص ۲۱۱

۳۴۔ ایضاً، جولائی ۲۰۱۹ء، ص ۲۲۰

۳۵۔ ایضاً، اگست ۲۰۱۹ء، ص ۲۱۶-۲۱۷

۳۶۔ ایضاً، اکتوبر ۲۰۱۹ء، ص ۲۲۸

۳۷۔ ایضاً، ستمبر ۲۰۱۹ء، ص ۳۰۸

۳۸۔ محسن نقوی، ردائے خواب، ماورا پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۹۷

۳۹۔ ایضاً، نومبر ۲۰۱۹ء، ص ۲۱۶

۴۰۔ ایضاً، دسمبر ۲۰۱۹ء، ص ۲۳۶

۴۱. https://sohnidigest.com/romantic-urdu-novels/barda/ 4.2-2022 at 4-00 p.m

۴۲۔ ریاض عاقب کوہلر، بردہ، مشمولہ، ماہنامہ حکایت (جلد ۴۸، شمارہ ۱۰)، لاہور، مارچ ۲۰۱۹ء، ص ۴۸

۴۳۔ ایضاً، حکایت مئی ۲۰۱۹، ص ۶۳

۴۴۔ ایضاً، حکایت جولائی ۲۰۱۹ء، ص ۶۳

۴۵۔ ایضاً، حکایت جولائی ۲۰۱۹ء، ص ۷۰

۴۶۔ ایضاً، حکایت اگست ۲۰۱۹ء، ص ۸۸

۴۷۔ ایضاً، حکایت ستمبر ۲۰۱۹ء ص ۶۵

۴۸۔ ایضاً، حکایت ستمبر ۲۰۱۹ء، ص ۸۰

۴۹۔ ایضاً، حکایت اکتوبر ۲۰۱۹ء، ص ۵۰

۵۰۔ ایضاً، حکایت نومبر ۲۰۱۹ء، ص ۴۳

۵۱۔ ایضاً، حکایت نومبر ۲۰۱۹ء ص ۶۹

باب چہارم:

ماہنامہ ''اُردو ڈائجسٹ''، ''حکایت'' اور ''سیارہ ڈائجسٹ'' میں شائع ہونے والی دیگر تحریروں کا تقابلی مطالعہ

''اُردو ڈائجسٹ''، ''حکایت'' اور ''سیارہ ڈائجسٹ'' میں ۲۰۱۷ء تا ۲۰۱۹ء کے عرصہ میں شائع ہونے والی متفرق اصناف اور تحریریں جن میں اہم ترین آپ بیتی، شاعری، جگ بیتی، انٹرویوز اور ناقابل فراموش واقعات کی پیش کش کر کے تقابلی مطالعہ بیان کیا ہے۔

آپ بیتی کیا ہے؟

مطالعہ خود پر گزرنے والے حالات و واقعات کو تحریری صورت میں پیش کرنے کا نام آپ بیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اپنی کہانی اپنی زبانی بیان کرنا آپ بیتی کہلاتا ہے۔ کسی انسان کی اپنی سرگزشت بیان کرنے کا دوسرا نام آپ بیتی ہے۔ اردو زبان کے نامور مصنفین اور ادیبوں نے عام طور پر اپنی آپ بیتیاں لکھی ہیں۔ جیسا کہ جوش ملیح آبادی نے اپنی آپ بیتی ''یادوں کی بارات'' کے نام سے قلم بند کی ہے۔ اردو کے مشہور شاعر اور محقق احسان دانش نے اپنی آپ بیتی ''جہانِ دانش'' کے نام سے لکھی ہے اور مرزا ادیب نے اپنی آپ بیتی ''مٹی کا دیا'' لکھی اور ادب کی دنیا میں اپنا نام پیدا کیا۔

ادبی دنیا میں عام طور پر بہت سے لوگ اپنی اپنی آپ بیتیاں لکھتے رہتے ہیں اور اپنے تجربات اور حالات زندگی کو دلچسپ کہانی کی صورت میں بیان کرتے ہیں۔

آپ بیتی لکھنے کا ایک طریقہ فرضی یا خیالی آپ بیتی لکھنے کا ہے۔ آپ بیتی لکھنے کا دوسرا طریقہ بھی اردو ادب میں مروج ہے جس کے تحت حیوانات، نباتات اور جمادات وغیرہ کی داستانِ حیات کو اُن کی زبانی پیش کیا جاتا ہے۔ ایسی آپ بیتی میں یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ حیوانات کو بولنے کی طاقت مل گئی ہے اور وہ خود اپنی زبانی اپنے اوپر بیتے ہوئے حالات کو بیان کر رہے ہیں۔ اس قسم کی آپ بیتی لکھنے کے لیے مصنف اپنے آپ کو فرضی طور پر ان چیزوں کی جگہ رکھ لیتا ہے جن کے بارے میں وہ آپ بیتی لکھ رہا ہے۔ اس طرح وہ اپنے تخیّل سے کام

کرتا ہے۔ اچھی آپ بیتی لکھنے کے لیے بہت زیادہ قوت مشاہدہ، زور بیان، ذخیرہ الفاظ، جس کے بارے میں آپ بیتی لکھی جارہی ہے، اس کی عادات واطوار اوراس کے بارے میں مکمل معلومات کا ہونا ضروری ہے۔ اچھی اور موزوں آپ بیتی لکھنے کے لیے چند لوازمات کا ہونا ضروری ہے، وہ یہ ہیں:

آپ بیتی لکھنے کے لیے ضروری ہدایات:

۱۔ آپ بیتی کے اندر 'میں' کا ہونا ضروری ہے۔ جس کے لیے آپ بیتی لکھی جارہی ہے۔ اپنے آپ کو اس کی جگہ فرض کر کے لکھا جاتا ہے۔

۲۔ لکھتے وقت مناسب خاکہ تیار کر لیا جاتا ہے تاکہ تحریر میں باقاعدہ تسلسل برقرار رہے۔

۳۔ آپ بیتی بہت زیادہ طویل نہیں ہونی چاہیے اور نہ بہت زیادہ مختصر ہو کہ پڑھنے والا عدم دلچسپی کا شکار ہو کر رہ جائے۔

۴۔ آپ بیتی میں حقیقت ہونی چاہیے۔ سادہ اور عام فہم زبان کا استعمال کرنا چاہیے۔ مصنوعی زبان یا پر تکلف فقرات کا استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

۵۔ آپ بیتی میں شگفتگی اور دلچسپی کا عنصر برقرار رہنا چاہیے۔ قارئین کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے کچھ اشعار اور لطیفوں کا سہارا بھی آپ بیتی میں لیا جس سکتا ہے۔

تینوں ڈائجسٹوں میں شامل چند آپ بیتیاں پیش کی جارہی ہیں:

آپ بیتی

چھوٹے آدمی کا بڑا پن-م۔ص۔ایمن (آپ بیتی)

ماہنامہ اردو ڈائجسٹ نومبر ۲۰۱۷ میں چھوٹے آدمی کا بڑا پن کے عنوان سے م۔ص۔ایمن نے ۹ آپ بیتیاں لکھی ہیں جن میں سے ہر ایک آپ بیتی بہت سبق آموز اور دلچسپ ہے۔ ان میں ایسی باتوں کو شامل کر کے زندگی گزارنے کی بھرپور نصیحت کی گئی ہے جس سے ہمیں احساس بھی نہیں ہوتا اور ہمیں ایک پُر اثر نصیحت بھی مل جاتی ہے۔ اور انسان اپنے نفس پر قابو رکھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا اور جان بوجھ کر دوبارہ یہ سوچ کر غلطی کر لیتا ہے کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

پہلی آپ بیتی ایک درزی کے بارے میں ہے جو اپنی دکان میں آنے والے ہر گاہک کا کپڑا چوری کرتا ہے۔ پھر وہ ایک رات خواب دیکھتا ہے کہ وہ مر چکا ہے اور جن جن لوگوں کا کپڑا اُس نے چوری کیا تھا وہ

سب اکٹھا کر کے اس کے جھنڈے بنا کر اس کی قبر پر مختلف رنگوں کے جھنڈے لگا دیے گئے ہیں، جو اس کی قبر پر لہرا رہے ہیں۔ تب اس نے فیصلہ کیا کہ آئندہ وہ کسی بھی گاہک کا کپڑا چوری نہیں کرے گا۔ اس نے اپنے شاگردوں اور ساتھیوں کو اپنا خواب سنایا، اللہ سے اس بات کی معافی مانگی اور آئندہ کسی کا کپڑا چوری نہ کرنے کا وعدہ کیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ جب بھی کسی کا کپڑا چوری کرنے لگے تو تب اس کو اس کا خواب یاد کروا دیا کریں اور مخصوص الفاظ میں بتا دیا کریں کہ "استاد جھنڈے" جیسا کہ "استاد جھنڈے۔ استاد تب اپنے خواب کو یاد کر کے ایک جھرجھری لیتا اپنی حرکت پر نادم ہوتا اور کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ کا ارادہ کر لیتا ہے"۔[1]

اس طرح اسے اپنا خواب یاد آ جاتا اور وہ اپنے خواب کو یاد کر کے اپنی اس حرکت سے باز رہا کرے گا۔ لیکن ایک دن ایسا ہوا کہ کسی گاہک کا بہت زیادہ قیمتی اور نفیس کپڑا اس کے سامنے آتا ہے تو اس کا دل بھٹک جاتا ہے۔ جب وہ کپڑا چوری کرنے لگتا ہے تو اس کے ساتھی اسے اس انداز سے اس کا خواب یاد کرواتے ہیں اور ہانک لگاتے ہیں۔ اس پر استاد رُک جاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے سوچتا ہے اور غور کرتا ہے۔ اب خواب دیکھے بھی کافی دن ہو چکے تھے تب وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ رہنے دو مجھے یاد ہے مگر اس رنگ کا جھنڈا وہاں نہیں تھا۔

دوسری آپ بیتی ایک لائبریرین کے بارے میں ہے جس نے ایک علاقے میں میڈیکل سٹور اور ساتھ لائبریری کھول رکھی ہے۔ وہ لائبریری میں موصول ہوئے والی نئی کتابوں کا اندراج کر رہا تھا کہ لائبریری میں ایک شخص کتاب جاری کروانے کے لیے آتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "یار مجھے فارغ کرو، میں نے جانا ہے"۔ لائبریرین نے کہا مجھے جانا ہے بولتے ہیں وہ اس کے الفاظ کی درستگی کروا رہا ہوتا ہے۔ تب ان میں یہ مکالمہ ہوتا ہے اور وہ شخص اپنی غلطی مانتے ہوئے کہتا ہے:

> "میں یہ نہیں کہہ رہا میں مانتا ہوں کہ میرا جملہ غلط ہے۔ لیکن میرا مطلب ہے کہ میری غلطی تم نکال رہے ہو؟ مجھے پتا ہے "نے" مصدر کے ساتھ بولا جائے تو کلام کا عیب کہلاتا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ مجھے یہ غلطی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اس لیے کہ میں اہل زبان ہوں اور اردو میری مادری زبان ہے"۔[2]

جب وہ لائبریرین اس کی غلطی کو درست کرانے کی کوشش کرتا ہے تب اس بات پر وہ شخص نادم ہوتا ہے کہ مجھے یہ غلطی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ یہ انسان کا بڑا پن ہے کہ وہ اپنی غلطی کو چپ چاپ تسلیم کر لے۔ اس سے واقعی انسان کے بڑے پن کا ثبوت ملتا ہے۔ دوسروں کی تصحیح کروانا اور ان کو سکھانا کوئی بڑی بات نہیں۔

تیسری آپ بیتی جارج برنارڈ شاہ کے بارے میں ہے جنھیں بعض لوگ غلطی سے شاہ کہتے ہیں، اسے کسی نے پوچھا کہ اس کے خیالات کی بلندی کا سبب کیا ہے؟ آپ کے ذہن میں ایسے عمدہ خیالات کیونکر آتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ میں ہمیشہ اپنے پیروں کو گرم اور سر کو ٹھنڈا رکھتا ہوں۔ تب ان جاہل لوگوں نے اس کی بات کی تقلید کی اور اس کی نقل اس انداز میں کرنے لگے کہ وہ اپنے پیروں کو آگ میں رکھنے لگے جس سے ان کے پیر جل جاتے تھے۔ اس طرح اپنے سر کے اوپر برف رکھنا شروع کر دی جس سے وہ طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہونے لگے۔ تب انھوں نے برنارڈ شاہ کو تلاش کر کے ان سے اپنی پریشانی کا ذکر کیا تو برنارڈ شاہ نے انھیں بتایا:

> ”ارے عقل کے دشمنوں میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ تم آتش دان کے پاس بیٹھو میں تو پیدل زیادہ چلتا ہوں، یعنی پاؤں زیادہ تر حرکت میں رہتے ہیں اور کوئی ناگوار بات سنوں تو اسے برداشت کرتا ہوں یعنی غصّہ غالب نہیں ہونے دیتا۔ جب کہ تم لوگ ذرا ذرا سی بات پر غصّہ کر بیٹھتے ہو۔ سر کے بجائے دماغ کو ٹھنڈا رکھو“۔ (۳)

اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ داناؤں کی باتوں پر سوچ سمجھ کر عمل کرنا ضروری ہے ورنہ ہم اپنا ہی نقصان کر بیٹھیں گے۔ لوگ ایسی باتوں کی تقلید کرتے ہیں جن کا کوئی سر پیر نہیں ہوتا اور پھر دوسروں کی باتوں میں آ کر اپنا آپ تباہ کر لیتے ہیں۔

چوتھی آپ بیتی ایک چور اور اس کے بیٹے کی ہے۔ چور دور کسی مکان کی طرف اشارہ کر کے اپنے بیٹے کو بتاتا ہے کہ اس نے اس گھر میں کئی دفعہ چوری کی ہے مگر ہر بار اس گھر میں دیا ہمیشہ جلتا ہی رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں ہمارے گھر کا دیا ہر بار یہاں سے چوری کرنے کے باوجود ہمیشہ بجھتا ہی رہا ہے۔ وہ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے بتاتا ہے:

> ”قدرتی بات ہے جس شخص کی چوری ہو اور وہ اناللہ وانا الیہ راجعون کا ورد کرے تو اس آیت کی برکت سے اسے سکون بھی میسر آجاتا ہے۔ اس کے نقصان کی عمدہ تلافی بھی ہو جاتی ہے جب کہ چور عمر بھر خوار ہی رہتا ہے“۔ (۴)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناجائز طریقے سے حاصل کی گئی دولت انسان کے پاس ہمیشہ نہیں رہتی بلکہ بہت جلد ختم ہو جاتی ہے یا ضائع ہو جاتی ہے۔ اس آپ بیتی میں شاعر سائل آزاد لکھتے ہیں کہ وہ بھٹو دور میں

سیاسی قیدی کی حیثیت سے جیل میں قید کر دیے گئے تھے کہ وہاں پر مختلف جرائم پیشہ لوگ آتے رہتے تھے اور ان میں سے چور، ڈاکو، قاتل اور لٹیرے وغیرہ سب شامل ہوتے تھے۔ جب بھی کوئی نیا مجرم جیل میں آتا تو تمام قیدی اس کے گرد جمع ہو جاتے اور اس سے دریافت کرتے کہ وہ کس جرم میں جیل آیا ہے۔ اگر کوئی قاتل جیل میں لایا جاتا تو اس کی بڑی عزت کی جاتی اور اگر کوئی چور جیل میں آتا تھا تو اس کو سب قیدی برا بھلا کہتے تھے۔ چوری کے علاوہ دیگر جرائم کرنے والوں کی قیدی زیادہ عزت کرتے تھے۔

پانچویں آپ بیتی میں بتایا گیا کہ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ جب کوئی سودا سلف یا چیز خریدنے لگتے ہیں تو بغیر دکان دار کے پوچھے تھوڑی سی کھانے والی چیز اٹھا کر منہ میں ڈال لیتے ہیں۔ اسی طرح کا ایک واقعہ حاجی نور محمد کے ساتھ پیش آیا۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ۱۹۶۰ء میں حج کے دوران بھارت سے آئے ہوئے حاجیوں سے ان کی ملاقات مکہ مدینہ میں ہوئی۔ ہم ان کے ساتھ کھجوریں خریدنے بازار چلے گئے وہاں بھارت کے حاجی نے کھجور کا ایک دانا خریدنے سے پہلے منہ میں ڈالنے کے لیے اٹھایا تو دکان دار اس سے یوں مخاطب ہوا:

> ”لا---لا---- حرام قطعی حرام“ حاجی نے گھبرا کر دانہ کھجور کے ڈھیر پر پھینک دیا۔ دکاندار نے ایک مٹھی بھری اور جتنی کھجوریں اس کی مٹھی میں آسکتی تھیں بھر کر اس حاجی کو دیتے ہوئے کہا ھذا حلال“۔ (۵)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی کی اجازت کے بغیر دوسرے کا مال کھانا حرام ہے۔

چھٹی آپ بیتی ایک ایسے شخص کے بارے میں جو کہ دماغی عارضے میں مبتلا ہے اور جب اس کے عزیز رشتہ دار کسی بات پر اس سے بحث کرتے ہیں تو وہ ان سب کو یہ کہہ کر خاموش ہونے کی تلقین کرتا ہے کہ تم تو سب پاگل ہو، لیکن ڈاکٹر نے مجھے سرٹیفکیٹ جاری کر رکھا ہے کہ میں پاگل نہیں ہوں۔

> ”وہ پھٹ پڑا پاگل میں نے تم سب پاگل ہو یہ کہتے ہوئے اس نے ڈاکٹر کا دیا ہوا سرٹیفکیٹ جیب سے نکال کر لہرایا میرے پاس ڈاکٹر کا دیا ہوا سرٹیفکیٹ ہے۔ اگر تم پاگل نہیں ہو تو دکھاؤ کوئی سرٹیفکیٹ“۔ (۶)

بعض اوقات انسان ایسے موقعوں پر اکثر لاجواب ہو جاتا ہے۔ اب ہر کسی کے پاس پاگل نہ ہونے کا سرٹیفکیٹ تو نہیں ہوتا۔

ساتویں آپ بیتی ملا نصر الدین کے بارے میں ہے کہ وہ گھر میں سوئے ہوئے تھے اور باہر گلی میں شور شرابہ شروع ہو گیا۔ اس پر ان کی بیوی نے ان سے کہا کہ جاؤ باہر دیکھو گلی میں شور کیسا ہے؟ وہاں پہ دو افیمی آپس میں لڑ رہے تھے۔ ملا نصیر الدین سردی کی وجہ سے باہر نہیں جانا چاہتے تھے۔ چنانچہ بیوی کے کہنے پر وہ اپنے اوپر لحاف اوڑھ کر باہر گئے تو ایک افیمی ان کا لحاف لے کر بھاگ گیا۔ جب واپس آئے تو بیوی نے پوچھا کہ جھگڑا کس بات پر ہو رہا تھا۔ ملا نصیر الدین نے فوراً جواب دیا: "میری رضائی کے لیے"۔ (۷)

آٹھویں آپ بیتی میں بتایا گیا ہے کہ ایک بار ایک شخص لوڈشیڈنگ کے زمانے میں بجلی کا بل جمع کرانے بینک جاتا ہے تو وہ وہاں کھڑکی پر صرف ایک مرد اور ایک عورت موجود تھے۔ بینک افسر خاتون کو کہتا کہ لائن میں آؤ اس پر عورت کہتی ہے: "میں کیسے لائن لگاؤں؟ کوئی دوسرا ہے ہی نہیں"۔ (۸)

صرف ایک فرد سے لائن کیسے بن سکتی ہے۔ بل جمع کرنے والا بار بار عورت کو تلقین کرتا ہے کہ لائن میں آؤ۔ آئندہ اگر وہ لائن میں نہیں آئے گی تو وہ اس کا بل جمع نہیں کرے گا۔ اس پر بڑی بی پریشان ہوتی ہے جب کہ بنک افسر اس سے محظوظ ہوتا رہتا ہے۔

نویں اور آخری آپ بیتی ایک فال نکالنے والے کے بارے میں ہے۔ دو دوست کہیں جا رہے تھے، راستے میں ایک فال نکالنے والے کے پاس کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک دوست دوسرے سے کہتا ہے کہ میں فال وغیرہ پر یقین نہیں رکھتا تم اپنے لیے ہی فال نکلوالو۔ میرے لیے نہ نکلوانا۔ اس پر دوسرا دوست نہیں مانتا۔ لہذا وہ فال نکالنے والے سے پیسے پوچھتے ہیں وہ بتاتا کہ پانچ روپے میں ایک لفافہ نکالوں گا۔ دونوں دوست ایک دوسرے کو سمجھاتے ہیں کہ فال نہیں نکالنی چاہیے۔ نجومی کا دل چاہتا ہے کہ دونوں فال نکلوالیں تاکہ اس کو زیادہ پیسے مل سکیں۔ نہ ماننے والا دوست نجومی سے اس طرح مخاطب ہوتا ہے: "تو دو لفافے ہی نکال۔ ایک میرے لیے اور دوسرا اپنے لیے---- کہ کب تک فٹ پاتھ پر بیٹھا رہے گا"۔ (۹)

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جو اپنی قسمت کا حال نہیں بتا سکتا اُسے دوسروں کی قسمت کے حال کا کیونکر پتہ ہو سکتا ہے۔ یہ ایک دلچسپ معمہ ہے۔

۱۰۔ میرے بچپن کے دن-رفیق سجاد-- آپ بیتی

یہ آپ بیتی "میرے بچپن کے دن" ماہنامہ اردو ڈائجسٹ نومبر ۲۰۱۷ء کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔ یہ اس دور یادگار کی سہانی باتوں کا تذکرہ ہے جو خواب و خیال ہو چکیں، رفیق سجاد نے وہ زمانہ قدیم کی ساری

باتیں اپنے بچپن کی حسین یادوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھی ہیں کہ اس وقت شام کے اوقات میں چارپائیاں صحن میں لگا کر پانی کا چھڑکاؤ کیا جاتا تھا تو مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو ہر طرف گھر میں پھیل جاتی تھی اس کے بعد چارپائیوں پر بستر لگا کر گھر کے تمام افراد اور چھوٹے بچے اپنا سکول کا کام کرتے رہتے تھے۔ لوگوں کو آپس میں بے پناہ محبت تھی جس کا اب فقدان ہو چکا ہے۔ ٹیلی ویژن سب گھروں میں نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت ٹیلی ویژن کا کوئی عام رواج بھی نہیں تھا۔ اس لیے اگر کسی گھر میں ٹیلی ویژن ہوتا بھی تھا تو لوگ سر شام خبریں سننے کے بعد ٹیلی ویژن بند کر کے سکون کی نیند سو جاتے تھے۔ آپس میں لوگوں کی دوستی اور ملنا جلنا عام تھا۔ موبائل فون کا استعمال اس وقت نہیں تھا۔ لیمپ کی روشنی میں لوگ اپنے چھوٹے موٹے کام اور بچے پڑھائی وغیرہ کرتے تھے۔ انھوں نے ماضی کی تصویر کشی اس طرح سے کی ہے:

> "آج کے ٹیلی ویژن ڈراموں اور فلموں سے کہیں زیادہ دلچسپی سے اس دور کی کہانیاں سنی اور سنائی جاتی تھیں۔ رات کو دادی اماں سے کہانیاں سن سن کر جوان ہونے والی نسل نے معاشرتی ترقی میں آج کی ٹیلی ویژن، انٹرنیٹ اور سیل فون کی رسیا جدید نسل سے کہیں زیادہ کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں"۔ (۱۰)

مصنف اپنے دور کی آپ بیتی سناتے ہوئے اس دور کی حسین یادوں کو اپنے دل میں بسائے ہوئے ہے کہ کس خوبصورتی کے ساتھ اس دور کے کلچر کا اظہار کیا گیا ہے۔ آپس میں محبت اور بھائی چارہ اس دور کی علامت تھا۔ لیکن اب جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا ہے سائنسی دور شروع ہو گیا ہے اور اس دور میں نفرتیں زیادہ ہو گئی ہیں۔ لیکن لوگوں کا آپس میں ملنا جلنا اور محبت بہت کم ہو کر رہ گئی ہے۔ اس میں ماضی کی بازگشت اور سنہرے دنوں کی یاد ہے۔

۱۱۔ آزادی اور گناہ، حمید رانا- آپ بیتی

آپ بیتی، آزادی اور گناہ، تحریک پاکستان کے موقع پر حمید رانا کی لکھی ہوئی ایک اہم آپ بیتی ہے جو ماہنامہ حکایت کے شمارہ اگست ۲۰۱۷ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس آپ بیتی کو ۱۹۴۷ء کی آزادی کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ اس میں انسانی معاشرت اور انا کی ایک خوبصورت کہانی بیان کی گئی ہے۔ مصنف لکھتا ہے کہ وہ میٹرک پاس تھا اور ہندوستان میں اپنے والد کے ساتھ کاروبار کرتا تھا۔ ان کے تمام عزیز رشتہ دار ان کے قریب ہی رہتے تھے۔ ان کی ایک رشتہ دار لڑکی جسے وہ پسند کرتا تھا اور اس سے وہ شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے

کہ وہ بچپن میں اکٹھے ایک ساتھ کھیلتے رہے تھے۔ لڑکی نے رشتے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں تو بی اے پاس ہوں۔ میں ایک میٹرک پاس لڑکے سے شادی کیسے کر سکتی ہوں۔ یہ پوری زندگی کا معاملہ ہے۔ میں اپنی زندگی خراب نہیں کر سکتی۔ اس سے لڑکے کے دل میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہوتے ہیں کہ اس لڑکی کا غرور ایک نہ ایک دن ضرور توڑوں گا۔ انہی دنوں ہندوستان کے حالات خراب ہو جاتے ہیں تو سکھوں اور ہندوؤں نے مسلمانوں کا جینا محال کر دیا۔ وہ لڑکیوں کو اٹھا کر لے جاتے تھے اور نوجوانوں کو قتل کر دیتے تھے۔ ایک دن ان دونوں کے گھروں میں ہندوؤں اور سکھوں نے داخل ہو کر دونوں خاندانوں کو مارنا شروع کر دیا۔

یہ لڑکی اپنے گھر میں چھپ جاتی ہے اور ہندوؤں اور سکھوں کے حملوں سے بچ کر بھاگ نکلتی ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ وہ کسی کے گھر کے باہر تھڑے کے نیچے نالی میں چھپ جاتی ہے۔ لڑکا بھی کسی نہ کسی طرح سے دروازہ توڑ کر باہر نکل کر بھاگنے میں کامیاب ہو گیا اور اسی نالی میں چھپ جاتا ہے۔ وہاں ان کی ملاقات ہو جاتی ہے۔ اس منظر کو بیان کرتے ہوئے مصنف بتاتا ہے کہ جب ہندوؤں اور سکھوں نے ان پر حملہ کر دیا تو یہ بھی اپنی جان بچا کر بھاگ نکلا اور بھاگتے بھاگتے اس نے سوچا کہ نالی کے نیچے جا کر چھپ جائے تو شاید اس کی جان بچ سکے۔ جب وہ نالی کے نیچے گیا تو وہاں پہلے سے ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی وہ بھی اسی پریشانی کے عالم میں تھی۔ وہاں انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ یہاں سے بھاگ کر لاہور چلے جائیں۔ بہت زیادہ مصیبتوں اور پریشانیوں کے بعد جب وہ راستے کی صعوبتوں کو برداشت کرتے ہوئے لاہور پہنچے تو وہاں ان کا کوئی جاننے والا نہیں تھا۔ ایک دن لڑکی رفیوجی کیمپ میں کسی نوجوان سے باتیں کر رہی تھی تو لڑکے نے پوچھا کہ کیا یہ تمہارا کوئی رشتہ دار ہے۔ اس نے کہا کہ ایسے مجھ سے وہ ہمدردی کی باتیں کر رہا تھا، جسے اس منظر میں پیش کیا گیا ہے۔

> ”میں نے پوچھا اس میں ہنسنے کی کیا بات تھی۔ اس نے حیران سا ہو کر کہا ہنسنا کوئی جرم تو نہیں، وہ ہمدردی سے باتیں کر رہا تھا۔ میں نے رونا مناسب نہیں سمجھا۔ تمہارا رونا صرف میرے لیے ہے۔ میں نے احمقوں کی طرح کہا اور تمہاری ہنسی دوسروں کے لیے۔ وہ چپ رہی۔ اسی شام میں نے ایک بار پھر اس آدمی کو اس کے پاس دیکھا، مجھے آتا دیکھ کر وہ چلا گیا۔ میرے دل میں یہ وہم پیدا ہو گیا کہ اسے اپنے رشتہ دار تو نہیں مل رہے اب وہ کوئی اپنے جیسا گریجویٹ اور آپ ٹو ڈیٹ آدمی تلاش کر رہی ہے“۔ (۱۱)

بہت سے دوسرے قافلے بھی اس کیمپ میں رہ رہے تھے۔ اب انھوں نے فیصلہ کیا کہ مل جل کر زندگی بسر کر لیتے ہیں۔ جب اس کو پتا چلتا ہے کہ یہ وہی لڑکی ہے جس نے میرے رشتے سے انکار کیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے تمھیں کہا تھا نا کہ تمہارا غرور توڑ دوں گا۔ وہ اس کے ساتھ شادی کر لیتا ہے اور دونوں مل جل کر رہنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ لڑکی پر کبھی بھی کسی بات کا بھروسا نہیں کرتا۔ اسے طرح طرح سے تنگ کرتا رہتا ہے۔ ان کے دو بچے ہوتے ہیں جو کہ دونوں فوت ہو جاتے ہیں۔ اس طرح لڑکی کو یہ پریشانی اور غم کھائے جا رہا ہے کہ اس کا خاوند اس سے محبت نہیں کرتا، بلکہ وہ اس سے دور رہتا ہے، اسی پریشانی کے عالم میں وہ بیمار ہو جاتی ہے اور ڈاکٹر اس کی بیماری پکڑ لیتے ہیں۔ ایک دن ایسا آتا ہے کہ وہ اپنے خاوند سے بہت ڈھیر ساری باتیں کرتی ہے اور اس کے بعد اس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ اس کے انتقال کے بعد اس کو پتہ چلتا ہے کہ وہ مجھ سے حقیقی محبت کرتی تھی تو وہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اگر وہ ایک دن زندہ ہو کر میرے سامنے آجائے تو میں اپنے سارے گناہوں کی معافی اس سے مانگ لوں۔ کیونکہ اس نے مجھ سے سچی محبت کی تھی لیکن میں نے اس کے ساتھ بے وفائی کی ہے۔ مگر اب پچھتاوے کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

۱۲۔ خواہشوں کا جہنم، عارفہ الخلیل- آپ بیتی

خواہشوں کا جہنم-عارفہ الخلیل، کی لکھی ہوئی آپ بیتی ہے جو ماہنامہ حکایت کے شمارے جولائی ۲۰۱۹ء میں شائع ہوئی ہے۔ یہ کہانی لاہور کے نواحی گاؤں کی رہنے والی ایک لڑکی کی ہے۔ یہ ۱۹۸۰ء کا واقعہ بیان کرتے ہوئے بتاتی ہے کہ وہ اپنے گاؤں میں رہتے تھے۔ وہاں زندگی کے اتنے مسائل نہ تھے لیکن شہروں کے اپنے مسائل ہوتے ہیں۔ ان کے والد نے جب لاہور میں کلرک کی نوکری اختیار کی تو ان کی تنخواہ بہت کم تھی لیکن انھوں نے رشوت کے ذریعے سے اتنی دولت کمائی کہ بہت ہی کم عرصے میں لاہور کے ایک اچھے علاقے میں اپنا ذاتی پلاٹ خرید کر مکان بنالیا اور معاشرے میں اپنا مقام پیدا کر لیا۔ ان کی والدہ پہلے نماز روزہ باقاعدگی سے ادا کرتی تھیں لیکن شہر میں آنے کے بعد وہ اس طرح قدر فیشن ایبل ہو گئیں کہ ان کے سر سے دوپٹہ بھی غائب ہو گیا۔ اس طرح ان کے والد کی سوچ بھی رفتہ رفتہ بلند ہونے لگی اور اس نے سوچا کہ وہ اب معاشرے میں اپنا اچھا مقام حاصل کر لے گا۔ لیکن جلد ہی میری زندگی میں ایک حادثہ رونما ہوا کیونکہ ایسا غیر اخلاقی کام کتنی دیر چلتا ہے۔ میرے والد کو رشوت کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ اس کا مجھے کوئی خاص افسوس نہیں ہوا۔

اس لیے کہ یہ بات مجھے پہلے سے معلوم تھی۔ میں ڈاکٹر بننا چاہتی تھی مگر میری خواہش پر اس وقت پانی پھر گیا جب میرے والد رشوت کے الزام میں گرفتار ہوئے اور میں ڈاکٹر نہ بن سکی۔ ناچار میں نے ڈاکٹر بننے کا ارادہ ترک کیا تو گھر والوں نے نرسنگ کورس کروانے کے لیے نرسنگ اسکول میں داخل کروادیا۔ میں نرسنگ سکول میں داخل ہوئی تو میں نے دل لگا کر اپنی پڑھائی مکمل کی۔ اب میں مجبور ہوگئی تھی کہ کوئی چھوٹی موٹی نوکری کر سکوں۔ لہٰذا میں نے ایک ہسپتال میں نرسنگ کی نوکری شروع کرلی۔ میں یہ نوکری کر رہی تھی، میرے ساتھ اور بھی نرسیں اس ہسپتال میں نوکری کرتی تھیں جو ہر روز اپنی عیاشیوں کا سامان پیدا کر لیتی تھیں۔ میرے گھر والے مجھ سے ہمیشہ اس بات سے خفا رہتے تھے کہ میں دوسری نرسوں جیسا رویہ کیوں نہیں اپناتی۔ ایک دن اخبار میں ایک اشتہار آیا کہ بیرون ملک نرسوں کی ضرورت ہے۔ میرے گھر والوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں اس اشتہار کے جواب میں درخواست دوں۔ میں نے گھر والوں کا کہنا مان کر اس کے لیے درخواست دے دی۔ جس دن میرا انٹرویو تھا میری والدہ بھی میرے ساتھ تھیں۔ انھوں نے بھی خوب بناؤ سنگھار کیا ہوا تھا۔ جب ہم انٹرویو کے لیے گئے تو ہمارا خوب استقبال کیا گیا۔ مسٹر پرویز نے ہمارے ساتھ واقفیت بنالی اور انٹرویو کے اگلے دن وہ ہمارے گھر مبارک باد دینے پہنچ گیا کہ میری سلیکشن ہوگئی ہے۔ مجھے کراچی میں تھوڑی سی ٹریننگ کے بعد بیرون ملک بھجوادیا جائے گا۔ عارفہ کراچی کی روداد لکھتے ہوئے بتاتی ہیں:

> ”کراچی میں ہمارا قیام ایک بنگلے میں ہوا جو شاید اس فرم نے اسی خاص مقصد کے لیے رکھا تھا جس کا علم آپ کو بعد میں ہوگا۔ دو تین دن تو اس نے صرف میرا اعتماد ہی حاصل کیا۔ اس اثناء میں اس نے مجھے اس بات کا یقین دلادیا کہ وہ فرشتہ ہے۔ کم از کم میں تو اسے یہی سمجھنے لگی تھی۔ چوتھے روز ایک شدید جذباتی کیفیت سے گزرنے کے بعد ہم نے بے حیائی کے تمام مراحل طے کر لیے۔ مجھے اپنے لٹنے کا اس وقت کوئی احساس نہ ہوا، کیونکہ پرویز نے مجھے یقین دلاتے ہوئے کہا کہ ہم جلد ہی میاں بیوی کے رشتے میں بندھ جائیں گے۔ اور میں مطمئن ہوگئی“۔ (۱۲)

پرویز لڑکیوں کو بلیک میل کرنے کے بعد اپنی ہوس کا نشانہ بناتا اور پھر ان کو بیرون ملک سعودی عرب فروخت کر دیتا ہے۔ بعد میں پرویز نے عارفہ کو سعودی عرب فروخت کر دیا اور یقین دلایا کہ میں بھی چند دن بعد تمہارے پیچھے آجاؤں گا۔ اسی اثنا میں پرویز سعودی عرب خود بھی عارفہ کے پیچھے جاتا ہے

اور حقیقت میں وہ اس کو بردہ فروشوں کے ہاتھوں بیچ چکا ہوتا ہے۔ وہاں پہنچ کر عارفہ جو منظر دیکھتی ہے اسے اس طرح بیان کرتی ہے:

"اگلے روز چھٹی تھی۔ سر شام لڑکیوں نے خود کو بنانا سنوارنا شروع کر دیا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ ہمارے نرسنگ ہوسٹل کی طرح یہاں بھی کاریں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ کار دروازے پر رکتی اور ایک بنی سنوری لڑکی کار میں آنے والے کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر اس کے ساتھ چلی جاتی۔ یا اللہ میں کس عذاب میں پھنس گئی ہوں میں نے سوچا"۔ (۱۳)

اس کا علم عارفہ کو بعد میں ہوتا ہے۔ جب پرویز کو سعودی عرب میں دیکھتی ہے۔ اس کا خون کھولنے لگتا ہے۔ وہ پرویز کو مختلف حیلوں بہانوں سے اپنی جھوٹی محبت کا یقین دلا کر ورغلاتی ہے۔ جس شیخ کے ہاں وہ فروخت ہوتی ہے، اس کے ساتھ مل کر پرویز کو قتل کر دیتی ہے۔ اس طرح عارفہ اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کا بدلہ پرویز سے لیتی ہے۔ جس کے بعد وہ ایک ستر سالہ بوڑھے کے ساتھ شادی کرتی ہے اور اسی کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہے۔ ہمارے معاشرے کی ایسی کہانی ہے جو ہر دوسری لڑکی کی ہے جو اپنی خواہشات پوری کرنے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتی ہے۔

۱۳۔ زندگی اک امتحان، طارق محمود مرزا سڈنی- آپ بیتی

زندگی اک امتحان یہ آپ بیتی طارق محمود مرزا سڈنی نے لکھی ہے جو اردو ڈائجسٹ کے شمارہ جولائی ۲۰۱۹ء میں شائع ہوئی ہے۔ کہانی کچھ اس طرح شروع ہوتی ہے کہ جاپان کی ایک بچی سکول کے زمانے میں اپنے والدین کے ساتھ رہتی ہے جس کا تعلق جاپان کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے ہے۔ اس کی زندگی بہت خوشگوار گزر رہی ہے۔ اس کے بابا کو ہفتہ اور اتوار یعنی ہفتے میں دو چھٹیاں ہوتی تھیں تو جمعہ کا دن ان کے لیے بہت خاص ہوتا تھا جو ان کے لیے بہت سی خوشیاں لے کر آتا تھا۔ کیونکہ اگلے دن اس کے والدہ کو چھٹی ہوتی تھی۔ وہ اپنی پسند کے کھانے بناتے تھے۔ مچھلی پکاتے اور اس طرح خوشیاں مناتے تھے۔ ان کے گاؤں میں چھ ماہ دن اور چھ ماہ رات ہوتی تھی۔ گاؤں پہاڑ کے دامن میں واقع تھا۔ جہاں کھیتوں اور باغات سے آب و ہوا خوشگوار تھی اور ہر قسم کی سبزیاں اور پھل وہاں پیدا ہوتے تھے۔ ایک اتوار کے دن بچی کے بابا سمندر میں مچھلی پکڑنے جاتے تھے۔ ان کے گاؤں کے اکثر لوگ بھی اتوار کے دن مچھلی پکڑنے گئے تو سمندر میں کشتی اُلٹنے

سے اس کے بابا کی موت واقع ہو گئی۔ جس سے وہ بہت پریشان ہوتی ہے۔ لیکن لوگ ان کو حوصلہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالی آپ کے لیے بہتر اسباب پیدا کرے گا۔ اس کی ماں اور باپ کا بچپن بھی اسی گاؤں میں گزرا تھا وہیں ان کی شادی ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ بچی اور اس کی ماں نے یہ صدمہ برداشت کر لیا۔ لیکن ان کی ماں بہت زیادہ اداس رہنے لگی اس طرح وقت نے کروٹ بدلی اور لوگوں نے ان کی ماں کو مشورہ دیا کہ وہ دوسری شادی کر لے۔ لہذا انھوں نے لوگوں کے مشورے کو مان کر اسی گاؤں کے ایک جانجی نامی مچھیرے سے دوسری شادی کر لی۔ لیکن وہ انتہائی لالچی اور بدبخت انسان تھا۔ شراب پیتا تھا، نشہ کرتا تھا اور بہت سی بُری عادات میں مبتلا تھا۔ اس ماں کو مارتا تھا۔ دوسری شادی کے بعد اس کی ماں بہت پریشان رہنے لگی۔ وہ اپنی ماں کی عظمت کو بیان کرتے ہوئے کچھ اس طرح بتاتی ہے:

> "دوسری شادی کے بعد زیادہ رنجیدہ رہنے لگی دراصل ماں نے یہ شادی گاؤں والوں اور برادری کے کہنے پر کی تھی۔ وہ ابھی جوان اور حسین تھی۔ گاؤں کے لوگ چاہتے تھے کہ وہ ساری زندگی بیوگی میں نہ گزارے بلکہ دوسری شادی کر لے۔ ماں نے بھی سوچا کہ ایک مرد کے گھر میں آجانے سے اسے شاید سہارا مل جائے اور مجھے باپ کی کمی کم ستائے لیکن جانجی نہ اچھا باپ ثابت ہوا نہ اچھا شوہر۔ وہ شراب اور جوئے کی لت میں مبتلا تھا۔ جو کچھ کماتا سب انھی عادات بد کی نذر کر دیتا"۔ (۱۴)

پھر بچی اپنی کہانی سناتے ہوئے کہتی ہے کہ جاپان میں شراب نوشی کا رواج عام تھا۔ ان کی ماں دوسری شادی کا صدمہ برداشت نہ کر سکی کیونکہ اس کا شوہر اس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کرتا تھا۔ اس کی ماں نے ایک دن فیصلہ کیا کہ وہ خودکشی کر لے گئی۔ اس نے سمندر میں کود کر خودکشی کر لی اور یہ بچی بالکل اکیلی رہ گئی۔ لہذا اس کے قریبی جاننے والے اور محلے کے لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اسے یتیم خانے میں داخل کروا دیا جائے۔ یتیم خانہ گاؤں سے دور ٹوکیو شہر میں تھا۔ جہاں اسے داخل کروا دیا گیا۔ اس نے وہیں اپنی تعلیم مکمل کی اور بہت دکھ اور مصیبتوں کے بعد اپنے آپ کو سیٹ کیا۔ یتیم خانے کی زندگی بہت تنگ کرتی تھی لیکن اسے اپنی زندگی میں بہت سے چیلنجز درپیش تھے۔ یتیم خانے میں اس نے جس طرح وقت گزارا اور اپنی پڑھائی پر توجہ دی اس کا حال وہ یوں بیان کرتی ہے:

> "یتیم خانے میں رہ کر میں نے آئی ٹی کی ڈگری حاصل کی۔ اس وقت تک میں اٹھارہ برس کی ہو چکی تھی۔ نوکری ملتے ہی میں نے فلیٹ کرائے پر حاصل کیا اور یتیم خانے

کو خدا حافظ کہہ دیا۔ حالانکہ مجھے اس زندگی کی عادت ہو گئی تھی۔ یتیم خانے سے نکل کر تنہا رہنے کا تجربہ بھی منفرد اور جدا تھا لیکن میں نے زندگی میں اتنے مدو جزر دیکھے تھے کہ اب کچھ بھی نیا نہیں لگتا تھا"۔ (۱۵)

اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس نے جب نوکری شروع کی اور یتیم خانے کو خدا حافظ کہا تو وہ ایک دفتر میں ملازم ہو گئی۔ اس کی ملاقات ایک شخص کے ساتھ ہوئی جو اس کے دفتر میں نوکری کرتا تھا۔ اس کا نام نوری تھا۔ اسے نوری سے بہت زیادہ محبت ہو گئی۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ نوری سے شادی کرلے گی۔ اس نے نوری کے ساتھ شادی کرلی اور اس کی زندگی میں خوشیاں پھر سے ایک بار لوٹ آئیں۔ نوری اس کو بہت خوش رکھتا تھا۔ ان کے گھر میں ایک ننھی بیٹی پیدا ہوئی جس کی تعلیم پر وہ دونوں بہت زیادہ توجہ دیتے تھے اور اس کے ساتھ بہت محبت کرتے تھے۔ وہ کتنے عزیز دن تھے۔ پھر یکایک اس کی زندگی میں ایک ایسا طوفان آیا کہ جس نے اس کا سب کچھ ایک بار پھر سے اجاڑ کر رکھ دیا۔ وہ اپنی حالت کو کچھ اس طرح سے بیان کرتی ہے:

"ایک دفعہ پھر طوفان آیا اور میرا سب کچھ بہا کر لے گیا۔ میرا محبوب شوہر اور میری معصوم بیٹی میری زندگی کی تمام خوشیاں اس طوفان کی نذر ہو گئیں۔ ایک دفعہ پھر میں تنہا رہ گئی۔ یہ ۲۰۱۱ء کا سونامی تھا جس نے دوسرے بہت سے جاپانیوں کی طرح میرا گھر بھی اُجاڑ دیا۔ دونوں باپ بیٹی سکول سے گھر آرہے تھے کہ طوفان کی لپیٹ میں آگئے۔ میں ان دونوں کا انتظار کرتی رہی اور وہ مجھے چھوڑ کر اتنا دور چلے گئے جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔ یہ انتظار اب کبھی ختم نہیں ہو گا"۔ (۱۶)

اس کی زندگی میں ایک دفعہ پھر اندھیرا چھا گیا اور اس نے سوچا کہ میں خودکشی کرلوں کیونکہ جاپان میں خودکشی کرنے والوں کو بری نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ بلکہ اچھی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کو بہادر خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن پھر وہ اس سے باز رہیں۔ لہٰذا اس نے خودکشی کا پکا ارادہ کر لیا وہ خودکشی کی غرض سے ایک دن سمندر میں گئی اور اسی پہاڑ کی چٹان پر چڑھ گئی جس پہاڑ کی چٹان سے اس کی ماں نے سمندر میں چھلانگ لگائی تھی۔ وہ خودکشی کرنے لگی تو ایک بار اس نے ایک آواز سنی۔ اسے یہ محسوس ہوا کہ جیسے وہ اس کی بچی کی آواز ہو۔ اس نے ارد گرد نظر دوڑائی مگر کہیں کوئی نظر نہ آیا۔ اسے اس بات پر پورا بھروسہ تھا کہ یہ آواز اس کی بچی کی ہے۔ لہٰذا اس نے خودکشی کا ارادہ ترک کر دیا اور واپس اپنے شہر ٹوکیو آگئی۔ ٹوکیو آکر وہ سیدھی اُسی یتیم خانے میں گئی جہاں پر وہ پلی بڑھی تھی اور جوان ہوئی تھی۔ اس نے وہاں رہ کر اپنی تعلیم مکمل

کی تھی، وہاں اس نے ایک فارم پر دستخط کیے جس میں لکھا تھا کہ وہ یتیم خانے کے بچوں کی ساری زندگی بے لوث خدمت کرتی رہے گی۔ زندگی کی ایسی کہانی ہے جس میں زندگی بار بار امتحان لیتی ہے اور آخر کار اس موڑ پر لے آتی ہے جس میں اپنی زندگی ختم کرنے کی بجائے دوبارہ اس اُمید پر زندگی شروع کی کہ ساری زندگی یتیم بچوں کی پرورش کرے گی۔

شاعری :

انسانی احساسات و جذبات اور مشاہدات و تجربات کے اظہار کا نام شاعری ہے۔ دنیا میں ہر انسان گفتگو کرتا ہے اور گفتگو کے لیے پہلے مشاہدہ کرتا ہے۔ جس کے بعد اپنے مشاہدے کو لفظوں کی صورت میں بیان کرتا ہے۔ لیکن بعض لوگوں کا مشاہدہ اتنا عمیق، خوبصورت اور دلچسپ ہوتا ہے کہ ان کی کہی ہوئی بات یا ان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ ہمارے دلوں کی گہرائیوں کو چھو لیتے ہیں۔ انھیں جذبات کے اظہار کا نام شاعری ہے۔ ہر انسان اپنے نظریے اور غور و فکر سے سوچتا ہے لیکن حساس لوگوں کا مشاہدہ بہت زیادہ گہرا ہوتا ہے شاعری کا تعلق بھی حساس لوگوں کے ساتھ زیادہ ہوتا ہے۔

شاعر اپنے خیالات و مشاہدات اور احساسات و تجربات کو اپنے تخیل کے سانچے میں ڈھال کر اُسے تخلیق کی صورت میں اپنے اندر سموتا ہے اور چاہتا ہے کہ اپنی سوچ کو دوسرے لوگوں تک ہو بہو اسی طرح پہنچا دے جس انداز سے وہ سوچتا ہے۔ اس طرح تخلیق کار کو اطمینان ملتا ہے۔ زمانۂ قدیم سے لوگ اپنے خیالات کا اظہار کرتے چلے آرہے ہیں۔ آج بھی تاریخی عمارات و مقامات پہ بنے نقش و نگار آثار قدیمہ سے ملنے والی اشیا سے گزشتہ زمانوں کے لوگوں کے خیالات اور حالات و واقعات کی عکاسی شاعری کی صورت میں ملتی ہے۔ اسی شاعری سے موجودہ زمانے کے لوگوں کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اُس دور میں بھی لوگوں کے حالاتِ زندگی اور اُن کا رہن سہن کیسا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور کے شعرا کی تحریروں سے ان کے زمانے کے حالات و واقعات کی عکاسی ملتی ہے۔ شاعری کی کئی اقسام اور اصناف ہیں، جن میں حمد، نعت، مثنوی، مسدس، غزل، نظم پابند نظم آزاد، نظم، قصیدہ، رباعی، سلام، گیت وغیرہ سرِ فہرست ہیں۔ اُردو شاعری میں بھی بڑے بڑے شاعر پیدا ہوئے ہیں۔ اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو میر تقی میر، مرزا اسد اللہ خاں غالب، داغ دہلوی اور بہادر شاہ ظفر وغیرہ کے نام نمایاں ہیں جو ادب عالیہ کی بہترین مثال ہیں۔ عصر حاضر کے شاعروں میں علامہ اقبال، فیض احمد فیض، حسرت موہانی، ابنِ انشا، حبیب جالب، شکیب جلالی، ناصر کاظمی، محسن نقوی، احمد فراز، افتخار عارف،

منیر نیازی، پروین شاکر اور قتیل شفائی وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔ مقالے کے لیے منتخب کردہ ڈائجسٹوں میں سے شعری نمونوں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

ماہنامہ اردو ڈائجسٹ، ماہنامہ حکایت اور ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ میں شاعری کے مختلف گوشے پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ہر شمارے میں مختلف طرز پر قارئین کی دلچسپی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے منتخب شاعری کو شامل کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اساتذہ کی کلاسیکل شاعری کو شامل کیا گیا ہے۔ مقالے کی طوالت پیش نظر تمام شماروں میں شائع ہونے والی شاعری کے گوشوں کا تذکرہ کرنا ممکن نہیں ہو گا۔ اس سے مقالے کی ضخامت بڑھنے کا اندیشہ تھا لیکن چند منتخب شماروں میں شائع ہونے والی شاعری کے گوشوں کا تذکرہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

ماہنامہ اردو ڈائجسٹ جنوری ۲۰۱۹ء کے شمارے میں عافیہ جانگیر کا مرتب کردہ شعری گوشہ شائع ہوا ہے۔ اس گوشے میں کلاسیکل شاعروں کے شعری نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں مومن خان مومن، مرزا اسد اللہ خان غالب، خواجہ میر درد اور عصر حاضر کے شعرا کے عنوان سے امجد اسلام امجد، احمد ندیم قاسمی اور آپ کا کلام کے عنوان سے شوق خان واہنی، لاہور، شرافت ضیاء، چک شہزاد، اسلام آباد، نزابت افشال، ضلع اٹک، زارا مظہر اور شانزہ خان، لاہور کا کلام شامل کیا گیا ہے۔

چھیڑیں گے وہی قصہ غم اور طرح سے
لائیں گے تجھے راہ پہ ہم اور طرح سے
سجدے میں جبیں، سینے میں پندار خدائی!
اب آئے ہیں کعبے میں صنم اور طرح سے (۱۷)

(امجد سلام امجد)

اردو ڈائجسٹ اگست ۲۰۱۹ء، کے ص ۱۸۷ پر عافیہ جہانگیر کا مرتبہ شعری گوشہ شائع ہوا ہے جس میں یوم آزادی کے حوالے سے کلاسیکل شعراء کی شاعری کو شامل کیا گیا ہے۔ ان میں احمد ندیم قاسمی، احمد فراز، حبیب جالب، کیفی اعظمی، جون ایلیا، علامہ اقبال، فیض احمد فیض اور جوش ملیسانی کا شعری کلام شامل کیا گیا ہے۔ نمونہ شاعری ملاحظہ ہو:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں (۱۸)

(فیض احمد فیض)

ماہنامہ حکایت کے شمارہ اگست ۲۰۱۷ء، کے ص ۶۵ پر محمد سعید اور عاصم وہرہ کی غزلیں پیش کی گئی ہیں۔

وہ صحیفے جو میرے سینہ صد چاک میں ہیں
تذکرے اب کے وہی وسعت افلاک میں ہیں
غور سے پڑھ تو سہی فلسفہ کن فیکون
سارے اسرار و مفاہیم تیری خاک میں ہیں (۱۹)

(محمد سعید رضا)

عاصم وہرہ کا نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

خوف دہشت غبار درد و الم
ریزہ ریزہ امن ہے سالوں سے
کیوں بہاریں اداس ہیں عاصم
دل بریدہ سخن ہے سالوں سے (۲۰)

(عاصم وہرہ)

سیارہ ڈائجسٹ جنوری ۲۰۱۷ء کے ص ۱۸۵ پر انتخاب ادارہ کی جانب سے شائع کیا گیا ہے جس میں بزم شاعری کے عنوان سے یاسمین کنولؔ، ایس امتیاز احمدؔ، ریاض حسین قمرؔ، میر تقی میرؔ، خواجہ میر دردؔ، خواجہ حیدر علی آتشؔ، محمد ابراہیم ذوقؔ، مرزا اسد اللہ خان غالبؔ، مومن خان مومنؔ، نواب مرزا خان داغؔ، الطاف حسین حالیؔ، مرزا محمد رفیع سوداؔ اور اقبالؔ کا کلام پیش کر کے شمارے کی زینت بنایا گیا ہے:

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو اب وفا کر چلے (۲۱)

(میر تقی میر)

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

تیرے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا (۲۲)

(مرزا اسد اللہ خان غالب)

سیارہ ڈائجسٹ جولائی ۲۰۱۸ء کے ص ۱۷۷ پر بزم شاعری کے عنوان سے ادارے نے ایک شعری انتخاب شائع کیا ہے جس میں نعت رسول مقبولؐ شوق خانواہنی، خانواہن، ریاض حسین قمر، ایس امتیاز کراچی، جاوید اقبال، بلال احمد فاروقی، محمد شفیق اعوان اور خواجہ میر درد کا کلاسیکل منتخب کلام شائع کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مریم شفیق، محمد ابراہیم ذوق کا انتخاب فیصل بٹ نے کیا ہے۔ حافظ مظہر محسن، لاہور، سید بدر سعید، لاہور، مہر نسیم، لاہور کینٹ، نواب ڈاکٹر امبر شہزاد، لاہور، ارشد ملک، سہیل اختر سہیل، مرزا اسد اللہ خان غالب کا انتخاب دانیہ بٹ اور مومن خان مومن کا انتخاب سلیم مظفر نے کیا ہے:

جب محبت تری آنکھوں میں نہاں لگتی ہے
موسم گل کی ادا اور جواں لگتی ہے
چپ رہوں تو ملامت مجھے کرتا ہے ضمیر
بات گر سچی کہوں ان کو گراں لگتی ہے (۲۳)

(محمد شفیق اعوان)

پہلے تو کسی کو بھی رُلایا نہیں کرتے
ہاں خود سے خفا ہو تو منایا نہیں کرتے
ایک بار گرا دیں جسے ہم اپنی نظر سے
اُس شخص کو پھر دل میں بٹھایا نہیں کرتے(۲۴)

(ارشد ملک)

سیارہ ڈائجسٹ کے اگست ۲۰۱۸ء، کے شمارے میں ص ۱۸۷ پر ادارے کی جانب سے شاعری کا ایک انتخاب شائع کیا گیا ہے جس میں نعت رسول مقبولؐ شوق خانواہنی اور شاعری میں ڈاکٹر محمد علی، بلال احمد فاروقی، صلاح الدین سحاب، راولپنڈی، داؤد گل، راولپنڈی، ڈاکٹر درخشاں نجم، کراچی، ایس امتیاز احمد، کراچی، ظفر گورکھپوری، راضی فاروقی اور اساتذہ کی کلاسیکل شاعری میں خواجہ میر درد، انتخاب عالیہ عمران، خواجہ حیدر علی آتش، انتخاب ماہ نور، محمد ابراہیم ذوق کا انتخاب قاسم علی، مومن خان مومن کا انتخاب میمونہ خالد، نواب مرزا خان داغ کا انتخاب حامد ندیم، الطاف حسین حالی کا انتخاب سائرہ خان، مرزا محمد رفیع سودا کا انتخاب شاعری شہریار اشرف نے پیش کیا ہے:

میں اپنی ہی دنیا میں اجنبی ہو جاؤں گا
اک دن آئے گا میں گہری نیند سو جاؤں گا
ہر چہرے میں ڈھونڈتی پھرو گی مجھے ہر پل
آہیں بھر بھر کر پکارو گی پر لوٹ کر میں نہ آؤں گا (۲۵)

(داؤد گل، راولپنڈی)

یار کو میں نے مجھے یار نے سونے نہ دیا
رات بھر طالعِ بیدار نے سونے نہ دیا

خاک پر سنگِ در یار نے سونے نہ دیا
دھوپ میں سایہ دیوار نے سونے نہ دیا (۲۶)

(خواجہ حیدر علی آتش-انتخاب ماہ نور)

جگ بیتی

جگ بیتی کا مفہوم؟

جگ بیتی سے مراد دنیا جہاں کی سر گزشت، دوسروں پر گزرا ہوا کوئی یاد گار واقعہ۔ دنیا اتنی وسیع و عریض ہے کہ اس میں ہر روز نت نئے واقعات کسی نہ کسی صورت میں رونما ہوتے رہتے ہیں۔ جب کوئی محقق یا ادیب ان واقعات کے بارے میں لکھتا ہے تو اُس کو جگ بیتی کہتے ہیں۔ جگ بیتی کسی بھی پہلو یا واقعہ کے حوالے سے لکھی جا سکتی ہے۔ جگ بیتی لکھنے کے لیے بھی آپ بیتی جیسے اُصولوں کی پاس داری کی جائے تو اس سے جگ بیتی کو معاشرے میں زیادہ مقبول بنایا جا سکتا ہے۔ ذیل میں منتخب کردہ ڈائجسٹوں میں پیش کی جانے والی نمائندہ جگ بیتوں کا تجزیہ پیش کیا جا رہا ہے۔

ا۔ کڑوا سچ-محمد رضوان-جگ بیتی

کڑوا سچ-جگ بیتی محمد رضوان قیوم نے لکھی ہے جو ماہنامہ حکایت، جون ۲۰۱۸ء کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔ اس کے راوی ابرار حسین ہیں۔ اس جگ بیتی میں ایک مریض پطرس اور حکیم نتھو رام کی زندگی کے ایک بڑے امتحان کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ راوی ابرار حسین کہتا ہے کہ یہ اس دن کی بات ہے جب میری نئی نئی شادی ہوئی تو میں نتھو رام کے مطب میں نوکری کرتا تھا۔ میرا مطب جانے کو ہرگز دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کا دل کر رہا تھا کہ وہ اپنی نئی نویلی دلہن کے پاس بیٹھا رہے، اس کے علاوہ میرے والد جو کہ سخت بیمار تھے ان کی تیمارداری کروں اور حکیم صاحب مجھے چھٹی نہیں دیتے تھے۔ حکیم صاحب گھر پہنچ گئے اور انہوں نے سخت سرزنش کی کہ میں آپ کو اس قدر زیادہ تنخواہ دیتا ہوں جو سب سے زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ آپ کو دیگر سہولیات بھی دی ہوئی ہیں۔ لیکن آپ مطب کیوں نہیں آتے۔ اپنی نوکری ذمہ داری سے کیوں نہیں کرتے۔ لہذا میں سارا کام چھوڑ کر حکیم صاحب کے مطب روانہ ہو گیا۔ حکیم صاحب بہت مغرور تھے۔ حکیم صاحب کا بہت نام تھا اور وہ بڑے بڑے لوگوں کا علاج کرتا تھا۔ ان کی ایک بیٹی گڑیا بھی تھی جس پر میں عاشق تھا اور اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ ایک دن حکیم صاحب کے ہاں ایک مریض آیا جس کا نام پطرس تھا۔ اس

کے پیٹ میں سخت درد ہو رہا تھا اور وہ گھبراتا جا رہا تھا۔ اس نے حکیم صاحب کو کہا کہ مجھ پر رحم کریں اور میرا علاج کریں لیکن حکیم صاحب کی منت سماجت کرنا سب بیکار گیا۔ حکیم صاحب نے اس کو دھتکار دیا اور اس کا علاج نہیں کیا۔ حکیم کہتا تھا کہ میں کسی ڈی سی کے گھر جا رہا ہوں اور میں اس کا علاج کروں گا۔ لہٰذا وہ اس کو چھوڑ کر چلا گیا۔

گپتا نامی حجام حکیم صاحب کے مطلب کے برابر میں دوکان کرتا تھا۔ اس نے بھی حکیم صاحب کی بہت منت سماجت کی لیکن حکیم نتھورام نے اس کی ایک نہ سنی اور غصے سے تانگے میں بیٹھ کر چلتا بنا۔ گپتا حجام اس سے سخت ناراض ہوا اور اس نے حکیم صاحب کو بہت کھری کھری سنائیں کہ تو بہت گھٹیا آدمی ہے، تجھے انسانیت کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ حکیم صاحب نے طیش میں آکر کہا کہ ابھی تو میں جا رہا ہوں۔ میں واپسی پر تجھ سے نپٹ لوں گا۔ لہٰذا پطرس جس کے پیٹ میں بہت زیادہ درد تھی اس کو جندھر لال نے دوا دی اور پھر اس کو لے کر ڈاکٹر بیلا سنگھ کے پاس بھی گئے لیکن اس کو کوئی افاقہ نہیں ہو رہا تھا۔ لہٰذا سب نے مل کر فیصلہ کیا کہ پطرس کو اس کے گھر والوں تک پہنچانا چاہیے کیونکہ اگر اس کے ساتھ کوئی واقعہ پیش آ گیا ساری ذمہ داری ہم پر آئے گی۔ لہٰذا وہ دونوں ساتھ لے کر اس کے گھر والوں کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ اس کے بھائی کو بتایا کہ حکیم نتھو رام نے اس کو دوائی نہیں دی اور گپتا کے کہنے پر بھی وہ نہیں مانا۔ آپ پطرس کو کسی اور حکیم سے دوائی لے کر دیں تاکہ اس کو سکون ہو۔ اس کے بھائی نے دونوں کا شکریہ ادا کیا اور اپنے بھائی کو کسی اور حکیم کے پاس لے گیا۔ جب پطرس کو چھوڑ کر واپس آ رہے ہیں تو مطلب کے برابر میں ایک نیا تماشہ لگا ہوا تھا کہ حکیم صاحب پولیس کو لے کر گپتا حجام کی دکان پر پہنچے اور انھوں نے پولیس والوں کو کہا کہ گپتا نے میرے ساتھ بدتمیزی کی ہے، میری بہت بے عزتی کی ہے۔ لہٰذا آپ اس کو گرفتار کر کے تھانے لے جائیں۔ اس پر بہت سے لوگوں نے حکیم نتھو رام کی منت سماجت کی اور پولیس والوں کو بھی سمجھایا کہ آپ گپتا کو یہیں پہ سزا دے لیں، مار پیٹ کر لیں، لیکن اس کو تھانے مت لے جائیں۔ لیکن حکیم نتھو رام نہیں مانا۔ پولیس والوں نے گپتا کو کڑی سے کڑی سزا دی اور بچارے گپتا کو نیکی کرنا مہنگی پڑ گئی۔ حکیم صاحب کا دماغ اس وجہ سے بھی خراب ہو گیا تھا کہ اب بہت سے گورے لوگ بھی دوائی لینے اس کے مطب میں آنا شروع ہو گئے تھے۔

ابھی اس واقعہ کو کچھ دن گزرے تھے کہ حکیم نتھو رام اپنے مطب کی رہائش گاہ پر سو رہے تھے کہ اچانک ان کے پیٹ میں درد شروع ہو گیا تھا۔ اختر اور ان کا ملازم بہت پریشان ہو رہے تھے اور انھوں نے حکیم صاحب کو بہت سے کشتے اور دوائیاں، دیگر معجون اور چیزیں مطب سے نکال کر دیں مگر کسی سے بھی کچھ افاقہ نہ

ہوا۔ اس پر ان کے ملازم نے بتایا کہ چند روز پہلے اسی طرح کا ایک مریض حکیم صاحب کے مطب میں آیا تھا لیکن حکیم صاحب نے اس کو کوئی لفٹ نہیں کروائی۔ اس کو دوائی بھی نہیں دی اگر اس سے پوچھا جائے کہ اسے کیسے آرام آیا تو وہ بتادے گا اور وہی دوائی حکیم صاحب کو دی جائے تو ان کو افاقہ ہو سکتا ہے۔ ایک بات ہے کہ وہ بتائے گا نہیں، کیونکہ حکیم صاحب نے اس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد حکیم کی بیگم نے کہا کہ مجھے اس کے پاس لے جاؤ میں اس کی منت سماجت کروں گی تا کہ وہ بتادے کہ کہاں سے اس کو آرام آیا تھا۔ اختر اور گڑیا ایک طرف بیٹھے تھے مگر حکیم بے بسی سے کہہ رہا تھا کہ مجھے گورے ڈاکٹر انیش کے پاس لے کر جاؤ۔ پھر اختر نے حکیم نتھورام کو بچوں کی طرح گود میں اٹھا کر ڈاکٹر انیش کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر نے کچھ ٹیسٹ لے کر حکیم صاحب کا علاج کیا لیکن پھر بھی حکیم صاحب کو آرام نہ آیا حکیم بدستور اپنا پیٹ پکڑ کر بیٹھا پریشانی کے عالم میں ہائے ہائے کر رہا تھا۔ چنانچہ اس کے گھر والے حکیم صاحب کو پطرس کے ہاں لے گئے جو حکیم صاحب کا مریض تھا۔ اس کے گھر پہنچے تو حکیم صاحب کی بیماری کے حوالے سے بتایا کہ کس شدت سے درد نے اس کو پریشان کر رکھا ہے۔ حکیم صاحب تو پطرس کے پاس نہ جانے کی ضد پر اڑا رہا اور اختر نے اس کو کئی قسم کی جڑی بوٹیاں اور دوائیاں کھلائی تھیں لیکن اس کا مرض بھی اس کی طرح ضدی ہو گیا تھا جو کہ کسی طریقے سے قابو میں نہیں آرہا تھا۔ جب حکیم صاحب کو اس کے مریض (پطرس) کے پاس لے کر گئے تو پطرس نے حکیم صاحب کے بارے میں خوب کھری کھری سنائیں اور ان کو دیکھتے ہی اتنے زیادہ غصے کا اظہار کیا کہ میں اس کو کبھی بھی معاف نہیں کروں گا۔ اس نے حکیم کو مخاطب کرتے ہوئے یوں کہا:

> ”حکیم انسانیت سے گرا ہوا انسان ہے۔ پطرس نے کہا۔ ”وہ ایک پاگل بے رحم کاٹنے والا کتا ہے۔ اس کا مر جانا ہی انسانیت کے لیے فائدہ مند ہے۔ اگر وہ ٹھیک ہو گیا تو دوبارہ کسی انسان کو انسان نہیں سمجھے گا۔ لوگوں کو ذلیل کرنا اس کا شیوہ ہے اور بلکہ اس کی رگوں اور زبان میں خون نہیں زہر رچا بسا ہوا ہے“ حکیمنی اس کے پاؤں پر گر کر گڑا گڑانے لگی تو اس نے کہا۔ ”اگر یہی بات تو مجھ سے ایک سودا کر لو“؟ وہ کیا حکیمنی نے پر تجسس ہو کر پوچھا۔ پطرس مسیح نے کہا کہ میں اسے اس کے موذی پیٹ کے درد سے نجات دلانے کا نسخہ خود بناؤں گا۔ وہ ایسا نسخہ ہو گا جس میں اسے آرام کے ساتھ سزا بھی دوں گا“ ۔(۲۷)

اس کے بعد پھر اس نے حکیم کے لیے دوائی بنائی جس سے اس کو قدرے افاقہ ہوا۔ ادھر حکیم صاحب درد سے بے حال تھے تو مجھے اس وقت موقع مل گیا تھا کہ میں گڑیا سے کچھ باتیں کرلوں۔ اس وقت گڑیا نے مجھے بہت سمجھایا اور کہا کہ میں نے تمھیں پہلے ہی سمجھایا تھا کہ میرا تمھارا ملن نہیں ہو سکتا۔ بہت سے ماہر ڈاکٹروں اور حکیموں نے حکیم صاحب کو لاعلاج قرار دے دیا تھا۔ اس کے سارے ٹیسٹ کروا لیے لیکن کوئی بھی اس کی بیماری کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ دو روز بعد اختر کے ساتھ پطرس کے گھر نسخہ لینے گئے تو اس نے ہماری بہت عزت کی لیکن حکیمنی کو بہت ذلیل کیا۔ حکیمنی چپ چاپ اس کی باتیں سنتی رہی اور اس نے نسخہ دے دیا اور کہا کہ اس نسخہ میں اس ظالم حکیم کے لئے شفا بھی ہے اور سزا بھی۔ حکیمنی نے کہا ارے وہ بوڑھا آدمی ہے اسے معاف کر دیں اس نے استدعا کی۔ لہٰذا پطرس کی دوائی سے حکیم صاحب کو آرام آیا تھا۔ اسی نے اس کو نسخہ بنا کر دیا جو حکیم صاحب نے کھایا تو اس کو درد سے کچھ نجات مل گئی۔ بنارس کا بہت بڑا مشہور ڈاکٹر بھی پطرس کے پاس آیا اور اس نے پطرس کے نسخہ کی تعریف کی۔ لہٰذا ڈاکٹروں اور حکیموں نے پطرس سے پوچھا کہ اس نسخے میں آپ نے کیا ملایا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس نسخہ میں کچھ جڑی بوٹیوں اور امرود کے پتے شامل کیے گئے ہیں۔ انھوں نے پوچھا کہ حکیم صاحب کو سزا دینے کے لیے تم نے کون سی ایسی اہم چیز ڈالی ہے جو اسے سزا دی ہے۔ حکیم اتنا احسان فراموش اور بدبخت انسان تھا کہ اس کو پطرس کی دوائی کے ساتھ آرام آنے کے باوجود اس نے اس کا شکریہ بھی ادا نہیں کیا۔

۲۔ ضرورت رشتہ، سیدہ شاہدہ شاہ-جگ بیتی

جگ بیتی "ضرورت رشتہ" سیدہ شاہدہ شاہ نے لکھی ہے جو حکایت کے شمارہ ستمبر ۲۰۱۸ء میں شائع ہوئی ہے۔ یہ جگ بیتی اخلاقی لحاظ سے دیوالیہ ہو جانے والے اس معاشرے کے اُن شکاریوں کی ہے جو انسانی خوشیوں کی شہ رگ سے لہو پینے کے لیے نئے جال بچھا لیتے ہیں۔ یہ کہانی ایسے ہی جرائم کی غمازی کرتی ہے۔ مذکورہ کہانی ایک نہتی لڑکی صاعقہ کی ہے جس کے والد ایک پرائمری اسکول ٹیچر تھے اور انہوں نے سخت محنت اور جانفشانی سے معاشرے میں قابل فخر مقام حاصل کرنے کی کوشش اور اپنی زندگی میں اپنی تین بیٹیوں کی پرورش کی اور ان کو پڑھایا لکھایا۔ لیکن جب ان کے رشتوں کی بات آئی تو ہر کوئی ان کو دیکھنے کے بعد یہی کہہ کر چلا جاتا تھا کہ وہ بعد میں بتائیں گے مگر اس کے بعد کبھی پلٹ کر نہ آتے۔ اگر کوئی پلٹ کر آجاتا تو اس کی بڑی بڑی خواہش ہوتی۔ کوئی کہتا ہے کہ بیرون ملک ویزا کے لیے پیسے دے دیں۔ کسی کو کوئی اور ضرورت ہوتی اور

وہ دولت اور گاڑی کا مطالبہ کرتا تھا۔ لیکن ان کی بیٹیوں کو دیکھنے کے بعد سوچ کر جواب دینے کا کہتا مگر وہ وقت کبھی بھی نہ آیا کہ جب انھوں نے سوچ کر جواب دیا ہو۔ انہی حالات میں صائقہ کا والد اپنی ملازمت سے ریٹائرڈ ہو گیا اور اپنی جمع شدہ پونجی اپنی تینوں بیٹیوں صاعقہ، صائمہ اور شازیہ کے نام کر دی ہے تا کہ جب کبھی ان کی شادی ہو تو یہ رقم ان کے کام آجائے۔ اس کی بیوی نائلہ بڑی سمجھدار خاتون تھی جو کہ اپنے شوہر کا ساتھ دیتے ہوئے اپنے گھر کا خرچہ بڑی سمجھداری کے ساتھ چلا رہی تھی۔ جب بیٹیوں کے رشتوں کی بات آتی ہے تو انسان بے بس ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کے حالات بیان کرتے ہوئے اس جگ بیتی میں بتایا گیا ہے:

> ”انسان غریب ہو تو اس کے رشتہ دار کم ہو جایا کرتے ہیں۔ کوئی انسان جتنا زیادہ غریب ہوتا ہے اس کے ان گنت رشتہ دار ہونے کے باوجود وہ دنیا میں تنہا رہ جاتا ہے۔ ماسٹر جمیل کے بھی کہنے کو تو بے شمار رشتہ دار تھے۔ تقریبا آدھا شہر رشتہ داروں سے بھرا ہوا تھا مگر صرف چند ایک نے ہی ان سے رابطہ رکھا تھا“۔ (۲۸)

ایسے ہی حالات گزرتے رہے اور ماسٹر جمیل اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد روزانہ ہوٹل پر چائے پینے کے بہانے اخبار پڑھتا اور اس میں سے کوئی ایسی نوکری تلاش کرتا، جس کو جاری رکھ کر وہ اپنی سفید پوشی کا بھرم بھی رکھ سکے اور کچھ آمدنی بھی ہو جائے تا کہ بچیوں کی شادی کے لیے پیسے کام آسکیں۔ جب کوئی بھی اخبار میں اشتہار اس کے مطابق سامنے نہ آتا تو وہ مایوس ہو کر شام کو گھر واپس آجاتا۔ اخبار پڑھتے پڑھتے ایک دن اس نے ضرورت رشتہ کا اشتہار دیکھا جس میں لکھا تھا کہ جہیز وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ صرف ایک خوبصورت اور تعلیم یافتہ لڑکی کا رشتہ درکار ہے۔ کوئی فیملی بیرون ملک سے لڑکے کی شادی کے لیے آئی ہے اور اس نے شادی کے بعد دبئی واپس چلے جانا ہے۔ رابطے کے لیے فون نمبر بھی دیا گیا تھا۔ ماسٹر جمیل نے خوش ہو کر سوچا کہ شاید یہ اشتہار ہمارے لیے ہی دیا گیا ہے جس سے وہ دل ہی دل میں خوش ہوا اور اپنے تاثرات کو یوں بیان کرتا ہے:

> ”اشتہار کو پڑھ کر ماسٹر جمیل کو یوں لگا کہ یہ رشتہ ان کی بیٹی صائقہ کے لیے ہی آیا ہے۔ چناچہ انھوں نے ٹیلی فون نمبر نوٹ کیا۔ جلدی سے پیالی میں بچی ہوئی باقی ماندہ چائے حلق میں انڈیلی اور کاؤنٹر پر بل ادا کر کے گھر کی طرف چل دیئے“۔ (۲۹)

گھر پہنچنے پر اس نے ساری بات اپنی بیوی نائلہ کو بتائی اور دونوں خوش تھے۔ لہٰذا انھوں نے پبلک کال آفس سے اخبار پر دیے گئے نمبر پر فون کیا تو واقعی ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ جب مخالف سمت سے آنے والی

آواز نے بتایا کہ ہمارا دبئی میں الیکٹرونکس کا کاروبار ہے۔ ہم وہاں مستقل رہتے ہیں۔ ہمیں صرف لڑکی کی ضرورت ہے جہیز وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ دوسری طرف سے کسی خاتون نے کہا کہ میرا بیٹا طارق آپ کی بیٹی کو دیکھنا چاہے گا۔ وہ بھی سب گھر والوں کی موجودگی میں۔ ماسٹر جمیل نے سوچا کہ اس میں تو کوئی ایسی بات نہیں ہے لہٰذا اگر وہ دیکھنا چاہے تو دیکھ لے۔ اس کے چند روز بعد ہی لڑکے والوں نے مطالبہ کیا ہے کہ وہ شادی کر کے جلد دبئی جانا چاہتے ہیں لہٰذا جلدی سے شادی کی تاریخ پکی کر لی جائے۔ اس طرح انھوں نے شادی کی تاریخ پکی کرنے سے پہلے لڑکی والوں کے گھر صاعقہ کی ہونے والی ساس شگفتہ قریشی اور ان کا بیٹا طارق قریشی آئے تو ماسٹر صاحب کے گھر والوں نے ان کی خوب خدمت کی اور وہ بھی بہت سی مٹھائیاں اور تحفے تحائف لے کر آئے۔ لڑکے کی ماں شگفتہ قریشی نے صاعقہ کو پرس سے نکال کر انگوٹھی پہنا دی اور کہا کہ ہمیں یہ رشتہ منظور ہے۔ اس نے اپنے بیٹے طارق قریشی سے کہا کہ اگر آپ کو اس رشتے پر کوئی اعتراض ہو تو بتا دو۔ اس نے کہا کہ میری ماں نے کر دیا ہے وہ اس سے سو فیصد اتفاق کرتا ہے:

> "یہ کہہ کر انہوں نے اپنا پرس کھولا اور سونے کی جھلملاتی ہوئی انگوٹھی نکال کر صاعقہ کی انگلی میں ڈالتے ہوئے بولیں۔ میں صاعقہ کے لیے کچھ نہیں لائی تھی۔ اس لیے میری طرف سے چھوٹا سا تحفہ قبول کیجیے۔ پھر وہ طارق سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی بیٹے اپنی ہونے والی دلہن کو تم نے دیکھ لیا اور امید ہے پسند بھی آئی ہو گی، کیا کوئی بات کرنا چاہتے ہو صاعقہ سے۔ نہیں امی۔ طارق نے مسکرا کر صاعقہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: میں جو کچھ پوچھنا چاہتا تھا وہ آپ نے پوچھ لیا۔ مجھے آپ کے انتخاب پر فخر ہے"۔ (۳۰)

اس طرح جلدی جلدی جمیل کی بیٹی صاعقہ کی شادی طارق قریشی سے ہو گی اور وہ خوشی خوشی لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ ان کی کوٹھی تقریباً ڈیڑھ کینال پر مشتمل تھی۔ اس کے بعد ماسٹر جمیل اپنی بیٹی سے کبھی کبھار لاہور ملاقات کے لیے بھی جاتا تھا۔ چند دنوں کے بعد انھوں نے کہا ہم واپس دبئی اپنے کاروبار کے سلسلے میں جانا چاہتے ہیں۔ وہاں پہنچ کر طارق قریشی نے صاعقہ کو ایک عربی کے ہاتھ فروخت کر دیا اور خود اس کے کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس پر صاعقہ کو سخت غصہ آیا۔ یہ عربی ایک دوسرے سے یوں مخاطب ہو رہے تھے:

> "صاعقہ کی رگوں میں شریف اور خود دار ماں باپ کا خون دوڑ رہا تھا۔ اسے ایسی ذلت آمیز زندگی مر کر بھی گوارا نہ تھی۔ چنانچہ اس نے اپنی عصمت و ناموس

اور سمندر پار بیٹھے ہوئے اپنے ماں باپ کی عزت بچانے کے لیے اپنی جان پر کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ دونوں عربی سامنے والے صوفے پر صاعقہ کے عزائم سے بے نیاز باتیں کر رہے تھے۔ صاعقہ تیزی سے قریبی کھلی ہوئی کھڑکی کی طرف بڑھی اور بیشتر اس کہ وہ عربی کچھ سمجھ سکتے، صاعقہ نے کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا دی"۔ (۳۱)

چھلانگ لگانے کے بعد صائقہ کی تو موت واقع ہو گئی لیکن اس نے اپنے ماں باپ کے لیے غیرت مند ہونے کا ثبوت دے دیا۔ اس طرح جب ماسٹر جمیل کو اپنی بیٹی کی موت کی خبر ملی تو ان پر ایک ہیبت طاری ہو گئی اور قیامت ٹوٹ پڑی، اس نے اِدھر اُدھر دوڑ کر لاہور میں وہ لوگ جس کو ٹھی میں اس بیٹی کو بیاہ کر لے گئے تھے۔ ان کا پتہ کیا تو محلہ کے لوگوں نے بتایا کہ یہاں ایک عورت اور ایک لڑکا اس کا بیٹا رہتے تھے جو کچھ عرصہ ہوا یہاں سے غائب ہو گئے ہیں۔ یہ گھر انھوں نے کرائے پر لیا تھا۔ ماسٹر جمیل کے گویا پاؤں سے زمین ہی نکل گئی اور اس کے گھر والوں کو آج بھی امید ہے کہ ایک نہ ایک دن ان کی بیٹی ان کے پاس ضرور آئے گی۔ لیکن افسوس کہ ان کی بیٹی اُجڑ گئی تھی۔ وہ ایک ایسے سفر پر روانہ ہو چکی تھی جہاں سے کبھی بھی واپس نہیں آسکتی تھی۔ جو لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں، جس طرح ماسٹر جمیل کو دھوکا دیا گیا ہے ایسے لوگوں کا کوئی دین مذہب نہیں ہوتا اور نہ یہ لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں۔ اس لیے ہمیں ایسے لوگوں سے بچنا چاہیے۔

۳۔ پس پردہ، عارف محمود۔ جگ بیتی

پس پردہ کے عنوان سے ماہنامہ حکایت، جنوری ۲۰۱۹ء کے شمارے میں چراغ دین کی زندگی کے بارے میں ایک دردناک جگ بیتی بیان کی گئی ہے جسے عارف محمود نے بیان کیا ہے۔ اس میں بتایا گیا کہ منصورہ کے قریب ملتان روڈ پر ایک شخص سڑک کراس کر رہا تھا کہ اچانک ایک مخالف سمت سے آنے والے ٹرک کے ساتھ ٹکرا کر اس کی موت واقع ہو گئی اور ٹرک اس کو روندتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ لوگوں نے ڈرائیور کو پکڑ کر مارنا شروع کر دیا لیکن میں وہاں پر موجود تھا اور یہ سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ چنانچہ میں نے لوگوں کو منع کیا کہ ڈرائیور کو نہ ماریں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ مرنے والا خود سڑک کے بیچ میں آگیا تھا جس کے باعث وہ ٹرک کے ساتھ ٹکرا گیا اور فوت ہو گیا۔ تمام لوگ وہاں جمع ہو گئے لیکن ایک شخص اس کا پرس چرا کر رفو چکر ہو گیا۔ میں نے ہمت کی اور اس کے پیچھے دوڑ لگائی تو اس کو پکڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے جب اس

سے پرس چھیننا چاہا تو اس بڑی بے دردی سے کہا کہ مرنے والا آپ کا کیا لگتا ہے؟ اس نے چاقو نکال لیا۔ میں نے اسے کہا کہ جتنے پیسے پرس میں ہیں وہ رکھ لیں اور اس کا شناختی کارڈ وغیرہ واپس کر دیں تا کہ اس بچارے کی لاش کو اس کے گھر والوں تک پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور تمام پیسے نکال کر پرس میرے حوالے کر دیا۔ میں جب حادثے کی جگہ واپس آیا تو وہاں پولیس پہنچ چکی تھی۔ پولیس نے ضروری کاروائی کرنے کے بعد لاش پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کر دی۔ اس کی جیب سے جو کاغذ ملا اس پر لکھا تھا:

> ”میں نے اے ایس آئی کو ایک عینی شاہد کے طور پر صورت حال بتا دی، اس نے لاش کی جیبوں کی تلاشی لی۔ اس کی جیب سے کاغذ کا پرزہ ملا، اس پر لکھا ہوا تھا کہ میں نے اپنی جان خود لے رہا ہوں اور کسی کو میری موت کا ذمہ دار نہ ٹھہرایا جائے“۔ (۳۲)

میں نے جب شناختی کارڈ سے اس کا ایڈریس دیکھا تو وہ میرے ایک دوست ماجد کے پڑوس کا رہنے والا تھا۔ اس کا نام چراغ دین تھا۔ میرا تجسس بڑھتا گیا اور میں اس خودکشی کرنے والے شخص کے مسئلہ کی تہہ تک پہنچنے کے لیے اپنے دوست ماجد کے گھر چلا گیا۔ ماجد کے والد نے بتایا کہ چراغ دین بہت اچھا آدمی تھا دل کا بہت صاف تھا۔ محنت مزدوری کر کے اپنا اور بچوں کا پیٹ پالتا تھا۔ جب میں اس کے گھر والوں سے ملا تو عجیب کیفیت ہوئی اور میری پریشانی کی انتہا نہ رہی کہ تمام لوگ اچھے اچھے کپڑوں میں ملبوس نظر آ رہے تھے جیسے کسی کو چراغ کے مرنے کا کوئی دکھ نہیں ہے۔ ماجد کے دوست نے مجھے بتایا کہ چراغ کی زندگی کی داستان بہت دردناک ہے۔ وہ اکثر مجھ سے ایسی باتوں کا ذکر کرتا رہتا تھا کہ جس کی وجہ سے وہ پریشان رہتا تھا۔ اس کی ایک بیٹی اور دو بیٹے ہیں۔ اس نے ساری زندگی بیرون ملک محنت مزدوری کر کے گزاری۔ چراغ دین خانیوال کے قریب ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ جب چراغ دین پیدا ہوا تو اس کی والدہ کے ہاں کوئی ایسا نقص پیدا ہو گیا تھا کہ وہ اس کے بعد مزید اولاد پیدا نہیں کر سکتی تھی اس کی ماں کا نام رابعہ تھا اور اس کے والد کا نام ولی محمد تھا۔ ولی محمد کے والد نے اپنے بیٹے کو یہ بات سمجھائی کہ رابعہ اب کبھی ماں نہیں بن سکے گی۔ اس لیے صاف لفظوں میں تمہیں بتاتا ہوں کہ جو بھینس دودھ نہ دے تو اس کو رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کے ساری جائیداد کوئی دوسرا لے جائے تم کوئی دوسری شادی کر لو۔ اس پر ولی محمد نے کہا کہ رابعہ کا کیا بنے گا؟۔ اس پر ولی محمد کی والدہ نے ذمہ داریاں سرانجام دیں اور رابعہ سے کہا کہ ہم ولی محمد کی دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ رابعہ جو اس سے پہلے بھی اس گھر میں ایسی باتیں سن چکی تھی اس نے کسی قسم کا ردعمل ظاہر نہیں

کیا اور سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہا کہ اللہ کوئی بہتر سبب پیدا کرے گا۔ ولی محمد کے گھر والوں نے جلد ہی رشتہ ڈھونڈ کر ولی محمد کی دوسری شادی کر دی۔ نئی دلہن کا نام شریفاں تھا مگر اس میں شریفوں والی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ آئے روز دھنگا فساد کرتی اور چراغ دین سے تو وہ شروع سے ہی سخت نفرت کرتی تھی۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اگر یہ جائیداد کا اکیلا وارث بن گیا تو یہاں ہماری عزت کم ہو جائے گی۔ آتے ہی اس نے ولی محمد کو اپنی زلفوں کا اسیر بنایا کہ وہ ہر وقت اس کے گرد گھومتا رہتا۔ لیکن اس نے شوہر کی آمدنی کا حساب بھی اپنے قبضے میں کر لیا اور تھوڑی تھوڑی رقم کے لیے بھی اس کے تفتیشی سوالات سے گزرنا پڑتا۔ خاص طور پر چراغ دین کے لیے پیسے خرچ ہوتے دیکھ کر وہ ناک بھوں چڑھا دیتی تھی۔ رابعہ یہ سب دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھنے لگی مگر زبان سے کچھ نہ کہہ سکتی تھی۔ اگر کبھی بھولے سے اس کی زبان سے شریفاں کے متعلق کوئی شکایت نکل جاتی تو ولی محمد اسے یوں دیکھتا جیسے کوئی بڑا بول بول دیا ہے۔ شریفاں نے پوری طرح سے پورے گھر کو اپنے نرغے میں لے لیا اور رابعہ پر الزام لگایا کہ اس نے مجھ پہ جادو کر رکھا ہے جس کی وجہ سے میرے ہاں بچہ پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس نے پیر کو بلایا جو اسے دم درود کرنے کے بعد پانچ ہزار روپے اور ایک بکری کا بچہ لے کر چلتا بنا۔ مگر شریفاں کے دل میں رابعہ کے لیے اتنا زہر بھر گیا کہ اب رابعہ کی زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی۔ آخر کار شریفاں کے ہاں بچے کی امید لگ گئی جس کے بعد شریفاں کی خاطر مدارت ہونے لگی اور اس نے یہ خوشخبری سنائی کہ پیر صاحب کے عمل کی وجہ سے رابعہ کی لگائی ہوئی بندش ٹوٹ گئی ہے، اب وہ ماں بننے والی ہے۔ اب اس کے ناز نخرے آسمان سے باتیں کر رہے تھے:

> "بچے کی پیدائش تک شریفاں کسی مہارانی کی طرح بستر پر پڑی اینڈتی رہتی اور خوب خدمت کراتی۔ گھر کا سارا کام رابعہ کے ذمہ لگا دیا گیا۔ یہاں بھی یہ احتیاط برتی گئی کہ رابعہ کو شریفاں کے لیے کوئی بھی کھانے پینے کی چیز تیار کرنے سے منع کر دیا گیا۔ یہ احتیاط اس لیے کی گئی کہ وہ کھانے پینے کی اشیاء میں کوئی ایسی چیز نہ ملا کر کھلا دے جس سے بچہ ضائع ہو جائے"۔ (۳۳)

شریفاں کے گھر سے جو لوگ بھی اسے ملنے آتے تو ان کی خوب آؤ بھگت ہوتی مگر رابعہ کی زندگی اجیرن ہوتی گئی۔ ایک دن شریفاں اور رابعہ گھر میں اکیلی تھیں اور شریفاں کا کزن نواز بھی آیا ہوا تھا، شریفاں نے رابعہ سے کہا کہ سٹور میں ٹرنک سے اس کا سوٹ نکال دے وہاں پہلے ہی شریفاں کا کزن نواز چھپا ہوا تھا۔ جب رابعہ سٹور میں داخل ہوئی تو شریفاں نے باہر سے کنڈی لگا دی اور شور مچانا شروع کر دیا کہ رابعہ نواز

کے ساتھ بدکاری کر رہی تھی تو اس نے باہر سے کنڈی لگا دی ہے۔ یہ سن کر ولی محمد طیش میں آ گیا اور اس نے رابعہ کی ایک نہ سنی۔ نواز نے بھی مکاری سے کہا کہ اگر میں اس کی بات نہیں مانتا تو یہ کہتی تھی کہ تمھیں بدنام کر دوں گی۔ میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ چراغ دین کو بھی یہ سب معلوم تھا مگر وہ چھوٹا تھا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس طرح شریفاں نے چراغ دین پر بھی زندگی تنگ کر دی۔ رابعہ نے اس بدنامی سے کنویں میں چھلانگ لگا کر اپنی زندگی ختم کر دی۔ اس کے بعد چراغ دین کو طرح طرح کی اذیتیں دی جانے لگیں اور شریفاں اس کو اس قدر ذلیل کرتی کہ وہ بے حد پریشان ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ شریفاں سے بدلہ لے اور اس کے بچے کو کنویں میں پھینک دے لیکن اس کی عمر بہت کم تھی اس لیے وہ کنویں کے پاس گیا تو بچہ رونے لگا۔ اس نے گھبرا کر اس کو کنویں کے قریب ہی لٹا دیا اور اس کے ارد گرد پتھر رکھ دیے تا کہ بچہ اِدھر اُدھر نہ جا سکے۔ اس کے بعد وہ گھر سے بھاگ کر لاہور پہنچ گیا۔ لاہور پہنچ کر اس کو رہنے کے لیے کوئی جگہ نہ ملی تو وہ ایک ہوٹل میں گیا۔ ہوٹل کے مالک نے اس سے پوچھا کہ تم گھر سے بھاگ کر آئے ہو۔ چراغ دین نے کہا کہ ہاں میں بھاگ کر آیا ہوں۔ مجھے رہائش کا مسئلہ ہے۔ اس نے کہا کہ آپ کو روٹی، رہائش اور تنخواہ بھی ملے گی۔ آپ نے صرف گاہکوں کی میز صاف کرنی ہے۔ وہ ایک عرصہ ہوٹل کی میزیں صاف کرتا رہا۔ ہوٹل میں ایک نیک دل کلرک قدوس روزانہ کھانا کھاتا تھا۔ قدوس نے جب اس کو دیکھا کہ چراغ دین پریشان ہے۔ اس نے چراغ دین سے وجہ پوچھی تو اس نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ چنانچہ قدوس نے کہا کہ ہماری کوئی اولاد نہیں اگر آپ ہمارے گھر آؤ تو میں تمھیں کھانا بھی کھلاؤں گا اور اپنے پاس رہنے کے لیے جگہ بھی دوں گا، کپڑے بھی دوں گا۔ چنانچہ چراغ دین قدوس کے ساتھ اس کے گھر چلا گیا۔ قدوس نے چراغ دین کو اپنے بیٹوں کی طرح رکھا اور اس کو الیکٹریشن کا کام سکھایا۔ جب چراغ دین پیسے کمانے کے قابل ہوا تو اس نے ایک دن قدوس کو رقم پیش کی کہ اپنی چاچی کو دے دے لیکن انھوں نے کہا کہ بیٹا آپ اپنی کمائی سنبھال کے رکھو جوان ہو گئے تو تمہاری شادی ہو گئی۔ یہ پیسے تمہارے کام آئیں گے۔ وہ بڑا ہوا تو قدوس کی بیوی نے اس کا رشتہ ڈھونڈ کر اس کی شادی کروا دی۔ چراغ دین الیکٹریشن کا کام سیکھ کر بیرون ملک چلا گیا۔ واپسی پر اس کی شادی ہوئی تو اس کی بیوی نازیہ نے چراغ دین کو اتنی اہمیت نہ دی۔ کیونکہ وہ بی اے پاس تھی جبکہ چراغ دین ان پڑھ تھا۔ وہ ہر وقت اس کو بیرون ملک بھجواتی رہتی ہے اور اس کے بھیجے ہوئے پیسے سے خوب عیاشیاں کرتی۔ وہاں سے اس کے بھیجے ہوئے پیسوں سے اس نے اپنے لیے ایک عالی شان کوٹھی بنوالی۔ نازیہ کے اندر بہت بڑی خواہش پیدا ہو چکی تھی کہ وہ پوش علاقے میں گھر بنائیں گے۔ چراغ دین نے نازیہ کی خواہش پر اپنی پانچ سال کی کمائی سے کوٹھیوں کے علاقے

میں ایک کنال کا پلاٹ خرید کر نازیہ کے نام کر دیا اور فوری طور پر اس کی تعمیر شروع کر دی۔ اس نے بیرون ملک سے پیسے بھیج کر کوٹھی تیار کروادی۔ وہ رات دن مشین کی طرح کام کرتا رہا۔ اسے چھٹی والے دن اور رقم بچانے کے لیے چوبیس چوبیس گھنٹے کام کرنا پڑتا جس سے اس کی رنگت سیاہ ہو چکی تھی۔ جب بھی چراغ دین فیصلہ کرتا کہ وہ اپنے ملک واپس جائے گا تو نازیہ اس کو یہ کہتی تھی کہ اگر تم اپنے ملک آ گئے تو اخراجات کیسے پورے ہوں گے۔ بچے تو پڑھ رہے ہیں۔ ان کا خرچہ کیسے پورا ہو گا؟ اس لیے تم دل لگا کر کام کرو۔ جب بچے بڑے ہو جائیں گے تو واپس آنا جانا۔ چراغ دین کی جدوجہد کی کہانی سناتے ہوئے ماجد کے والد نے بتایا:

> "دن رات کی مسلسل محنت مشقت، کچھ عمر کی زیادتی کی وجہ سے چراغ بیمار رہنے لگا۔ کمپنی کا ڈاکٹر علاج کرتا تو عارضی فائدہ ہو جاتا اور کچھ دنوں بعد پھر وہی حالت ہو جاتی۔ ڈاکٹر نے اسے ہسپتال داخل کر کے اس کے پیٹ کے کچھ ٹیسٹ وغیرہ کیے تو انکشاف ہوا کہ اسے جگر کا کینسر ہو چکا اور لاپرواہی کی وجہ سے اس کی جڑیں اتنی پھیل چکی ہیں کہ علاج معالجے کے لیے اس کو کمپنی نے خاصی رقم دی اور اس کے علاوہ اس کے تمام واجبات دے کر ملازمت سے فارغ کر دیا"۔ (۳۴)

اس طرح جب اپنے ملک واپس آ گیا تو نازیہ طرح طرح کے بہانے بنا کر اس سے لڑائی جھگڑا شروع کر دیتی اور کہتی کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کر لیں تاکہ بچوں کے خرچے پورے ہو سکیں۔ اس طرح چراغ دین کو جو خطیر رقم کمپنی نے دی تھی۔ اس نے یہ نازیہ کا منہ بند کرنے کے لیے دے دی۔ مگر یہ ایک عارضی بندوبست تھا۔ اس کے بعد نازیہ نے پھر رقم کا مطالبہ شروع کر دیا۔ ایک ایسا وقت آیا کہ چراغ نوکری چھوڑ کر ہمیشہ وطن واپس آ گیا تو یہاں رہنے سے اس کی پریشانیوں اور مسائل میں اور اضافہ ہو گیا۔ ایک دو بار ایسا ہوا کہ اچانک وہ جب اپنے گھر میں آیا تو اس نے اپنی بیوی کو کسی غیر مرد کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے سنا:

> "مجھے اس پر ترس تو آتا ہے لیکن میں نے اس الیکٹریشن کو خاوند کی حیثیت سے کبھی بھی تسلیم نہیں کیا۔ یہ تو میرے ماں باپ کا فیصلہ تھا جسے میں نے آج تک قبول نہیں کیا، میں تو شروع سے ہی تمھیں پسند کرتی تھی۔ تم ان دنوں آوارہ نہ ہوتے تو میری شادی تمہارے ساتھ ہی ہونی تھی"۔ (۳۵)

یہ سن کر چراغ دین کے دماغ میں زلزلہ برپا ہو گیا تھا کہ میں نے ساری عمر جن کے لیے دوسرے ملک کی خاک چھانی تھی آج وہی اس کے لیے سب پرائے ہو گئے تھے۔ اسے اس لیے گھر میں رکھا

گیا تھا کہ تمام گھر والے اس کے کمائے ہوئے پیسے سے عیاشی کر سکیں۔ اس طرح چراغ دین اپنی زندگی سے دل برداشتہ ہو گیا اور اس نے زندگی کے مقابلے میں موت کو گلے لگانے پر ترجیح دی۔ چراغ دین خودکشی نہ کرتا تو کیا کرتا۔ ماجد کے باپ نے کہا کہ دعا کرو اللہ پاک اس کے سب گناہ معاف کر دے۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ اس جگ بیتی کو پڑھ کر اپنوں سے بھی اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ یہ جگ بیتی ہمارے معاشرے اور دنیا میں ہونے والے المیہ پر ہے جس میں انسان زندگی کے اس دوراہے پر پہنچ جاتا ہے جب وہ زندگی کی بازی ہار جاتا ہے۔ ساری زندگی مشکل اور کھٹن حالات کا سامنا کرنے کے باوجود بھی اس کی زندگی میں سکون نہیں۔

انٹرویوز

انٹرویو سے کیا مراد ہے؟

کسی معلومات کے حصول کے لیے کسی اہم شخصیت سے جو سوال و جواب کیے جاتے ہیں، انھیں انٹرویو کہتے ہیں۔ انٹرویو کے اغراض و مقاصد مختلف حوالوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ مشاہیر کے انٹرویو ان کی پیشہ وارانہ کامیابیوں، زندگی کے تجربات اور ان کے ذاتی خیالات کو جاننے کے لیے کیے جاتے ہیں جو اس شعبے کے لوگوں اور عام قارئین کے لیے بھی نہایت دلچسپ ہوتے ہیں اور ان میں معلومات کا ایک خزانہ چھپا ہوتا ہے۔ ہم کسی بڑے آدمی کا انٹرویو لے کر یا اسے پڑھ کر اس میں سے بہت سی کام کی باتیں سیکھ سکتے ہیں۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ انٹرویو کی اپنی اہمیت ہے۔ متعلقہ شماروں کے حوالے سے مقالے میں چند اہم شخصیات کے انٹرویوز بھی شامل کیے جا رہے ہیں۔

ا۔ انٹرویو: ایئر مارشل اصغر خان- الطاف حسین قریشی

پاک فضائیہ کے پہلے کمانڈر چیف ۱۷ جنوری ۱۹۲۱ء کو جموں میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۶ء میں رائل انڈین ملٹری کالج ڈیرہ دون میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۴۰ء میں گریجویشن کی۔ ۱۹۴۱ء میں انڈین ایئر فورس میں شامل ہوئے۔ ۱۹۴۴ء میں برما میں بطور فلائنگ کمانڈر خدمات انجام دیں۔۔ ۱۹۴۵ء میں سکوارڈن لیڈر بنے۔ ۱۹۴۶ء میں برطانیہ گئے۔ ۱۹۴۷ء میں فلائنگ ٹریننگ سکول انبالہ میں چیف فلائنگ انسٹرکٹر مقرر ہوئے۔ ۵ جنوری ۲۰۱۸ء میں راولپنڈی میں انتقال ہوا۔

ایئرمارشل اصغر خان کا انٹرویو ماہنامہ اردو ڈائجسٹ کے شمارے، فروری ۲۰۱۸ء میں شائع ہوا ہے۔ یہ انٹرویو الطاف حسین قریشی مدیر اعلیٰ ماہنامہ اردو ڈائجسٹ نے کیا ہے۔ زیر نظر انٹرویو اس دور کا ہے جب ایئرمارشل اصغر خان پی آئی اے کے مینجنگ ڈائریکٹر کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں انجام دے رہے تھے۔ الطاف حسین قریشی جب ایئرمارشل اصغر خان سے انٹرویو کے لئے تشریف لے گئے تو انھوں نے ایئرمارشل صاحب سے پی آئی اے کی بہت زیادہ خامیوں کے بارے میں سوالات کیے تو ایئرمارشل اصغر خان نے کھلے دل سے ان کی شکایت کو سنا اور اعتراف کیا۔ پھر انھوں نے وضاحت کی کہ یہ خامیاں کیوں کر پی آئی اے میں موجود ہیں اور ان کو کس طرح سے دور کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے انٹرویو کی ایک خاص بات یہ تھی کہ انھوں نے اپنی زندگی میں ہمیشہ قائداعظم کے فرمودات سے سبق حاصل کیا۔ اس کا سبب شاید یہ تھا کہ انھوں نے قائداعظم کو بہت قریب سے دیکھا، ان کی عادات کا بغور مشاہدہ کیا اور ان کو اپنی زندگی میں لاگو کر کے ان پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کی، الطاف حسین قریشی نے ایئرمارشل اصغر خان کی بیگم سے بھی ملاقات کی اور ان کے گھریلو حالات کے بارے میں تفصیلی بات کی تو ان کی بیگم نے بھی ائیرمارشل اصغر خان کو بڑے اچھے الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔ ائیرمارشل اصغر خان کی بیگم نے بتایا کہ انھوں نے پورے گھر کو اس طرح سے مربوط کیا ہوا کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کا خود خیال رکھتے ہیں:

> ”گھر میں اس قسم کا ماحول بنا رکھا ہے کہ ہمارے ذہنوں میں کسی قسم کی ہوا پیدا نہیں ہونے پاتی۔ بچوں کو آرام اور آسائش کا خوگر ہونے نہیں دیا۔ وہ سخت سے سخت ماحول میں بھی مسکراتے رہیں گے“۔ (۳۶)

اصغر خان قائداعظم کے ان الفاظ کو شدت سے محسوس کرتے ہیں اور ان کو اپنے ذہن میں بٹھایا ہوا ہے۔ قائداعظم کو وہ اپنی آئیڈیل شخصیت خیال کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں انسان کے مضبوط ارادے ہی اس کی عملی زندگی میں کامیابی کی ضمانت ہوتے ہیں۔ انسان کو زندگی میں کبھی ہمت نہیں ہارنی چاہیے اور مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ وہ قائداعظم کے فرمودات کو بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں:

> ”مسلمانوں کی پوری تاریخ دیکھ لیجیے۔ ان پر جب کبھی بُرا وقت آیا، اسی وقت ان کے اندر سے عمل اور کردار کی بے پناہ قوت اُمڈ پڑی۔ ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ انشاءاللہ ہماری قوم ایک عظیم تاریخ بنائے گی“۔ (۳۷)

اصغر خان کا ذہن غیر متوقع طور پر کام کرتا تھا وہ جس چیز کو دیکھ لیتے تھے۔ پھر اس انداز میں دیکھتے تھے کہ اس کے تمام منفی اور مثبت پہلو کا ایک ہی نظر میں بغور جائزہ لے لیتے تھے۔ انٹرویو کے دوران اسی طرح کے ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے ایک بڑا دلچسپ واقعہ سنایا کہ

"ایئرمارشل اصغر خان نے ڈیفنس سوسائٹی کراچی میں اپنا ایک مکان بنوایا۔ مکان کی ڈیزائننگ مشہور آرکیٹیکٹ مسٹر بلوم فیلڈ نے کی تھی۔ ایک روز ایئرمارشل اسی فرم کے ایک کہنہ مشق انجینئر مسٹر لٹن کے ساتھ مکان دیکھنے گئے۔ ایئرمارشل سیڑھیوں سے اوپر چلے گئے اور واپس اُترتے ہوئے ایک سیڑھی پر اڑ کے کہنے لگے: مسٹر لٹن، یہ سیڑھی چھوٹی ہے۔ جی نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ میرے خیال میں یہ ۸/۱۱ انچ چھوٹی ہے۔ مسٹر لٹن اختلاف کرتے رہے۔ فیتہ منگوا کر پیمائش کی گئی تو سیڑھی واقعی ٹھیک ٹھیک ۸/۱۱ چھوٹی تھی"۔ (۳۸)

انھوں نے انٹرویو میں مزید بتایا کہ اسی طرح جب وہ فوج میں ایئرمارشل کے عہدے پر کام کر رہے تھے تو اپنے جوانوں کے لیے کچھ اس طرح کا ماحول بنایا ہوا تھا کہ ہر جوان کو کام کرنے کے لیے بالکل ریلکس رکھا ہوا تھا انہوں نے عملی زندگی کے تین واضح اصول بنائے تھے وہ ایک صابر اور بردبار آدمی تھے۔ انھوں نے جو اصول بنائے ان میں پہلا اُصول یہ تھا کہ نوجوانوں میں جذبات کو ابھارتے تھے۔ نوجوانوں کو کوئی مشکل کام کہنے سے پہلے اس کام کو خود کر کے دکھاتے تھے۔ کیونکہ کامیاب ہونے کے لیے یہ ایک بڑی دلچسپ بات ہے۔ سخت سے سخت مشکلات کا آغاز اپنی ذات سے ہی کرتے۔ ایئرمارشل اصغر خان کا دوسرا اصول یہ تھا کہ نوجوانوں کو پورا پورا آرام ملے۔ جسمانی آرام کے ساتھ ساتھ ان کے ذہنی سکون کا بھی خیال رکھتے تھے انہیں احساس تھا کہ اگر ایک ہوا باز کی زندگی پریشان ہو گی تو وہ فضا میں خوفناک حادثے کا شکار ہو سکتا ہے۔ تیسرا اصول یہ تھا کہ پاک فضائیہ کو دفاعی جنگ کے لیے تیار کیا جائے۔ ان کا اندازہ تھا کہ جنگ جب بھی ہوئی بہت شدید اور بہت تیز ہو گئی اور اس جنگ کا فیصلہ شروع کے دو تین روز میں ہی ہو جائے گا۔ ایئرمارشل اصغر خان کی زندگی کا سب سے بڑا اصول یہ تھا کہ وہ کبھی کسی کی سفارش قبول نہیں کرتے تھے اور کسی سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ اس کا ایک ثبوت یہ تھا کہ جب وہ پی آئی اے کے مینجنگ ڈائریکٹر بنے تو ان کے بھائی کا ایک ڈیری فارم تھا یہاں سے پی آئی اے کو دودھ سپلائی ہوتا تھا۔ انھوں نے اپنے بھائی کو خط لکھا کہ آپ کی یہ سپلائی بند کی جا رہی ہے، یعنی انھوں نے ذاتی مفاد کو قومی مفاد پر ترجیح دی۔ اس طرح ایک اچھی خاصی رقم کا نقصان ہر ماہ ان

کے بھائی کو اٹھانا پڑا جسے انھوں نے خندہ پیشانی سے سب کچھ برداشت کیا۔ ائیر مارشل اصغر خان کی ایک بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ وہ اپنا نعم البدل ہر وقت تیار رکھتے تھے۔ انھیں یہ بات معلوم تھی کہ وہ کسی بھی وقت نوکری چھوڑ کر جاسکتے ہیں اور جب وہ نوکری چھوڑ کر جائیں تو ان کے چھوڑنے سے ملک اور قوم کے مفادات کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ اس لیے وہ اپنا متبادل ہر وقت تیار رکھتے تھے۔ وہ ہمیشہ یہ کہتے تھے کہ کسی سے خوف محسوس نہیں کرنا چاہیے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ سچ بات سننے کا اپنے اندر پورا پورا حوصلہ رکھتے تھے۔ وہ اپنے ماتحتوں سے اچھا سلوک کرتے تھے اور اگر ان سے کوئی غلطی ہو جاتی تو بڑی خندہ پیشانی سے ان کو معاف کر دیتے تھے۔

۲۔ انٹرویو: استوان سابو، سفیر ہنگری-اعجاز طیب قریشی

اُردو ڈائجسٹ نے اپنے شماروں میں ایسی کئی شخصیات کے انٹرویوز شامل کیے ہیں جن کا پاکستان کی خدمات کرنے میں خاصا کردار رہا ہے جن کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے اور جاننے کا موقع ملتا ہے کہ ایسے لوگ بھی ہیں جو کہ محب وطن ہیں اور اپنے اصولوں کے کس قدر پابند ہیں جن میں ایئر مارشل اصغر خان کے نام کے علاوہ ہنگری کے سفیر استوان سابو کا نام بھی شامل ہے۔

انٹرویو: اردو ڈائجسٹ شمارہ، دسمبر ۲۰۱۹ء میں ہنگری کے وزیر اعظم استوان سابو کے ساتھ طیب اعجاز قریشی نے ایک انٹرویو کیا جس میں پاکستان اکانومی کے بارے میں بہت دلچسپ سوالات کیے۔ ہنگری کے سفیر محترم استوان سابو نے اپنی سرگزشت کا آغاز کرتے ہوئے بتایا کہ جب انھوں نے ہوش سنبھالا تو اپنی تعلیم کا آغاز کرتے ہوئے ایک مقامی ٹیکنیکل یونیورسٹی میں داخلہ لینے کا سوچا تھا۔ وہ ٹیکنیکل تعلیم و تربیت حاصل کر کے جہاز رانی کے شعبہ میں اپنا کردار ادا کرنا چاہتے تھے تاکہ ملک و قوم کی خدمت کر سکیں گے۔ لیکن بد قسمتی سے ان کو اس یونیورسٹی نے داخلہ نہیں دیا تو انھوں نے اس کا ذکر اپنی والدہ کے ساتھ کیا۔ تب انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ بین الاقوامی تعلقات عامہ میں داخلہ لیں گے اور اس طرح انھوں نے تعلقات عامہ میں داخلہ لیا اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ وہ کئی ملکوں میں سفارت کاری کے فرائض انجام دے چکے تھے۔ انھوں نے مصر میں کافی عرصہ خدمات انجام دیں۔ لیکن انھوں نے بتایا کہ پاکستان میں ان کے رہنے کا تجربہ بہت اچھا رہا ہے۔ پاکستان کے حوالے سے بات کرتے ہوئے بتایا کہ یہ منفرد دیس اس وقت کئی چیلنجوں سے نبرد آزما ہے لیکن پاکستانی قوم ہمت کرے تو متحد ہو کر تمام چیلنجوں کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ دراصل ترقی کرنے کا

سفر یک دم مکمل نہیں ہوتا بلکہ اسے زینہ بہ زینہ طے کرنا پڑتا ہے۔ میری موجودگی میں پچھلے سات سال کے دوران پاکستان نے ترقی کی ہے۔ تاہم یہ سفر اونچ نیچ سے بھی عبارت رہا ہے۔ پاکستان کے بین الاقوامی تعلقات کے حوالے سے انھوں نے بات کرتے ہوئے بتایا کہ جب ہمارے ہمسایہ ملک ہم سے اچھا برتاؤ کریں گے تو ہم بھی جواب ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں گے۔ لیکن اگر کوئی پڑوسی عام حالات میں ہمارے ساتھ اچھا سلوک نہ کرتا ہو تو ہمیں اس کے ساتھ اسی طرح کا برتاؤ نہیں کرنا چاہیے بلکہ تحمل مزاجی کے ساتھ اس کے ساتھ رہنا چاہیے۔ اس طرح سے بتدریج اپنی فہم و فراست کے ساتھ اپنے تعلقات پڑوسی ملک کے ساتھ ٹھیک کر سکتے ہیں۔ انھوں نے اپنے پڑوسیوں کی مثال دیتے ہوئے ان کے بارے میں ذاتی تجربے کا ذکر کیا کہ ان کے پڑوسی ہمیشہ ان کے ساتھ معمولی باتوں پر لڑائی جھگڑا کرتے رہتے تھے۔ کبھی ٹی وی کی آواز اونچی کرنے پر اور کبھی کوڑا پھینکنے پر ان سے لڑائی جھگڑا ہو جاتا تھا۔ انھوں نے اس کا ایک حل نکالا جسے وہ اپنے لفظوں میں بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں :

> ”میں پھر ان کے گھر جانے لگا۔ کبھی مٹھائی لے جاتا تو کبھی کیک۔ ان سے مختلف موضوعات پر گفتگو کرتا۔ اس طرح رفتہ رفتہ ہماری دوستی ہو گئی۔ وہ ہمارے اچھے دوست بن گئے اور ان کی ساری نفرت جاتی رہی۔ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کو بھی اپنے پڑوسیوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنے چاہیں۔ اس کا بنیادی فائدہ یہ ہے کہ پاکستان کے لیے ترقی یافتہ اور خوشحال ملک بننے کا سفر آسان ہو جائے گا“۔ (۳۹)

انھوں نے پاکستانی عوام کو اپنے تجربے کی بہت کار آمد باتیں بتائیں۔ خاص طور پر ایک بات کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ جو بھی نئی حکومت آتی ہے اس کو بہت سے چیلنجز کا سامنا ہوتا ہے۔ پاکستان کی مختلف وقتوں میں آنے والی حکومتوں کو مختلف چیلنجز کا سامنا تھا۔ سفیر محترم نے بتایا کہ جب تک ٹیکسوں کے نظام کو کسی قوم میں روشناس کروا کر مربوط نہیں کیا جاتا اس وقت تک کسی ملک کی اکانومی ترقی نہیں کر سکتی اور نہ مضبوط ہو گی۔ انھوں نے اس بات کا ذکر کرتے ہوئے اپنے تجربات کا نچوڑ پیش کیا اور اپنی بات کو یوں بیان کیا:

> ”جو بھی نئی حکومت آتی۔ وہ یہی رونا روتی ہے کہ پاکستانی ٹیکس نہیں دیتے۔ دینے کی اہلیت رکھنے والوں کو شکایت ہے کہ ٹیکس کا نظام ہمیشہ پیچیدہ ہے اور یہ کہ لینے والے دیانت دار نہیں۔ وہ ٹیکس کی رقم کا کچھ حصّہ ہڑپ کر جاتے ہیں۔ ایف بی آر

دہائی دیتا ہے کہ دینے والے پورا ٹیکس ادا نہیں کرتے اور ڈنڈی مار جاتے ہیں۔
دونوں طرف بدگمانی اور شک و شبہات موجود ہیں"۔(۴۰)

استوان سابو نے اپنے انٹرویو میں بتایا کہ جب تک عوام کا اعتماد حکومت پر بحال نہیں ہو گا اس وقت تک ہم کسی ملک یا قوم کی اکانومی کو کامیابی کے ساتھ آگے لے کر نہیں چل سکیں گے۔ اس طرح استوان سابو نے بین الاقوامی تعلقات کے بارے میں بھی بہت سی کارآمد باتیں کیں۔ انھوں نے ہنگری کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ جب سوویت یونین نے ہنگری پر حملہ کیا تو ہماری قوم نے اس حملے کا بھرپور جواب دیا پھر آہستہ آہستہ انھوں نے اس حملے سے اپنے آپ کو سنبھالا اور آخر کار وہ وقت آ گیا کہ جب سوویت یونین کو مکمل شکست کا سامنا کرنا پڑا اور ان کو ملک بدر کر دیا گیا۔ آج ہنگری پوری طرح سے آزاد مملکت کے طور پر زندگی گزار رہا ہے اور اس کے عوام بہت خوش حال ہیں اور عوام کا اعتماد حکومت پر دن بدن مضبوط ہو رہا ہے۔

۳۔ انٹرویو: لیفٹیننٹ ریٹائرڈ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی

لیفٹیننٹ ریٹائرڈ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی کو ملٹری کراس ایوارڈ سے نوازا گیا۔ جاپان میں برٹش آرمی کی جانب سے بہادری دکھانے پر ٹائیگر سپاہی کا خطاب دیا۔

لیفٹیننٹ ریٹائرڈ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی کا انٹرویو ماہنامہ حکایت کے شمارے، دسمبر ۲۰۱۹ء میں شائع ہوا ہے جس میں مشرقی پاکستان کے حوالے سے لیفٹیننٹ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی نے مشرقی پاکستان، ہمارے ملک کے صاحب اقتدار طبقہ اور جرنیلوں کے حوالے سے بہت سے دل خراش واقعات اور باتیں کی ہیں۔ انھوں نے سیاست دانوں کے بارے میں بتایا کہ اپنے مفاد کی خاطر پاکستان کو دو ٹکڑے کر دیا لیکن وہ اس کا الزام فوج کے اوپر رکھنا چاہتے تھے۔ اس انٹرویو میں انھوں نے کھل کر ان باتوں پر اظہار خیال کیا ہے کہ اس میں فوج کا کوئی قصور نہیں۔ صرف ان سیاستدانوں نے اپنے مفادات کو سامنے رکھتے ہوئے ملک کو دولخت کر دیا اسی طرح کشمیر کے حوالے سے بہت سی باتیں کی ہیں جن سے اگر پردہ اُٹھایا جائے تو کئی راز افشا ہو سکتے ہیں۔

لیفٹننٹ ریٹائرڈ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی کا کہنا ہے کہ پاکستان کو امریکہ اور روس نے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے جس میں کچھ پاکستانی سیاستدان بھی شریک تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی بھی منصوبہ یا کوئی بھی سازش اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک اندر کے لوگ سازشی لوگوں کے ساتھ

شامل نہ ہو جائیں۔ انھوں نے اپنے انٹرویو کے دوران یہ بات بھی بتائی ہے کہ بھارت کشمیر پر قبضہ کبھی بھی برقرار نہیں رکھ سکتا۔ چین ایسا بالکل نہیں ہونے دے گا۔ انھوں نے کچھ تاریخی حوالوں کے ساتھ سلطان ٹیپو اور اس طرح کے بہت سے دیگر سپہ سالاروں کے بارے میں بھی بتایا ہے کہ جنھوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے بہادری سے جنگیں کیں لیکن ناکام کرنے والوں نے مختلف حیلوں بہانوں کے ساتھ اپنی سیاسی شکست کو فوجی شکست میں بدلنے کی بھرپور کوشش کی۔ لیفٹننٹ ریٹائرڈ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی نے عمران خان، نواز شریف، جنرل پرویز مشرف اور جنرل ضیاء الحق کے بارے میں بہت سے رازوں سے پردہ اٹھایا۔ مولانا عبدالستار خان نیازی، ڈاکٹر طاہر القادری اور جنرل ضیاء الحق اور بڑے بڑے سیاستدانوں اور فوجی جرنیلوں کے بارے میں جن میں جنرل جہانگیر کرامت اور اس طرح کے سپہ سالار شامل تھے۔ مشرقی پاکستان کی صورتحال کے بارے میں بھی کھل کر بتایا اور پاکستان کے سیاسی اور معاشی حالات کو سدھارنے کے لیے بھی ہمیں کئی ایک اہم باتیں اور طریقہ کار بتائے۔ ان کے انٹرویو کی ایک خاص بات یہ تھی جس پر وہ ہمیشہ زور دیتے ہیں کہ پاکستان کی اکانومی اور معاشی حالات کو کیسے بہتر بنایا جاسکتا ہے:

> ”پاکستان کے سیاسی اور معاشی حالات کو سدھارنے کے حوالے سے ایک سوال کے جواب میں جنرل نیازی نے کہا کہ لگژری گڈز پر پابندی لگا دینا چاہیے۔ لپ اسٹک پر نو سو روپے خرچ کرنے کی بجائے چار آنے کا گاندا سہ استعمال کیا۔ جائے ڈبے کے دودھ کی بجائے ماں کا دودھ استعمال کرنا چاہیے۔ روپے کی قیمت کم کرنی کرنا چاہیے۔ سیگریٹ بند کر دیں۔ کرپٹ لوگوں کو پھانسی دیں۔ چند لوگوں کو مارے بغیر کام نہیں چلے گا۔ لوگوں کی قوت خرید میں اضافہ ہو۔ اس ملک کو ٹھیک کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ یہاں انصاف رائج کیا جائے۔ سب لوگوں کے لیے ایک سا لباس ہو“۔ (۴۱)

اسی طرح جنرل نیازی نے سیاسی اور سماجی مسائل حل کرنے کے لیے سستے اور آسان نسخے انصاف، مہنگائی کے حوالے سے اور لگژری چیزوں کے متبادلات کے بارے میں بتایا ہے کہ مہنگی چیزوں کو چھوڑ کر اس کے مقابلے میں سستی چیزوں کا استعمال کیا جائے تو ملک کی اکانومی پر بوجھ کم ہو سکتا ہے۔ لوگوں کا معیار زندگی بلند ہو سکتا ہے۔ اس طرح لوگ ترقی بھی کر سکیں گے اور ان کے مسائل بھی کم سے کم ہوں گے۔

۴۔ انٹرویو: اداکار محمد علی۔ محمد بوٹا انجم

محمد علی ۱۹ اپریل ۱۹۳۱ء کو رام پور میں پیدا ہوئے اور ۱۹ مارچ ۲۰۰۶ء کو اس جہانِ فانی سے رحلت فرما گئے۔ اُن کو نگار ایوارڈ، تمغہ حسن کارکردگی اور ستارہ امتیاز سے نوازا گیا۔

محمد بوٹا انجم کی اداکار محمد علی سے ملاقات پر مشتمل انٹرویو ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ، نومبر ۲۰۱۹ء میں شائع ہوا ہے۔ وہ اداکار محمد علی کی انسان دوستی کی کامیاب روداد کے حوالے سے لکھتے ہیں کم سنی میں جب ان کے والد کا انتقال ہو گیا تو اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکے۔ جس کے بعد انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے شہر میاں چنوں کو چھوڑ کر لاہور میں اپنی روزی روٹی کا بندوبست کریں گے مگر ایسا نہ ہو سکا۔ جب وہ تلاش معاش کے سلسلے میں لاہور گئے تو وہاں بیروزگاری کے ہاتھوں انھیں بہت سی پریشانیوں کا سامنا رہا۔ لاہور میں ان کا جاننے والا صرف ایک آدمی تھا جو کسی کوٹھی پر مالی کا کام کرتا تھا۔ وہ صبح سویرے اٹھتے مالی کے ساتھ اس کے کام میں ہاتھ بٹا کر نوکری کی تلاش میں نکل پڑتے لیکن کہیں بھی نوکری کا کوئی بندوبست نہ ہو سکا۔ اسی طرح دن گزرتے گئے ایک دن وہ سارا دن سڑکوں پر چہل قدمی کرنے کے بعد شام کو جب گھر آئے تو ایک پرانے اخبار پر ان کی نظر پڑی جس میں اداکار محمد علی کے بارے میں لکھا ہوا تھا کہ وہ ایک دردمند دل رکھنے والے انسان ہیں جو حاجت مندوں کی مدد کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتے۔ ان کے ذہن میں اداکار محمد علی کا ایک ایسا نقشہ تیار ہو گیا کہ وہ ان سے ملنے کے لیے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اگلی صبح وہ محمد علی سے ملنے ان کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ محمد علی ان دنوں کسی دوسرے شہر گئے ہوئے تھے۔ انھوں نے سیکورٹی گارڈ سے ملنے کی فرمائش کی تو اس نے بہت معذرت کی کہ وہ ان کو محمد علی سے نہیں ملوا سکتے۔ لیکن ان میں سے ایک شریف آدمی جس نے اپنا نام سلمان خان بتایا اور کہا کہ وہ علی زیب کا مینیجر ہے وہ گھر اور آفس میں ان کے کچھ معاملات کا نگران بھی ہے اور وہ ان کی ملاقات اداکار محمد علی سے ضرور کروا دے گا۔ اس طرح کافی انتظار کے بعد جب محمد علی دوسرے شہر سے واپس آئے تو انھوں نے محمد بوٹا انجم کو محمد علی سے ملوا دیا۔ ان کی یہ ملاقات بہت یادگار تھی۔ جس کا احوال انھوں نے اس طرح سے بیان کیا ہے:

> ”یہ سب کچھ اس عظیم انسان نے انتہائی اطمینان سے سنا اور پھر فلموں میں سنی ہوئی ان کی پائیدار آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔ اچھا تو آپ کو کام کی تلاش ہے؟ ایسا کیجیے کہ آپ مجھے آج دو بجے کے بعد ایورنیو سٹوڈیو میں مل لیں۔ یہ کہہ کر وہ اپنی

گاڑی میں بیٹھے ہی تھے کہ اچانک خیال آیا کہ مجھے اسٹوڈیو میں گھسنے کون دے گا"۔ (۴۲)

محمد بوٹا انجم کی اداکار محمد علی سے یہ ملاقات بالکل ادھوری تھی کیونکہ انھوں نے ان سے نہ تو کوئی لمبی چوڑی بات کی اور نہ کھل کر اپنی ملاقات کا مدعا بیان کر سکے۔ انھوں نے سوچا کہ محمد علی نے مجھے ملنے کا تو کہہ دیا ہے مگر انھیں اسٹوڈیو میں داخل کون ہونے دے گا۔ اس پر انھوں نے ان سے گزارش کی کہ میں سر میں سٹوڈیو میں داخل کیسے ہوں گا؟ اس پر محمد علی نے کار کے ڈیش بورڈ سے کاغذ کا ایک پرزہ نکال کر اس پر بال پوائنٹ سے دستخط کر دیے اور وہ کاغذ ان کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا کہ یہ بتاؤ گے تو آپ کو اسٹوڈیو کے اندر داخل ہونے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔ چنانچہ وہ یہ کاغذ کا ٹکڑا لے کر اسٹوڈیو کی طرف روانہ ہو گئے۔ پوچھتے پچھاتے ماڈل ٹاؤن سے ملتان روڑ کا رخ کر لیا۔ کسی نہ کسی طرح محمد بوٹا انجم ان کے آفس میں پہنچ گئے۔ اپنے آفس محمد علی اپنے سب دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر چائے پی رہے تھے تو محمد بوٹا انجم نے ان سے ملاقات کی اور جب محمد علی کو انھوں نے اپنا مسئلہ بتایا تو محمد علی اپنے تمام دوستوں اور حاضرین سے یوں مخاطب ہوئے:

"جب انور اور میں مہمانوں کو چائے پیش کر رہے تھے تب محمد علی نے حاضرین کو مخاطب کر کے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ نوجوان آج صبح مجھے میرے گھر پر ملا تھا۔ کالج میں بی اے کا طالب علم تھا کہ ان کے والد کی اچانک وفات کے باعث تعلیم کو خیر باد کہنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ اپنی والدہ کا واحد سہارا ہے اور روزگار کی تلاش میں ہے۔ کیا آپ میں سے کوئی اس ضرورت مند کی مدد کر سکتا ہے"۔ (۴۳)

محمد علی کا یہ رویہ اور یہ فقرے محمد بوٹا انجم پر اس قدر اثر انداز ہوئے کہ وہ ان کی محبت کا قائل ہو گیا۔ محمد علی نے ان سے کہا کہ آپ کو گھر سے نکلے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں اور آپ کو روزگار کی تلاش تھی۔ لہذا آپ کا روزگار کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ آپ کچھ دن کے لیے اپنی والدہ کے ساتھ ملاقات کریں اور ان کو تسلی دیں۔ اس پر محمد بوٹا انجم بہت پریشان ہوئے کیونکہ ان کی جیب میں میاں چنوں تک کا کرایہ بھی نہیں تھا۔ چنانچہ ان کو ایک خیال آیا کہ ان کا ایک جاننے والا لاہور میں رہتا ہے جس کا نام یوسف خان ہے وہ فوراً ان کے پاس گئے۔ انھوں نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی اور میاں چنوں تک کا کرایہ دیا۔ جب وہ اپنی والدہ کے پاس پہنچے تو انھیں اس بات کی خبر ہوئی کہ ان کے ایک استاد ان کے گھر پر آئے تھے اور انھوں نے ان کے لیے کسی زمیندار کے بچوں کو چھٹیوں کا کام کروانے کے لیے روزگار کا بندوبست کیا ہے تاکہ وہ زمیندار کے بچوں کو

غوث پور قریشیاں میں پہنچ کر چھٹیوں کا کام کروائیں اور اس طرح سے وہ ان کو نقد رقم کے علاوہ اناج کی صورت میں بھی ضرور مدد کریں گے۔ محمد بوٹا انجم نے محمد علی کی نوکری کی بجائے اپنی والدہ اور استاد کا حکم مانتے ہوئے غوث پور قریشیاں میں ذمہ داریاں سنبھال کر زمیندار کے ہاں ملازمت اختیار کر لی۔ وہ محمد علی سے ملاقات اور ان کے رویے کو زندگی میں کبھی فراموش نہیں کر سکے۔

ناقابل فراموش واقعات

تعریف

انسان زندگی صرف ایک ہی طرز پر نہیں گزارتا بلکہ اس میں مختلف لمحات اور ناقابل فراموش واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ انسان چونکہ خوشیوں اور دکھوں سے عبارت ہے۔ اس لیے اس کی زندگی میں کبھی خوشی کے لمحات آتے ہیں تو کبھی غم اور پریشانیاں اسے گھیر لیتی ہیں۔ ایسے واقعات انسان کے لیے یادگار یا ناقابل فراموش واقعات بن جاتے ہیں اور یہ واقعات اسے ساری زندگی ہمیشہ یاد آتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات ہم دنیا میں کسی دوسرے کو پریشانی اور خوشی کے عالم میں دیکھتے ہیں تو ہمیں اپنی خوشیاں اور غم یاد آنے لگتے ہیں۔ ایسے واقعات کو ناقابل فراموش واقعات کہتے ہیں کہ جنھیں ہم زندگی میں کبھی بھول نہیں سکتے۔ مقالے میں شامل شماروں میں سے ذیل میں چند ناقابل فراموش واقعات بیان کیے جا رہے ہیں۔

ا۔ وہ کون تھی؟، دانیہ صدیقی، ناقابل فراموش واقعہ

وہ کون تھی؟ یہ ناقابل فراموش واقعہ دانیہ صدیقی نے لکھا ہے جو ماہنامہ اردو ڈائجسٹ کے شمارے فروری ۲۰۱۷ء میں شائع ہوا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ایک شخص الیکٹرونکس کمپنی کے دفتر میں ملازم تھا اور وہاں چار لوگ اور بھی ملازمت کرتے تھے۔ یہ ۲۴ دسمبر کی ایک شام کا ذکر ہے جبکہ اگلے روز ۲۵ دسمبر کی چھٹی تھی۔ تمام ملازمین اپنے گھروں کو جا چکے تھے مگر ایک ملازم کو یہ کہہ کر کمپنی والوں روک لیا تھا کہ بندرگاہ پر کچھ الیکٹرونکس کا ضروری سامان آ رہا ہے اور موسم بھی خراب ہے۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ بارش ہو جائے تو سارا مال ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس لیے اسے اتارنا بہت ضروری ہے۔ چناچہ انھوں نے اپنے گھر فون کیا اور مال اتارنے کے لیے ٹرک اور مزدوروں کا بندوبست کر کے بندرگاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ واپسی پر جب دفتر پہنچے تو بارش اور رات زیادہ ہونے کی وجہ سے ان کو دفتر میں ہی رُکنا پڑا۔ اس لیے ان کو انتظار کرنا پڑا کہ

بارش رک جائے تو وہ اپنے گھر جائیں۔ اس دفتر میں ایک ریسپشنسٹ بھی موجود تھا جو رات کو ان کے ساتھ دفتر میں ڈیوٹی دے رہا تھا۔ اس رات ایک ایسا عجیب واقعہ پیش آیا کہ دفتر میں اچانک ایک زور دار چیخ سنائی دی تو لوگ پریشان ہو کر آواز کی سمت بڑھے۔ یہ آواز اس ریسپسنسٹ کی تھی۔ وہ ریسپشنسٹ دفتر کے ایک کونے میں کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ہم اس کی طرف بڑھے مگر وہ بے حد خوفزدہ تھا۔ ہم نے اسے پانی پلا کر اس کے ہوش وہواس بحال کروائے تو اس نے بتایا کہ اس نے تھوڑی دیر ستانے کی غرض سے کرسی کے ساتھ ٹیک لگائی تھی اور پھر میری آنکھ لگ گئی۔ اسی دوران اچانک کسی نے میرے بائیں گال پر ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کیا جس سے میں ہر بڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی بات کرتا اسی دوران کسی نے مجھے کالر سے پکڑ کر کھڑا کیا۔ پھر ایک اور زور دار تھپڑ رسید کر دیا جس کے نتیجے میں گر پڑا اور پھر چیختا چلاتا اپنی سیٹ چھوڑ کر یہاں آ کر کھڑا ہو گیا ہوں۔ لہٰذا اس واقعے سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہاں دفتر میں ان کے علاوہ اور کوئی موجود بھی نہیں تھا۔ یہ ایک ایسا واقعہ تھا کہ جس نے ان کو چین سے سونے نہ دیا۔ وہ اس واقعہ کو یوں بیان کرتے ہیں:

> ”اچانک ہمیں ہال سے ریسپشنسٹ کی زور دار چیخ سنائی دی۔ ہم پریشان ہو کر آواز کی سمت دوڑے جہاں وہ ہال کے ایک کونے پر کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ہم اس کی طرف بڑھے مگر وہ بے حد خوف زدہ تھا۔ پانی پی کر اس کے حواس کچھ بحال ہوئے تو اس نے لرزتے کانپتے بتایا”میں نے تھوڑی دیر ستانے کی غرض سے اپنے پیر سیدھے کر کے کرسی سے ٹیک لگالی تھی اور پھر میری آنکھ لگ گئی کہ اچانک کسی نے میرے بائیں گال پر ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کیا۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا، اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتا کسی نادیدہ ہستی نے مجھے کالر سے پکڑ کر کھڑا کیا اور ایک زور دار تھپڑ مزید رسید کر دیا۔ جس کے نتیجے میں، میں گر پڑا اور پھر چیختا چلاتا اپنی سیٹ چھوڑ کر یہاں آ کر کھڑا ہو گیا“۔ (۴۴)

اسی طرح جب وہ دفتر میں کچھ دیر اور رُک گئے تو ان کے ساتھ جو دوسرے لوگ تھے اور وہ عجیب و غریب واقعہ سے دوچار ہوئے کہ کمپیوٹر روم میں کوئی فرد بھی موجود نہیں تھا۔ لیکن پچھلی سیٹوں پر کمپیوٹر پر مسلسل ٹائپ کرنے اور کسی کے گنگنانے کی آوازیں آ رہی تھیں جس کو انھوں نے محسوس بھی کیا۔ ان میں سے ان کے ایک دوست حامد نے ان آوازوں کو اپنے موبائل کیمرے میں ریکارڈ کرنے کی کوشش بھی کی۔ اس واقعہ کا احوال وہ یوں بتاتے ہیں:

"ہم ابھی اس صورتحال پر غور کر ہی رہے تھے کہ وہی آوازیں دوبارہ آنے لگیں۔ واقعی کوئی لڑکی دھیمے سروں میں گنگنا رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ کی بورڈ پر برق رفتاری سے ٹائپنگ بھی کر رہی تھی۔ ہال کے سارے کمپیوٹر بند پڑے تھے اور وہاں ہمارے علاوہ کوئی نہیں تھا مگر ہم واضح طور پر پچھلے ڈیسک سے ابھرتی ہوئی گنگناہٹ اور ٹائپنگ کی آواز سن رہے تھے"۔ (۴۵)

چنانچہ اس کے طرح دو واقعات ہم نے دیکھے۔ اس کا ذکر ہم نے گھر جا کر اپنے اہل خانہ سے کیا تو انھوں نے کہا کہ آپ کو فوراً اس کمپنی کو چھوڑ دینا چاہیے۔ کیوں کہ وہاں کوئی ایسی چیزیں موجود ہیں جس سے آپ کو زیادہ نقصان بھی ہو سکتا ہے۔ دوسری طرف کمپنی کے مالک نے سب ملازمین کو کہا کہ اس واقعہ کا ذکر کسی سے نہ کیا جائے اس واقعے کے بارے میں کسی نے کسی سے ذکر کیا تو اس کو نوکری سے نکال دیا جائے گا۔ چنانچہ اس نے اپنی ساکھ برقرار رکھنے کے لیے اس واقعہ کو دبانے کی کوشش کی اور جن ملازمین کو اس واقعہ کے بارے میں معلوم تھا ان کی چھٹی کروادی۔ اس طرح ہم اپنی کمپنی کے مالک کی بے حسی پر سخت پریشان ہوئے کہ ایک غریب آدمی کو بلاوجہ انھوں نے نوکری سے نکال دیا ہے۔ اس واقعے کو جب بھی ہم یاد کرتے ہیں تو ہمارا ذہن الجھ کر رہ جاتا ہے کہ آخر وہ کونسی روح تھی کہ جس نے ریسپشنٹ کو تھپڑ رسید کیے اور کمپیوٹر پر ٹائپنگ بھی کرتی رہی۔ جس کی آوازوں کو باقاعدہ ریکارڈ بھی کیا گیا۔ ان سوالوں کے انہیں آج تک جوابات کی تلاش ہے اور اتنا وقت گزر جانے کے بعد بھی ابھی تک کوئی جواب نہیں مل سکا۔

۲۔ چودھری آفاق، اسامہ منور-ناقابل فراموش واقعہ

یہ ناقابل فراموش واقعہ چودھری آفاق کے بارے میں ہے جو اسامہ منور نے تحریر کیا ہے۔ یہ ناقابل فراموش واقعہ ماہنامہ اردو ڈائجسٹ، اگست ۲۰۱۷ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ واقعہ اس طرح سے ہے کہ چودھری آفاق اپنے گاؤں کا سب سے بڑا زمیندار تھا جو لوگوں کے فیصلے خود کرتا تھا۔ ایک بار جب گاؤں والوں نے اس کے سامنے اپنے مسائل رکھے تو وہ انتہائی پریشان اور نادم ہو گیا۔ ان میں سے ایک مسئلہ یہ تھا، جو چودھری صاحب کو بتایا گیا کہ گاؤں کی مسکینوں کہہ رہی ہے کہ وہ کسی صورت میں اپنی زمین چودھری آفاق کے نام نہیں کروائے گی۔ اس کے بعد دوسرا مسئلہ یہ بتایا گیا کہ فضلو نے کہا ہے کہ جب تک چودھری آفاق پہلے پیسوں کا حساب نہیں کرتا ہم اس کی زمین کے لیے اپنے ٹیوب ویل کا پانی بند کر دیں گے۔ اسی طرح

اس کو بتایا گیا کہ ٹھیکیدار کہتا ہے کہ چودھری آفاق کی بھینسوں نے اس کے تربوز کے کھیتوں میں داخل ہو کر وہ تباہی مچائی ہے کہ جس پر سوچ رہا ہے کہ ان کے خلاف پرچہ درج کروادے۔ یہ سارے مسائل سننے کے بعد چودھری آفاق غصے میں آگیا اور اس نے اپنے ملازم گاموکو بلایا اور اتنا مارا کہ اس کا جسم لہولہان کر دیا جس پر گامو نے کسی قسم کے ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ گاموکا احوال بیان کرتے ہوئے سعید الدین نے لکھا ہے:

> ”گاما چودھری آفاق کی بھینسیں چرایا کرتا تھا اور ساتھ میں ان کا دودھ دوھ لیتا۔ اس کے بدلے چودھری آفاق دو وقت کی روٹی اور کپڑے دے دیتا۔ گامے کا اپنا کوئی گھر نہیں تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ گاما پاگل ہو چکا ہے کیوں کہ وہ بس اپنے کام سے مطلب رکھتا، کسی سے کوئی بات نہیں کرتا۔ عمر بھی ۷۰، ۷۵ سال تک پہنچ چکی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنی زندگی کے آخری دن گن رہا ہے“۔ (۴۶)

اب گامے کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ گاما کون تھا؟ گاما ہندوستان میں ایک بہت بڑا زمیندار تھا جو کہ کھیتی باڑی کر کے نہایت عزت و آبرو کے ساتھ اپنی زندگی بسر کر رہا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے کام کی طرف توجہ دیتا۔ گامے کا نام اس کے والدین نے چودھری غلام محمد اس لیے رکھا تھا کہ وہ کسی کے ساتھ بھی زیادتی نہ کر سکے اور اپنے آپ کو محمد کا غلام سمجھے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ چودھری غلام محمد عصر کے بعد اپنی دھان کی فصل کے کھیتوں میں فصل کا جائزہ لے رہا تھا کہ اس وقت ہندوستان پاکستان بننے کی خبریں عام سنائی دے رہی تھیں۔ گامے کے ساتھ ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا جس کا احوال سعید الدین نے اس طرح بیان کیا ہے:

> ”ایک دن نماز عصر کے بعد حسبِ معمول چودھری صاحب اپنی فصلوں کی طرف گئے تاکہ جائزہ لے سکیں۔ دھان کی فصل پک چکی تھی۔ انھوں نے دیکھا کہ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ سب مزدور نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ اب چودھری غلام محمد کو تشویش لاحق ہوئی اور دل میں کھٹکا بھی ہوا۔ جلدی سے گاڑی گھر کی طرف موڑی لیکن وہ اسٹارٹ ہی نہ ہوئی۔ اللہ اللہ کر کے شام کے وقت گھر پہنچے تو یہ دیکھ کر چیخیں نکل گئیں کہ ہر طرف لاشیں بکھری پڑی ہیں اور بیٹیوں کے ٹکڑے پڑے تھے۔ تھوڑی دور ابا جی اور اماں جی کی لاشیں مل گئیں جبکہ بیوی کی لاش نہیں ملی“۔ (۴۷)

یہ منظر دیکھ کر گاما بہت پریشان ہوا اور اس نے اپنی جان بچانے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگنا شروع کر دیا۔ چنانچہ وہ کسی طرح چھپتا چھپاتا بھاگتا ہوا پاکستان آگیا اور یہاں آکر چودھری آفاق کے ہاں اس نے ملازمت اختیار کرلی۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ چودھری غلام محمد کی زندگی کس قدر تلخ حقیقت پر مبنی تھی۔ زندگی کو اس طرح سوچ کر انسان پر وحشت طاری ہو جاتی ہے، لیکن چودھری غلام محمد نے یہ سب کچھ برداشت کیا اور اپنی زندگی کی گاڑی کو کچھ اس طرح سے چلاتا رہا کہ چودھری آفاق اس کو جتنا بھی مارتا جتنا بھی بُرا بھلا کہتا ہے مگر آج تک اس نے اس کے سامنے زبان نہیں کھولی تھی۔ جس واقعے پر اس کی آج پٹائی ہوئی اور اسے انتہائی بے دردی کے ساتھ پیٹا گیا تھا، اس میں گاموکا کوئی قصور نہیں تھا کیونکہ چودھری آفاق کی بیٹی نے گاموسے کہا تھا کہ اسے تربوز بہت پسند ہیں۔ لہٰذا وہ اس کے لیے جب تربوز لینے گیا تو چودھری آفاق کی بھینسیں ٹھیکیدار کے کھیت میں داخل ہو گئیں اور انھوں نے وہاں خوب تباہی مچائی، جس کی سزا گاموکو بھگتنا پڑی۔ اس ناقابل فراموش واقعہ سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ بعض اوقات انسان کو اللہ تعالیٰ ایسا وقت دکھاتا ہے کہ جس پر انسان بالکل بے یارومددگار ہو کر اُسی کے رحم و کرم پر رہ جاتا ہے اور وہ سب کچھ برداشت کرتا ہے جو عام حالات میں نہیں کرتا۔

۳۔ وہ طوائف بن گئی، سعید الدین۔ ناقابل فراموش واقعہ

ناقابل فراموش واقعہ ”وہ طوائف بن گئی“، سعید الدین کا لکھا ہوا یہ ناقابل فراموش واقعہ، حکایت کے شمارہ جولائی ۲۰۱۷ء میں شائع ہوا ہے۔ اس میں ایک شخص افضل کی کہانی بیان کی گئی ہے کہ جس کے والد کی منیاری کی دکان تھی اور یہی دکان اس سے پہلے اس کا والد گھر کی گزر بسر کرتا تھا۔ افضل کے والد کی وفات کے بعد اس نے اپنے والد کی منیاری کی دکان سنبھالی اور محلے کی لڑکیاں اس کے پاس سودا سلف لینے کے لیے آتی تھیں۔ ان میں سے ایک لڑکی صغریٰ تھی جو پہلے اپنی دوستوں کے ساتھ اور پھر اکیلی مسلسل اس کی منیاری کی دکان پر آتی۔ افضل کو اس کے ساتھ محبت ہو گئی۔ آخر اس نے صغریٰ سے شادی کرلی۔ اس کے بعد صغریٰ کے دو بچے بھی پیدا ہوئے۔ افضل کا ایک دوست امریکہ، یورپی ممالک میں ملازمت کرتا تھا۔ افضل نے اس سے تقاضا کیا کہ وہ اسے بھی اپنے ساتھ باہر لے جائے۔ اس نے پہلے تو اس سے معذرت کی کہ اس کی لیکن جب افضل کا تقاضا زور پکڑتا گیا اور اس نے اپنے دوست سے کہا کہ اس چھوٹی سی دکان سے میرا گزارا نہیں ہوتا اور میں بچوں کو بہتر مستقبل دینا چاہتا ہوں۔ چنانچہ اس کا دوست افضل کو امریکہ لے جاتا ہے۔ وہاں جاکر افضل

خوب ڈالر کماتا ہے اور جب وہ وطن واپس آتا ہے تو اس کے پاس کافی دولت جمع ہو چکی ہوتی ہے۔ اب وہ سوچتا ہے کہ اس کی بیوی صغریٰ اس کے معیار کے مطابق نہیں کہ اس کو وہ یورپ لے کر جا سکے۔ وہ اپنے دل میں فیصلہ کرتا ہے کہ وہ دوسری شادی کرے گا۔ وہ حیلے بہانے سے صغریٰ کو طلاق دے دیتا ہے۔ سب لوگ اسے منع کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ کسی کی بات نہیں مانتا۔ وہ صغریٰ کو طلاق دینے کے بعد ایک کم عمر لڑکی کے ساتھ شادی کر لیتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ عذرا کے ساتھ شادی کر کے بہت خوش ہو گا۔ اس کو لے کر وہ جب یورپی ممالک میں جائے گا تو اس کی بہت عزت ہو گی۔ صغریٰ کی طلاق کا منظر یوں بیان کیا گیا ہے:

> "صغریٰ کو طلاق دینے کے بعد اس نے رشتے کرانے والی ایک مائی کے ذریعے پھر اپنے لیے بیوی تلاش کرنا شروع کر دی۔ اب وہ غیر شادی شدہ تھا اس لیے رشتہ ملنا مشکل نہیں تھا۔ افضل کی ماں ایک سال پہلے ہی وفات پا چکی تھی اس لیے افضل کو روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کی دونوں بہنوں نے مخالفت کی مگر افضل نے اس کی پرواہ نہ کی"۔ (۴۸)

اب جب افضل اپنی نئی بیوی عذرا کو لے کر یورپ جاتا ہے تو اس نے وہاں پہنچ کر حیلوں بہانوں سے افضل کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ اس نے وہاں کی زبان سیکھنا شروع کر دی اور ایک کمپنی میں ملازمت اختیار کر لی۔ وہاں اس کے ایک حبشی کے ساتھ تعلقات قائم ہو گے جس کے ساتھ اس نے کسی دوسرے ملک جانے کا پلان بنایا۔ وہ افضل کو کسی صورت بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ جب وہ اسے منع کرتا تو وہ افضل کی خوب بے عزتی کرتی ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ:

> "افضل سے طلاق لے کر وہ ایک جرمن کے ساتھ رہنے لگی اور پھر اس شہر سے ہی غائب ہو گئی۔ ہم نے اسے فراموش کر دیا مگر افضل کے لیے یہ بڑی شدید چوٹ تھی۔ وہ پہلی بیوی کو اپنے قابل نہیں سمجھتا تھا اس لیے اسے طلاق دے آیا تھا۔ دوسری بیوی نے اسے اپنے قابل نہ سمجھا اور اس سے علیحدہ ہو کر کسی اور کے ساتھ چلی گئی"۔ (۴۹)

وہ افضل کو چھوڑ کر کسی دوسرے شہر جا کر طوائفوں کے کسی گروہ میں شامل ہو گئی۔ افضل نے اس کی بہت زیادہ عزت کی مگر وہ افضل کے ساتھ رہنے پر بالکل بھی رضامندی نہیں تھی۔ چنانچہ افضل کے کچھ دوستوں نے یورپ میں سیر و سیاحت کا پروگرام بنایا۔ اس کے دوست افضل کو یورپ کے دوسرے شہر لے گئے تو وہاں طوائفوں کے ایک اڈے پر گئے۔ وہاں اس کی ملاقات عذرا سے ہوئی۔ تب عذرا نے افضل کو بتایا کہ

اس نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے یہاں اس دنیا میں قدم رکھ لیا ہے اور اب وہ یہاں سے کبھی واپس آنے والی نہیں۔ اس پر افضل نے اس کو کہا کہ اگر وہ لوٹ آئے تو اب بھی اسے اپنانے کو تیار ہے مگر اس نے افضل کی ایک بھی بات نہیں مانی۔ چار و ناچار افضل واپس اپنے ملک پاکستان آ گیا اور صغریٰ کے بیٹوں کے پاس آیا کہ شاید وہ اسے قبول کر لیں۔ لیکن اس کے بیٹوں نے افضل کو بالکل بھی پسند نہیں کیا اور کہا کہ آپ نے ہماری ماں کو چھوڑ کر دوسری شادی کر لی تھی۔ آپ یہاں سے چلے جائیں ہم آپ کو یہاں بالکل بھی دیکھنا نہیں چاہتے۔ انھوں نے اپنے باپ سے اس طرح کا سلوک کیا جیسے ان کو جانتے ہی نہیں۔ اب صغریٰ نے بھی دوسری شادی کر لی تھی اور وہ اپنے دوسرے شوہر کے ساتھ نہایت پر سکون زندگی بسر کر رہی تھی۔

۴۔ قصّہ غیرت مندوں کا، صابر حسین راجپوت-ناقابل فراموش واقعہ

حکایت کے شمارے، فروری / مارچ ۲۰۱۸ء میں صابر حسین راجپوت کا ایک ناقابل فراموش واقعہ "قصہ غیرت مندوں کا" کے عنوان سے شائع ہوا ہے جو کہ حقیقی زندگی کے بہت قریب ہے۔ اس واقعہ کو نہایت توجہ سے بیان کیا گیا ہے۔ اس میں ایک نوجوان کی کہانی بیان کی گئی ہے جو کہ شکار کا شوقین ہے اور سوہاوہ کے قریب جہلم میں ایک جنگل میں اپنے شکاری کتوں کے ساتھ شکار کھیلنے جاتا ہے۔ اس کے شکاری کتے جنگل میں دو بھیڑیوں پر حملہ آور ہوتے ہیں تو اس کی توجہ اس طرف مبذول ہوتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ وہاں خلیل نامی ایک شخص کنواں کے اندر گرا ہوا ہے اور اس نے ایک چھڑی کے آگے کچھ کانٹے دار جھاڑیاں لگا رکھی ہیں۔ وہ بھیڑیوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس کو باہر نکالا اور اپنے ساتھ گھر لے گئے خلیل کے ساتھ اس کی دوستی ہو گئی۔ خلیل نے اپنے گاؤں کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے بتایا کہ اس کے گاؤں کے قریب ایک اور گاؤں تھا وہاں سکینہ نامی ایک لڑکی رہتی تھی اس نے گھر سے بھاگ کر دوسرے گاؤں کے چودھری کے بیٹے قیوم کے ساتھ شادی کر لی تھی اور وہ ہر طرح سے عیش و آرام کی زندگی بسر کر رہے لیکن سکینہ کے والد نے اپنی بیٹی کو واپس لانے لیے بہت کوشش کی مگر جب بیٹی نے یہ بیان دے دیا کہ وہ بالغ ہے اور اپنی مرضی سے اس نے قیوم کے ساتھ شادی کی ہے۔ اس طرح سکینہ کا والد اس کو واپس لانے میں ناکام ہو گیا۔ اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے صابر حسین راجپوت نے لکھا ہے:

> "لڑکی گاؤں سے نکل کر آئے اور اپنی مرضی کی شادی کر لے تو وہ گاؤں والوں کے لیے ایک عجوبہ اور تماشہ بن جاتی ہے۔ سکینہ کے گھر بھی عورتیں آتی جاتی رہتیں۔ کوئی اسے

رشک کی نگاہ سے دیکھتی کہ یہ لڑکی کتنی خوش قسمت ہے، کوئی اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتی کہ یہ لڑکی کتنی بے غیرت ہے۔ لیکن سکینہ کو کسی کی پرواہ نہیں تھی۔ اسے اپنی پسند کا خاوند مل گیا تھا جو اپنی دنیا کا بادشاہ تھا"۔ (۵۰)

اس طرح دن گزرتے گئے سکینہ کے ہاں ایک بیٹی بھی پیدا ہوئی۔ مگر قیوم سکینہ کو ہمیشہ شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اپنی بیٹی کو اپنے ساتھ سلاتا تھا تاکہ سکینہ کا سایہ اُس بیٹی پر نہ پڑے اور یہ بھی کسی کے ساتھ بھاگ نہ جائے۔ حالات بدلتے گئے تین سال گزر گئے تو ایک رات گاؤں میں ایک اور عجیب و غریب واقعہ پیش آیا کہ قیوم کے رشتہ داروں کی قریبی عورت جس کا نام شیداں تھا پہلے اس کی شادی ہوئی تھی اور اس کا شوہر فوت ہو گیا تھا۔ شیداں کے قریبی گاؤں کے چودھری کے بیٹے اسلم کے ساتھ تعلقات قائم ہو گے۔ وہ اسلم کے ساتھ حیلے بہانوں سے رات کے وقت ملتی رہتی تھی اور اس کے ساتھ بھاگ جانا چاہتی تھی۔ اس کا علم سکینہ کو ہو گیا۔ شیداں جس رات چودھری اسلم سے ملنے گئی تو سکینہ بھی اس کے پیچھے چلی گئی۔ جب سکینہ گھر سے جا رہی تھی تو ان کا پالتو کتا بھی اس کے ساتھ چلا گیا۔ چنانچہ اس نے اسلم کو اجنبی سمجھ کر اس پر حملہ کر دیا اور اس کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا، جس پر اسلم تو بھاگ گیا پر شیداں اس کے ساتھ نہ جا سکی۔ اس کے بعد سکینہ نے شیداں کو سمجھایا کہ وہ بھی اسی طرح گھر سے بھاگ کر آئی تھی لیکن اب وہ اس قدر ذلیل ہو رہی ہے کہ گاؤں میں بھی اس کی کوئی عزت نہیں۔ اس لیے وہ یہ قدم نہ اٹھائے اور گھر سے بھاگ نہ جائے۔ اپنے والدین کی عزت کا خیال کرے۔ قیوم کو شک ہوا کہ سکینہ رات کو پتہ نہیں کس سے ملنے گئی تھی۔ اس پر قیوم کے رشتہ داروں نے سکینہ اور قیوم کو بلایا اور سکینہ نے ان کے سامنے یہ کہانی بیان کی تو انھوں نے کہا کہ سکینہ نے یہ اقدام بہت اچھا کیا ہے۔ اس طرح سکینہ کی گھر میں بہت زیادہ عزت ہونے لگی مگر شیداں کی کڑی نگرانی ہونے لگی۔ شیداں کی عمر اب بہت زیادہ ہو چکی تھی اور وہ اپنی تنہائی سے بہت زیادہ تنگ آ چکی تھی لہذا وہ گاؤں کے قریب ایک شاہ جی کی درگاہ پر جا کر بیٹھ گئی اور وہاں کے پیر صاحب کے ساتھ اس نے اپنے تعلقات قائم کر لیے اس طرح گاؤں والے سمجھنے لگے کہ شیداں بہت سی کرامات کی مالک ہو گئی ہے اور جس کو دم کر دیتی ہے اسے شفا مل جاتی ہے۔ جس کا احوال ناقابل فراموش واقعہ میں یوں بیان کیا گیا ہے:

"گاؤں کے سیدھے سادے لوگ جھوم جھوم کر عقیدت سے کہتے تھے کہ شیداں شاہ صاحب کے سائے میں رہ رہ کر پوری طرح درویش ہو گئی ہے اور شاہ صاحب اس پر اتنے مہربان ہیں کہ اپنی کرامات کا کچھ حصہ اسے دے دیا۔ وہ کہتے تھے کہ

اب عورتیں اپنی مرادیں شیداں کے پاس لے کر جاتی ہیں۔ خدا نے اس کی پھونک
میں ایسا اثر ڈالا ہے کہ ادھ موا مریض اٹھ کر چلنے لگتا ہے"۔ (۵۱)

چنانچہ خلیل نے جب یہ کہانی ختم کی تو مجھے اس کے لہجے میں شیداں کے لیے عقیدت کا رنگ محسوس ہوا۔ میں نے اس سے کچھ نہ کہا لیکن شاہ صاحب شیداں کو جو کرامات بخش رہے تھے وہ میری سمجھ میں آ گیا۔ مجھے ان لوگوں کی سادگی پر رونا آ رہا تھا۔ شیداں نے ایک نوجوان شاہ صاحب کی صورت میں بیوگی کاٹنے کا مسئلہ حاصل کر لیا تھا۔ پھر اس کے والدین فخر سے کہتے ہوں گے کہ ہم غیرت والے لوگ ہیں اور غیرت والے لوگوں کی بیٹیاں دوسرا خاوند نہیں کیا کرتیں۔

دیگر تحریروں کا تقابلی مطالعہ:

اردو ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی آپ بیتیاں ہمارے معاشرے کی ہی کہانیاں ہیں۔ ایسی کہانیاں جن سے کوئی نہ کوئی سبق حاصل ہوتا ہے مثال کے طور پر جو لائبریرین کی آپ بیتی ہے اس میں پتا چلتا ہے کہ دوسروں کی تصحیح کروانا غلط بات نہیں ہے۔ اس سے انسان کا بڑا پن ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور آپ بیتی ہے جس میں لوگ بغیر کچھ جانے دوسروں کی تقلید کرتے کرتے اپنا آپ تباہ کر لیتے ہیں۔ سبق آموز اور معاشرتی آپ بیتیاں ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں کچھ ایسی آپ بیتیاں بھی شائع کی گئی ہیں جن میں مزاح کا رنگ نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر کھڑکی پر صرف ایک مرد اور ایک عورت موجود تھی اور بینک افسر کہتا ہے کہ لائن میں آؤ تو عورت کہتی ہے۔

"میں کیسے لائن لگاؤں کوئی دوسرا ہے ہی نہیں"

ایک فرد سے لائن کیسے بن سکتی ہے اس کی اس بات سے مزاح کا رنگ پیدا ہو گیا۔ کچھ آپ بیتیاں بچپن کے دور کی ہیں جس میں ماضی کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اسی طرح زندگی کیسے کیسے امتحان سے گزارتی ہے اور اس امتحان سے گزرنے کے لیے کتنی زیادہ آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اردو ڈائجسٹ نے ایسے کئی موضوعات پر آپ بیتیاں شائع کی ہیں۔

حکایت کے شماروں میں بھی آپ بیتیاں شامل ہیں جن میں انہوں نے تقسیم ہند اور پیار کی کہانی جیسی آپ بیتی کو شامل کیا ہے اور اس میں بتایا گیا ہے کہ انسان جیسا سوچتا ہے ویسا کبھی نہیں ہوتا اور ایک وقت ایسا آتا ہے جب پچھتاوے کے علاوہ کچھ ہاتھ میں نہیں آتا۔ حکایت کے موضوعات اردو ڈائجسٹ میں شائع ہونے

والی آپ بیتیوں سے مختلف ہیں خواہشات اتنی زیادہ بڑھ جاتی ہیں کہ اس کو پورا کرنے کے لیے انسان کسی بھی حد تک جاسکتا ہے اور ان خواہشات کے چکر میں پوری زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔

۲۰۱۷ء سے ۲۰۱۹ء کے شماروں میں سیارہ ڈائجسٹ میں کوئی آپ بیتی شامل نہیں کی گئی۔

اردو ڈائجسٹ میں شاعری کا الگ گوشہ دیا گیا ہے۔

اردو ڈائجسٹ کے شماروں میں اردو ادب سے تعلق رکھنے والے مایہ ناز نامور اور کلاسک شاعروں کے کلام کو انتخاب کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ان میں مومن خان، جون ایلیا، مومن، مرزا اسد اللہ خان غالب، خواجہ میر درد کا کلام شامل ہے۔ ان کے علاوہ عصر حاضر کے شعراء جن میں احمد ندیم قاسمی، امجد اسلام امجد بھی شامل ہیں۔

حکایت کے ان شماروں میں زیادہ لوگوں کی شاعری کو جگہ نہیں دی گئی۔ شماروں میں کبھی کبھار شاعری کو شائع کیا جاتا ہے۔

سیارہ میں ۲۰۱۷ کے شمارے میں انتخاب ادارہ کی طرف سے بزم شاعری کے عنوان سے شاعری شامل کی گئی ہے۔ اس شمارے میں ابراہیم ذوق، میر تقی میر، خواجہ درد، حالی، اقبال جیسے بڑے بڑے شعراء کا کلام شامل کیا گیا ہے۔

؎ فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

اردو ڈائجسٹ میں کوئی جگ بیتی شامل نہیں کی گئی۔

سیارہ ڈائجسٹ میں بھی کوئی جگ بیتی شائع نہیں ہے۔

حکایت کے شماروں میں جگ بیتیاں شامل کی گئی ہیں جن میں ایسے واقعات کا ذکر کیا گیا ہے جو ہمارے معاشرے کے لیے المیہ ہیں۔ انسان کو ساری زندگی محنت کرنے کے باوجود سکون نہیں ملتا اور آخر کار اپنی جان کی بازی ہار جاتا ہے اور ایسے ایسے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے جن کا باطن کچھ ہوتا ہے اور ظاہر کچھ۔

اردو ڈائجسٹ میں نامور شخصیات کے انٹرویو شامل کیے گئے ہیں جن کو پڑھ کر ان شخصیات کو جاننے کا موقع ملتا ہے۔ ان میں ایئر مارشل اصغر خان کا انٹرویو شامل ہے یہ انٹرویو الطاف حسین قریشی جنہوں نے اردو ڈائجسٹ کی بنیاد رکھی تھی انہوں نے لیا تھا۔ ۲۰۱۹ء کے شمارے میں ہنگری کے سفیر کا انٹرویو شامل ہے جس

سے پتا چلتا ہے کہ دوسرے ملک سے تعلق رکھنے والا ہمارے ملک کے بارے میں کیا محسوس کرتا ہے۔ بلا شبہ اردو ڈائجسٹ کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ شماروں میں ان انٹرویوز کو جگہ دی ہے۔

حکایت کے شماروں میں بھی زیادہ انٹرویو تو نہیں ملتا لیکن یہ بھی گاہے بگاہے انٹرویو کو شامل کرتے ہیں۔ ۲۰۱۹ء کے شمارے میں انہوں نے جنرل امیر عبداللہ خان نیازی کا انٹرویو شامل کیا اور بہت سے لوگ جو ان کو مشرقی پاکستان کے الگ ہونے کی وجہ بھی سمجھتے تھے۔ اس انٹرویو کو پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کی فوج اور سیاسی جماعتوں کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے۔ اس کے علاوہ حکایت میں فلمساز محمد علی کے بارے میں انجم بوٹا نے بھی اپنی یادداشت کو ایک انٹرویو کی شکل میں بیان کیا ہے۔

سیارہ میں کوئی انٹرویوز شامل نہیں ہیں۔

اردو ڈائجسٹ میں ناقابل فراموش واقعات شامل ہیں۔ جس میں وہ کون تھی ایک ایسا واقعہ ہے جس کو پڑھ کر انسانی ذہن تسلیم کرنے میں وقت لگاتا ہے۔ جاگیرداروں کو اپنے نوکروں سے بد سلوکی جیسا واقعہ بھی اردو ڈائجسٹ میں شامل ہے۔

حکایت کے شماروں میں ناقابل فراموش واقعہ ہے جس میں دوسری بیوی طوائف بن جاتی ہے اور پہلی بیوی کے بچے اپنے باپ کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ حکایت میں ناقابل فراموش واقعات میں الگ موضوعات کی وجہ سے اس کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ غلط طریقے سے ناجائز تعلقات بنانا اور پیری مریدی میں لوگوں کے اپنے جال میں پھنسانا اس واقعے کو پڑھتے ہوئے محسوس نہیں ہوتا کہ یہ واقعہ اس میں حقیقت کا رنگ بھرا ہوا ہے۔

سیارہ میں کوئی ناقابل فراموش واقعہ شامل نہیں ہے۔

ان تینوں ڈائجسٹوں میں اردو ڈائجسٹ اپنے اندر تمام خوبیاں لیے ہوئے ہیں یہی وجہ ہے کہ آج بھی اردو ڈائجسٹ اپنی ساکھ برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اردو ڈائجسٹ نے ہر طرح کے موضوعات کو اپنے اندر سمویا ہے۔ آپ بیتیاں، شاعری، انٹرویوز، ناقابل فراموش واقعات اور ان لکھاریوں کو جگہ دی ہے جو کہ ادب میں اپنی پہچان بنا رہے ہیں۔ اپنی تحریروں کی وجہ سے اردو ڈائجسٹ دوسرے ڈائجسٹوں میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ موضوعات کے اعتبار سے ضخامت کے لحاظ سے اور اس کو چلانے والے لوگ جس محنت سے اس ادبی ڈائجسٹ کا معیار برقرار رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں اپنی مثال آپ ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حکایت بھی ایک ایسا ادبی ڈائجسٹ ہے جس میں بھی ہر طرح کے موضوعات کو جگہ دی گئی ہے خواہ وہ شاعری ہے، آپ بیتی، جگ بیتی، انٹرویوز نا قابل فراموش واقعات لیکن حکایت میں اردو ڈائجسٹ کی نسبت یہ متفرق تحاریر کم تعداد میں شائع ہوئی ہیں اور ان کا معیار بھی اردو ڈائجسٹ کی نسبت الگ ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حکایت کو چلانے والے شاید اب زیادہ دلچسپی نہیں دیتے عین ممکن ہے کہ یہ شمارہ جلد بند ہو جائے۔

حکایت اور اردو ڈائجسٹ کے مقابلے میں سیارہ ڈائجسٹ کی ترجیحات کچھ اور ہیں۔ اس میں نہ تو کوئی انٹرویوز شامل ہیں نہ ہی کوئی آپ بیتی اور نہ ہی جگ بیتی اور نہ قابل فراموش واقعات اس میں موجود ہیں اور جو شاعری شامل کی گئی ہے وہ بھی شمارے میں ادارہ انتخاب کے طور پر شامل ہے۔

حوالہ جات

۱۔ م۔ص۔ایمن، چھوٹے آدمی کا بڑا پن، مشمولہ، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۷، شمارہ ۲)، لاہور، ۳۲۵-جی تھری، جوہر ٹاؤن، ستمبر ۲۰۱۷ء، ص ۸۱

۲۔ ایضاً، ص ۸۲

۳۔ ایضاً

۴۔ ایضاً

۵۔ ایضاً، ص ۸۴

۶۔ ایضاً

۷۔ ایضاً، ص ۸۲

۸۔ ایضاً، ص ۸۵

۹۔ ایضاً

۱۰۔ رفیق سجاد، میرے بچپن کے دن، مشمولہ، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۷، شمارہ ۹)، لاہور، نومبر ۲۰۱۷ء، ص ۱۱۴

۱۱۔ حمید رانا، آزادی اور گناہ، مشمولہ، ماہنامہ حکایت (جلد ۴۷، شمارہ ۱۲)، لاہور، ۲۶-پٹیالہ گراؤنڈ، لنک میکلوڈ روڈ، اگست ۲۰۱۷ء، ص ۱۳۶

۱۲۔ عارفہ الخلیل، خواہشوں کا جہنم، مشمولہ، ماہنامہ حکایت (جلد ۴۸، شمارہ ۱۱)، لاہور، جولائی ۲۰۱۹ء، ص ۱۵۴

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۵۷

۱۴۔ طارق محمود، زندگی اِک امتحان، مشمولہ، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۸، شمارہ ۸)، لاہور، جولائی ۲۰۱۹ء، ص ۱۵۰

۱۵۔ ایضاً، اردو ڈائجسٹ، جولائی ۲۰۱۹ء، ص ۱۵۱

۱۶۔ ایضاً، اردو ڈائجسٹ، جولائی ۲۰۱۹ء، ص ۱۵۲

۱۷۔ عافیہ جہانگیر، شعر و سخن، مشمولہ، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۸، شمارہ ۱)، لاہور، جنوری ۲۰۱۹ء، ص ۱۸۸

۱۸۔ عافیہ جہانگیر، شعر و سخن، مشمولہ، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۸، شمارہ ۹)، لاہور، اگست ۲۰۱۹ء، ص ۱۸۸

۱۹۔ محمد سعید، غزل، مشمولہ، ماہنامہ حکایت (جلد ۴۷، شمارہ ۱۲)، لاہور، اگست ۲۰۱۷ء، ص ۶۵

۲۰۔ عاصم وہرہ، غزل، ایضاً، ص ۱۹۲

۲۱۔ میر تقی میر، انتخاب ادارہ، مشمولہ، سیارہ ڈائجسٹ (جلد ۴، شمارہ ۱)، لاہور، اللہ والا پرنٹرز، ریواز گارڈن جنوری ۲۰۱۷ء، ص ۱۸۶

۲۲۔ اسد اللہ خان غالب، مرزا، ایضاً، ص ۱۸۷

۲۳۔ محمد شفیق اعوان، بزم شاعری، مشمولہ، سیارہ ڈائجسٹ (جلد ۵۵، شمارہ ۷)، لاہور، جولائی ۲۰۱۸ء، ص ۱۷۸

۲۴۔ ارشد ملک، بزم شاعری، ایضاً، ص ۱۸۰

۲۵۔ داؤد گل، بزم شاعری، مشمولہ، سیارہ ڈائجسٹ (جلد ۵۵، شمارہ ۸)، لاہور، اگست ۲۰۱۸ء، ص ۱۸۸

۲۶۔ حیدر علی آتش، خواجہ، بزم شاعری، ایضاً، ص ۱۹۰

۲۷۔ محمد رضوان قیوم، کڑوا سچ، مشمولہ، ماہنامہ حکایت (جلد ۴۸، شمارہ ۱۰)، لاہور، ۲۶- پٹیالہ گراؤنڈ، لنک میکلوڈ روڈ، جون ۲۰۱۸ء، ص ۸۷

۲۸۔ سیدہ شاہدہ شاہ، ضرورت رشتہ، مشمولہ، ماہنامہ حکایت (جلد ۴۹، شمارہ ۱)، لاہور، ستمبر ۲۰۱۸ء، ص ۱۱۵

۲۹۔ سیدہ شاہدہ شاہ، ضرورت رشتہ، مشمولہ، ماہنامہ حکایت (جلد ۴۹، شمارہ ۳)، لاہور، دسمبر ۲۰۱۸ء، ص ۱۱۶

۳۰۔ ایضاً، ص ۱۱۹

۳۱۔ ایضاً، ص ۱۲۱

۳۲۔ عارف محمود، پس پردہ، مشمولہ، ماہنامہ حکایت (جلد ۴۹، شمارہ ۵)، لاہور، ۲۶- پٹیالہ گراؤنڈ، لنک میکلوڈ روڈ،، جنوری ۲۰۱۹ء، ص ۹۹

۳۳۔ ایضاً، ص ۱۰۶

۳۴۔ ایضاً، ص ۱۱۲

۳۵۔ ایضاً، ص ۱۱۴

۳۶۔ الطاف حسین قریشی، انٹرویو، ائیر مارشل اصغر خان، مشمولہ، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۸، شمارہ ۲)، لاہور، ۳۲۵-جی تھری، جوہر ٹاؤن، فروری ۲۰۱۸ء، ص ۳۶

۳۷۔ ایضاً، ص ۳۸

۳۸۔ ایضاً، ص ۳۹

۳۹۔ اعجاز قریشی، انٹرویو، استوان سابو، مشمولہ، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۸، شمارہ ۱۲)، لاہور، ۳۲۵-جی تھری، جوہر ٹاؤن، دسمبر ۲۰۱۹ء، ص ۲۳

۴۰۔ ایضاً، ص ۲۷

۴۱۔ امیر عبداللہ خان نیازی، لیفٹننٹ ریٹائرڈ جنرل، مشمولہ، ماہنامہ حکایت (جلد ۵۰، شمارہ ۴)، لاہور، ۲۶- پٹیالہ گراؤنڈ، لنک میکلوڈ روڈ، شمارہ دسمبر ۲۰۱۹ء، ص ۱۹۲

۴۲۔ محمد بوٹا انجم، انٹرویو، محمد علی اداکار، مشمولہ، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۸، شمارہ ۱۱)، لاہور، ۳۲۵- جی تھری، جوہر ٹاؤن، نومبر ۲۰۱۹ء، ص ۱۶۵

۴۳۔ ایضاً، ص ۱۶۶

۴۴۔ دانیہ صدیقی، وہ کون تھی، مشمولہ، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۷، شمارہ ۲)، لاہور، فروری ۲۰۱۷ء، ص ۱۷۲

۴۵۔ ایضاً، ص ۱۷۳

۴۶۔ اسامہ منور، چودھری آفاق، مشمولہ، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۷، شمارہ ۸)، لاہور، ۳۲۵- جی تھری، جوہر ٹاؤن، اگست ۲۰۱۷ء، ص ۱۷

۴۷۔ ایضاً، ص ۴۷

۴۸۔ سعید الدین، وہ طوائف بن گئی، مشمولہ، ماہنامہ حکایت (جلد ۴، شمارہ ۷)، لاہور، ۲۶- پٹیالہ گراؤنڈ، لنک میکلوڈ روڈ، جولائی ۲۰۱۷ء، ص ۵۵

۴۹۔ ایضاً، ص ۵۷

۵۰۔ صابر حسین راجپوت، قصّہ غیرت مندوں کا، مشمولہ، ماہنامہ حکایت (جلد ۴۸، شمارہ ۶-۷)، لاہور، ۲۶- پٹیالہ گراؤنڈ، لنک میکلوڈ روڈ، فروری، مارچ، ۲۰۱۸ء، ص ۸۸

۵۱۔ ایضاً، ص ۹۰

باب پنجم:

الف: مجموعی جائزہ

ماہنامہ اردو ڈائجسٹ، حکایت اور سیارہ ڈائجسٹ ان تینوں ڈائجسٹوں نے اپنے موضوعات اور اسلوب کی بدولت مقبولیت حاصل کی ہے۔ ان ڈائجسٹوں نے ادبی تحریریں شائع کر کے اپنا نام بنایا اور بلاشبہ اس میں کامیاب بھی رہے۔ میں نے اس مقالے میں ان تینوں ڈائجسٹوں کا تقابل کر کے ان میں شامل تحریروں میں ادبِ عالیہ، مقبول عام افسانوی ادب اور پلپ فکشن کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے اور اس بات کو بھی مد نظر رکھا ہے کہ ان ڈائجسٹوں میں شامل تمام اصناف کا احاطہ کیا جائے اور کوئی بھی تحریر صرفِ نظر نہ ہو پائے۔ اس مقالے کو مختلف ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے جس میں ادب عالیہ، مقبول عام افسانوی ادب اور پلپ فکشن کے بارے میں تفصیلاً بتایا گیا ہے۔ ادب کیا ہے؟ اور کن تحریروں کو ادب عالیہ کا درجہ دیا جا سکتا ہے؟ مقبولِ عام افسانوی ادب کو مقبول عام افسانوی ادب کیوں کہا جاتا ہے۔ لوگوں میں اس ادب کو کیوں پسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پلپ فکشن جو ہمارے ہاں ایک نئی اصطلاح سامنے آئی ہے۔ یہ ادب ہمارے ہاں بھی لکھا جا رہا ہے یا نہیں۔ اس کے بارے میں بھی تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔ ان تینوں ڈائجسٹوں نے اردو ادب کے حوالے سے اپنی پہچان بنائی۔ یہ اردو ڈائجسٹ ادبی لحاظ سے اپنی مثال آپ ہیں اور اردو ادب کا شاہکار ہیں جنہوں نے اپنے اندر ہر طرح کی معلومات کو سمیٹنے کی طاقت رکھی ہے۔ ادب عربی زبان کا لفظ ہے اور ادب زندگی کے تمام پہلوؤں کی رہنمائی کرتا ہے کیونکہ اس کے اظہار اس کی تخلیق سے انسان سکون محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ مطمئن رہتا ہے۔ اسی لیے ادیب کو معاشرے کا نمائندہ کہا جاتا ہے۔ ادب زندگی کے وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ زندگی کی پر کٹھن راہیں اور نشیب و فراز ادب کے ذریعے ہی پار کیے جا سکتے ہیں۔ اگر ادب نہ ہو تو انسان اپنی زندگی میں بیزاری محسوس کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ادب کسی بھی معاشرے کی پہچان ہے۔ وہ اس معاشرے میں منفی اور مثبت قدروں کے پروان چڑھنے میں عام طور پر ادب کو ذمہ دار قرار دیا جا سکتا ہے جتنا بھی کسی معاشرے کا ادب بہتر ہو گا۔ اتنی ہی معاشرے میں مثبت قدریں پروان چڑھیں گی۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ ادب اور ادیب کا معاشرے کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مقبول عام ادب کی روایت کوئی نیا اور جدید رجحان نہیں ہے بلکہ یہ کسی نہ کسی صورت میں اس سے پہلے بھی موجود رہا

ہے۔ مقبول عام ادب کی اصطلاح وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ اردو ادب میں اس کے نقش ادب عالیہ میں تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ ادب چونکہ انسان کے باطن کا عکس ہے۔ ادب کو پڑھنا اس لیے بھی ضروری ہو گیا ہے کہ ادب خود بھی پڑھتا ہے اور پھر نہایت گہرائی دلجمی اور بصیرت سے داخلی پہلوں کے اندر موجود دلائل کو باہر لاتا ہے۔

مقبول عام افسانوی ادب اردو الفاظ مقبول عام اور فکشن کا مجموعہ ہے۔ اس کے معنی ہیں ایسی بات یا ایسا عمل جو عام لوگوں کے لیے کیا جائے۔ ان لوگوں میں مقبولیت کا درجہ رکھتا ہو اور کوئی بھی ایسی بات جو عام لوگ کریں اور اس کی پہنچ عام آدمی تک ہو اور عام لوگ اسے قبول کریں۔ یہ مقبول عام افسانوی ادب کہلائے گا۔

ان تینوں ڈائجسٹوں میں ادب عالیہ مقبول عام افسانوی ادب اور پلپ فکشن کو بطور خاص اہمیت حاصل ہے۔ ادب عالیہ کوئی چیز نہیں ہوتا۔ اس کی سادہ ترین یہ تعریف ہے کہ جو ادب خود ادیب ایک دوسرے کو پڑھانے ستانے اور جلانے کے لیے پیدا کریں۔ وہ ادب عالیہ کہلائے گا اور کسی بھی زبان کے اعلیٰ ترین اور معیاری ادبی سرمایہ ادب عالیہ ادب عالمی اور کلاسیکل ادب بھی کہا جاسکتا ہے۔

پلپ فکشن مغرب سے آیا ہوا فکشن ہے جو اپنے اندر بہت وسیع تناظر اور الگ پس منظر رکھتا ہے۔ اُنیسویں صدی میں یورپ اور امریکہ میں صرف عورتوں کے رومانوی ناول ہی شامل نہیں تھے بلکہ اس میں جو کچھ بھی لکھا گیا۔ وہ مردوں نے لکھا اور پلپ فکشن کے حوالے سے ایک کالم بھی بنا ہوا تھا۔ یہ ادب ایک مکالمے کے طور پر اس ادب کے ساتھ بالکل جڑا ہوا ہے جسے ہم ادب عالیہ کا نام دیتے ہیں۔

بیسویں صدی کے آغاز میں ادبی رسائل نے جذبے اور ولولے سے اپنا حصہ ڈالا اور قیام پاکستان کے بعد ادبی رسائل میں اضافہ ہو گیا اور کچھ نئے رسائل بھی سامنے آئے اور ایک نئے رخ سے معاشرے کی تعمیر شروع ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ برصغیر میں ایسے ادبی رسالے موجود تھے جن کی ماہنامہ اشاعت پچاس ساٹھ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ ادب کی مقبولیت اور غیر مقبولیت کے درمیانی عرصے میں ابن صفی ایسے ادیب نظر آتے ہیں جنہوں نے بہت سے قارئین کا حلقہ بنایا اور نئی نسل نے ان کے جاسوسی ناولوں کو ذوق و شوق سے پڑھا۔

ڈائجسٹوں کے لوگ اس بات کو بھی برا مان جاتے ہیں کہ ڈائجسٹوں میں شائع ہونے والی کہانیوں کو "ادب" تسلیم نہیں کیا جاتا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ "اکثر تحریریں" ادب نہیں بھی ہوتی اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ادب زندگی کے تنّوع سے پیدا ہوتا ہے اور ڈائجسٹوں کی تحریریں تنے کی زندگی کے تصور سے پیدا ہوتی ہیں۔

ڈائجسٹوں کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ڈائجسٹ کبھی بھی ادب کے حقیقی قارئین میں مقبول نہیں رہے۔ ان کے قارئین کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل رہی ہے جو یا تو ادب کا ذوق ہی نہیں رکھتے یا جن کا ادب سے صرف برائے نام تعلق ہے لیکن ڈائجسٹوں کا یہ بھی سچ ہے کہ ڈائجسٹ کو قاری کبھی بھی ڈائجسٹ کی فضا سے باہر نہیں نکل پاتا یہی وجہ ہے کہ قارئین کے رد عمل کو ڈائجسٹوں نے بہت اہمیت دی۔ ان ڈائجسٹوں کے مثبت پہلو بھی نظر آتے ہیں۔ انہوں نے ایسے لاکھوں پڑھنے والے لوگ پیدا کیے جو پہلے کبھی نہیں پڑھتے تھے، اصل میں ڈائجسٹوں کا مطلب ہی قارئین میں یہ ایسا پیدا کرنا ہوتا ہے کہ ڈائجسٹ مطالعے کا آغاز ہے۔ اس مطالعے کے آغاز کے بعد ہی قاری ادب کی طرف مائل ہو گا تو ہی وہ معاشرے میں علم و ادب اور فہم و آگہی کے فروغ میں غیر معمولی کردار ادا کر سکتے ہیں۔ ان ڈائجسٹوں کا مطالعہ کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ ان کا یہ بھی کارنامہ ہے کہ انہوں نے یعنی مخصوص فضا کے دائرے میں رہ کر لکھنے والوں کی تعداد میں بھی اضافہ کیا اور یہ بھی اُمید کی جا سکتی ہے کہ ڈائجسٹ میں لکھنے والے اس کی دنیا سے نکل کر اچھا ادب بھی تخلیق کریں تا کہ اس ادب کو ادب عالیہ کا درجہ دیا جائے۔

انسان کی اپنی زندگی اس قدر مصروف ہے کہ کسی کے پاس بھی وقت بہت کم ہوتا ہے اور اس اور اس کم وقت میں بہت سی چیزوں کے بارے میں معلومات حاصل کر کے اپنے علم اضافہ کرنا چاہتا ہے یہی وجہ ہے کہ مغرب میں ڈائجسٹ کے فروغ کے ارتقا میں یہی حقیقت کار فرما تھی اور تمام علوم و فنون کا بیک وقت مطالعہ کرنا انسان کے لیے بہت مشکل تھا۔ اس لیے اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی مناسب حل نکالا گیا تا کہ کم وقت میں انسانی علم میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہو سکے چونکہ ڈائجسٹ سے مراد بہت سے جرائد میں شامل کلاسک تحریروں کو اکٹھا کر کے ایک جریدے کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے تا کہ اس سے وقت کی بچت ہو سکے اور زیادہ سے زیادہ معلومات بھی قارئین تک پہنچ سکیں۔ مغرب میں ڈائجسٹ رسائل کے فروغ میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ آج کا انسان دنیاوی معلومات سائنس ایجادات اور حالات حاضرہ سے مستفید ہونا چاہتا تھا۔ ان سب کے بارے

میں جاننا اس کی دسترس میں نہیں تھا۔ مغرب میں ڈائجسٹ انگریزی ڈائجسٹ ریڈرز اس کی اہم اور زندہ مثال ہے۔ پاکستان بننے کے بعد پاکستان میں بھی بہت سارے ڈائجسٹ جو منظر عام پر آئے پاکستان بننے کے بعد پہلا ڈائجسٹ مولانا حسرت موہانی کے بھائی متین موہانی نے شروع کیا اور اس کے تقریباً ۱۰ سال بعد دوسرا ڈائجسٹ ۱۹۵۷ میں جاری ہوا جس کا الطاف حسین قریشی نے اردو ڈائجسٹ کے نام سے اس کا اجرا کیا۔ یہ ڈائجسٹ میرے مقالے کا حصہ بھی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ عنایت اللہ خان کا ایک اور رسالہ سیارہ ڈائجسٹ یہ بھی منظر عام پر آیا اور ان دونوں ڈائجسٹوں کا یہ مشن تھا کہ سبھی مکتبہ ہائے فکر کے خیالات کو مربوط صورت میں لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ ان ڈائجسٹوں کے ساتھ ساتھ دوسرے اور کئی ڈائجسٹ منظر عام پر آئے جن میں حکایت جو کہ ادبی ڈائجسٹ کے لحاظ سے پاکستان میں اپنی پہچان آپ ہے۔ یہ تینوں ڈائجسٹ، اردو ڈائجسٹ، سیارہ ڈائجسٹ اور حکایت ڈائجسٹ چونکہ میرے مقالے کا اہم ترین حصہ ہیں۔ اُردو ڈائجسٹ نے بلا شعبہ اپنی محنت اور کاوش سے اپنے اپنے شماروں میں ایسا دلچسپ مواد شامل کیا جس کو قارئین نے پسند کیا اور یہی وجہ ہے کہ آج اردو ڈائجسٹ کا شمار اردو کے بہترین ادبی ڈائجسٹوں میں ہوتا ہے۔ اسی طرح حکایت کے بانی عنایت اللہ خان نے اپنی دلچسپ تحریروں اور نامور ادیبوں کا مواد شامل کیا جس نے قارئین کو اپنی طرف متوجہ کیا اور اس کا شمار بھی نامور ڈائجسٹوں میں ہونے لگا یہ کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں ڈائجسٹوں کا مستقبل روشن ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سیارہ ڈائجسٹ نے بھی اپنے مشن کا آغاز نامور ادیبوں کی تحریروں سے کیا اور ان کے مثبت افکار کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے مختلف ادبی مذاکروں اور سیمیناروں کا بھی اہتمام کیا تا کہ معاشرے میں پیدا ہونے والی منفی قدروں کی حوصلہ شکنی کرتے ہوئے مثبت سوچ کو اُجاگر کیا جا سکے۔

اردو ڈائجسٹ، حکایت اور سیارہ ڈائجسٹ میں جو افسانے اور ناول چھپے ہیں۔ وہ میرے مقالے کا حصہ ہیں اور ان کا فکری اور فنی رجحان کے حوالے سے تقابل کیا گیا ہے۔ ان میں جو بھی کہانیاں شائع کی گئی ہیں۔ وہ زیادہ تر ادب عالیہ سے تعلق رکھنے والے نامور ادیبوں کی ہیں۔ ان ڈائجسٹوں نے نہ صرف بڑے بڑے نامور ادیبوں کو بلکہ نئے لکھنے والوں کو بھی اپنی ڈائجسٹوں کا حصہ بنایا اور نئے لکھنے والوں کو جگہ دی بڑے بڑے نامور ادیبوں جن میں احمد ندیم قاسمی، اشفاق احمد، خواجہ حسن نظامی، حجاب امتیاز علی تاج، رضیہ بٹ، کرشن چندر، فرخندہ لودھی، بلونت سنگھ، نیلم احمد بشیر، خدیجہ مستور شامل ہیں۔ بلا شبہ یہ سب بڑے اہم نام ہیں۔ ان ڈائجسٹوں نے ان بڑے ادیبوں کی تحاریر کو شامل کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان ڈائجسٹوں کو کس وجہ سے

ادبی ڈائجسٹ کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان تینوں ڈائجسٹوں میں ناولوں کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان ڈائجسٹوں میں اتنی جگہ نہیں ہوتی کہ وہ پورے ناول کو اس میں شامل کریں لیکن قسط بہ قسط ناولوں کو شائع کرنے کا ان کا فیصلہ خوش آئند ہے۔ ان ڈائجسٹوں میں افسانے ناولوں کے علاوہ دوسری دیگر اصناف کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ جو میرے مقالے کا حصہ ہیں جس میں آپ بیتی، جگ بیتی، ناقابلِ فراموش واقعات شاعری اور مشہور شخصیات کے انٹرویوز شامل ہیں۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ بلا شبہ ادب کے فروغ اور کسی بھی معاشرے کی تعمیر و ترقی اور اصلاح کے لیے رسائل اور ڈائجسٹوں کا کردار بنیادی نوعیت کا حامل ہے اور زیرِ نظر مقالے میں رسائل کی اہمیت و ضرورت ڈائجسٹ اور اس کے فروغ میں ان کے کردار کے حوالے سے خاص طور پر یہ کوشش کی گئی ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں ڈائجسٹوں کی اہمیت اور فروغِ ادب میں ان کے کردار کے حوالے سے خاص طور پر اردو ڈائجسٹ، حکایت اور سیارہ ڈائجسٹ کا مطالعہ کر کے یہ کوشش کی گئی ہے کہ ان ڈائجسٹوں میں شامل تحریروں کا مطالعہ کر کے ان کے فن و فکر کی حوالے سے تقابل پیش کیا جائے اور باقی متفرق تحریروں کا بھی جائزہ لے کر ان کا تقابل کیا جائے۔

مجھے یقین ہے۔ یہ مقالہ آنے والے طالب علموں میں ڈائجسٹوں کے مطالعہ کرنے اور تحقیق کرنے کا جذبہ اُبھارے گا۔ ان ڈائجسٹوں کا تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان ڈائجسٹوں میں کس طرح کی تحریریں شامل کی جاتی ہیں جو اپنی مثال آپ ہیں اس حوالے سے جب بھی کوئی تحقیقی کام کیا جائے گا تو ان ادبی ڈائجسٹوں کو یقیناً نمایاں جگہ حاصل ہو گی۔

ب: نتائج

ڈائجسٹ کا مطلب ہی یہی ہے کہ بہت سی تحریروں کو جمع کر کے ایک میں شامل کیا جائے جس سے وقت کی بچت بھی ہو جاتی ہے اور زیادہ سے زیادہ معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں۔ ادبی ڈائجسٹوں میں ادب سے تعلق رکھنے والی تحریروں کو شامل کیا جاتا ہے۔ ان ڈائجسٹوں میں شامل تحریروں کا مطالعہ کر کے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ تینوں ڈائجسٹ ماہنامہ اردو ڈائجسٹ، حکایت اور سیارہ کی اہمیت صرف ایک ماہ کے لیے مسلم ہوتی ہے کیونکہ جب اگلے مہینے کا شمارہ منظر عام پر آتا ہے تو پہلے شمارے کی اہمیت قدر کم ہو جاتی

ہے اور قارئین کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ تازہ شمارے کا مطالعہ کر کے اس سے لطف اندوز ہوں تا کہ ان کو حالات حاضرہ میں ہونے والی باتوں اور خبروں کا علم ہو سکے۔ ان ڈائجسٹوں کے شماروں میں شامل تحریریں ادب سے تعلق رکھنے والے نامور ادیبوں کی ہیں جن کو پڑھ کر انسان کی سوچ کی عکاسی ہوتی ہے کہ ایسے ادیب اور مصنف بھی ہیں جو کہ اردو ادب میں اپنا نام بنا رہے ہیں اور یہی ڈائجسٹ ان کو لکھنے کی جگہ فراہم کر رہے ہیں کیونکہ ان ڈائجسٹوں کو نہ صرف ادب سے تعلق رکھنے والے لوگ پڑھتے ہیں بلکہ جن کا ادب سے کوئی واسطہ نہیں وہ بھی ڈائجسٹوں کو شوق سے پڑھتے ہیں کیونکہ ان میں ہمہ وقت شاعری، افسانے، ناقابل فراموش واقعات اور سنسنی خیز کہانیاں بھی شامل ہوتی ہیں۔

ان ڈائجسٹوں نے اپنی اہمیت برقرار رکھنے کے لیے بہت سے ایسے ادیبوں کی تحریروں کو بھی جگہ دی ہے جن کا اردو ادب میں نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ تحریر اس حوالے سے ہیں جس وجہ سے ان ڈائجسٹوں کو ادبی ڈائجسٹ کا نام دیا گیا ہے۔

ان ڈائجسٹوں پر تحقیق کرنے کے بعد یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ تمام شمار ایک نئے عہد میں داخل ہو گئے ہیں کیونکہ ان کے خاص موضوعات کو یکجا کر کے قارئین کے سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

- اس مقالے میں جو اصنافِ ادب شامل کی گئی ہیں جن میں افسانہ، ناول، آپ بیتی، شاعری، جگ بیتی، انٹرویوز، ناقابلِ فراموش واقعات شامل ہیں۔ ان اصناف کو ایک جامع صورت میں تعریفوں کے ذریعے ایک جگہ جمع کیا گیا ہے۔ ان اہم اصناف سے قارئین متعارف ہوں گے نہ صرف متعارف ہوں گے بلکہ ان پر کیے گئے کام سے ان کو اندازہ ہو سکے گا کہ ادب میں ان اصناف کی قاری کی نظر میں کیا اہمیت ہے۔ اور یہ اصناف عوام میں کس قدر مقبول ہیں اور انہیں کتنا پسند کیا جا رہا ہے۔ کسی کام کی اہمیت کا اندازہ اس وقت تک نہیں لگایا جا سکتا جب تک کہ وہ مکمل ہو کر عوام کے سامنے نہ لایا جائے۔ ڈائجسٹوں میں دلچسپی لینے والے قارئین کے لیے یہ ایک اہم کام ثابت ہو گا اور انہیں محسوس ہو گا کہ یہ کام وقت کی اہم ضرورت ہے۔
- ادب عالیہ اعلیٰ ترین اور معیاری ادبی سرمائے کا نام ہے۔ اس میں فن کی پختگی نظر آتی ہے اور اس کے مسلسل مطالعہ کرنے سے انسانی ذہن اور انسانی شعور میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ یہ ادب کسی خاص ڈگر پر کسی مخصوص طبقے کی ترجمانی نہیں کرتا اس کو ہی کلاسیک ادب کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ یہ ادب تخلیق کرنے والے اپنے ماضی، حال اور مستقبل کا بھی سوچتے ہیں اور تحریر مستقل مزاج کی بنیاد پر

ہوتی ہے۔ اس کو پڑھنے والے لوگ اپنی داخلی طلب خوشی اور رضامندی سے پڑھتے ہیں۔ مقبول عام افسانوی ادب اس کو پڑھ کر لوگ لطف اندوز ہوتے ہیں اور محض وقت گزاری اور تفریح کے لیے اس ادب کو پڑھا جاتا ہے۔ اس کی پہنچ عام لوگوں تک ہے اور لوگ اسے پسند بھی کرتے ہیں اور قبول بھی۔ یہ لوگوں میں اس قدر مقبول ہے کہ اس کی پیروی کرتے ہیں اور اس کا معیار بھی عوام کے مطابق ہوتا ہے۔ یہ ادب عام لوگوں کی ذہنی سطح کے مطابق لکھا جاتا ہے تاکہ لوگوں کو پڑھ کر بیزاری نہ محسوس ہو۔ مقبول عام ادب ہر زمانے میں موجود رہتا ہے کیونکہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی اصطلاح بدلتی رہتی ہے۔ یہ محدود مدت تک عوام کی دلچسپی بنتا ہے پھر وقت کے ساتھ اس کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ پلپ فکشن غیر معیاری ہے یہ ادب کم قیمت والے ناول اور دلچسپ افسانوں کی شکل میں ہوتا ہے اور ان کی قیمت بھی کم ہوتی ہے اور ان میں زیادہ تر ایسے موضوعات شامل کیے جاتے ہیں جن میں رومانس، جنسی کہانیاں، پر تشدد واقعات شامل ہیں اور ایسی کہانیاں جن میں نسائی اور جذباتی پن کو ابھارا جائے۔ یہ ادب مڈل کلاس اور کام کرنے والے ایسے لوگ جو لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں ان کو سستی تفریح فراہم کرتا ہے۔ یہ اصطلاح انگریزی ادب سے ماخوذ ہے اور اس کو منفی پہلو سے دیکھا جاتا ہے۔ اس میں سماجی طور پر جنسی حوالے سے خواتین کی معصومیت کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں اس ادب کو شہرت ملی۔

- ان ڈائجسٹوں میں شائع ہونے والی تحریریں ہمارے معاشرے کی عکاسی کرتی ہیں۔ یہ تحریریں مبہم خیالات اور شکوک و شبہات جیسی سوچ سے عاری ہیں اور ان تحاریر میں پختگی نظر آتی ہے اور تحریریں مدلل، موثر اور واضح انداز میں اپنا نقطہ نظر بیان کرتی ہیں۔ نئے خیالات اور نکات ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ نئی طرح کی معلومات میں اضافہ کے ساتھ ساتھ ان تحریروں کے ذریعے سے اصلاحی خواہش بھی پیدا ہوتی ہے۔ ان ڈائجسٹوں میں اس بات کا بھی خیال رکھا گیا ہے کہ کہانی کا شروع کہاں سے کرنا اور کہاں ختم کرنا ہے اور ایسی تحریروں کو جگہ دی کہ آسان اور ہر بندے کی سمجھ میں آنے والے الفاظ کون سے ہیں اور کہانی میں کہانی پن کتنا ہے۔ ان میں زیادہ تر سیدھی کہانیاں شامل کی گئی ہیں۔ ان ڈائجسٹوں میں معاشرتی رنگ کو لیے چھوٹے موٹے جرائم کے حوالے سے کہانیاں شائع ہوتی ہیں۔ ان کی خاص بات یہ بھی ہے کہ ان تحریروں کا مزاج عوام کے مطابق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عوامی مزاج کی کہانیاں شائع کر کے انہوں نے لوگوں میں اپنا مقام بنایا۔ ان ڈائجسٹوں

میں شامل تحریریں ہمارے ماحول اور مزاج سے نزدیک تر ہیں۔ تحریروں کو پڑھ کر عوام کو فرار کا راستہ مل جاتا ہے اور وہ رفتہ رفتہ خوابوں کی دنیا میں پناہ لینے لگتے ہیں۔

- اردو ڈائجسٹ، حکایت ڈائجسٹ اور سیارہ ڈائجسٹ میں تحریروں کا معیار کیا ہے۔ کیا یہ محض مقدار کی بات ہے؟ کیا یہاں معیار قائم کیا گیا ہے؟ اگر ان تینوں ڈائجسٹ کا بغور مطالعہ کریں اور وہ تحریریں جو مقالے کے مخصوص وقت میں شائع ہوئیں۔ ان کو دیکھیں تو یہ بات بہتر طور پر سمجھ آسکتی ہے کہ تینوں ڈائجسٹ اپنے اپنے طور پر بہتر سے بہترین ادب شائع کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں اور اس حوالے سے اردو ادب میں چھپنے والے بیسیوں رسائل اور ڈائجسٹ سے ان ڈائجسٹوں کا تحریری معیار بہت بہتر ہے اور اردو ادب کے کئی ڈائجسٹ ایسے ہیں جن میں تحریروں کو تیسرے درجے کا ادب قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ ان رسائل میں ادب عالیہ ہی شائع ہوتا ہے۔ بلاشبہ یہاں بھی جھول موجود ہے۔ کبھی بہت اعلیٰ تحریریں اور کبھی معیار کے لحاظ سے سوکیانہ تحریریں بھی نظر آتی ہیں۔ اس تمام کے باوجود ان تینوں ڈائجسٹوں میں پلپ ادب موجود نہیں ہے۔ کہیں بھی کسی بھی قسم کی فحش نگاری یا معیار سے گری ہوئی شاعری یا افسانہ اور ناول کسی بھی قسم کا تخلیقی ادب ہمیں نظر نہیں آتا۔ اگر ان تینوں ڈائجسٹوں کا معیار دیکھیں تو اردو ڈائجسٹ تینوں ڈائجسٹوں میں سرخیل کا مقام رکھتا ہے۔ اردو ڈائجسٹ کے مدیر اعلی الطاف حسن قریشی اور الطاف حسین قریشی بنیادی طور پر بہت پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ حکایت اور سیارہ ڈائجسٹوں کو شائع کرنے والے ان پڑھ لوگ ہیں یہاں اردو ڈائجسٹ میں فکری اور فنی لحاظ سے بہترین تحریریں شائع ہوتی ہیں۔ اردو ادب کے اندر بہت سی تحریروں کو ادب عالیہ میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ یہاں اگر مقبول عام ادب کی بات کی جائے تو شکاریات اور آپ بیتیاں اور اسی قبیل کا ادب مقبول عام ادب کی ذیل میں آتا ہے۔ اردو ڈائجسٹ کے بعد سیارہ ڈائجسٹ حکایت ڈائجسٹ کی بنسبت زیادہ بہتر تحریریں شائع کرتا رہا ہے یا ان کی ادبی حیثیت اعلیٰ ہے۔ اردو ڈائجسٹ کی مانند سیارہ ڈائجسٹ میں پلپ لٹریچر نایاب ہے۔ سیارہ ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی شاعری افسانے ناول بس اوقات ہی نہیں بلکہ اکثر ادب عالیہ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ سیارہ ڈائجسٹ میں اعلی معیار قائم کرنے والے ادیبوں کی تحریریں شائع ہوتی رہی ہیں۔ تاہم اردو ڈائجسٹ اور سیارہ ڈائجسٹ میں یہ فرق ضرور ہے کہ سیارہ ڈائجسٹ میں تاریخی نوعیت معاشرتی نوعیت رکھنے والا مقبول عام ادب زیادہ شائع ہوتا ہے جبکہ اردو ڈائجسٹ میں ادبی ذوق کو

زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ سیارہ ڈائجسٹ میں افسانوں اور ناولوں کی تعداد اردو ڈائجسٹ کی بنسبت کم ہے، اسی طرح سے اگر ادبی ذوق یا ادب عالیہ کی بات کریں تو اردو ڈائجسٹ میں ادب عالیہ میں شمار ہونے والا ادب سیارہ ڈائجسٹ کی بنسبت زیادہ ہے۔ سیارہ ڈائجسٹ کے بعد تیسرے نمبر پر حکایت ڈائجسٹ کو رکھا جائے گا۔ حکایت ڈائجسٹ میں بھی پلپ لٹریچر نہیں ملتا۔ بنیادی طور پر یہ تینوں ڈائجسٹ چونکہ مشرقیت پاکستانیت ملت پرستی اور آدھا پرستی کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے ان تینوں ڈائجسٹوں کے اندر ہمیں بھی پلپ لٹریچر موجود نہیں ہے۔ پلپ لٹریچر ایک ایسے معاشرے میں شائع ہو سکتا ہے جہاں فحاشی کا چلن زیادہ عام ہو جائے یا وہاں روایت پسندی مشرقیت پسندی اور مذہب پرستی سے اجتناب برتا جائے حکایت ڈائجسٹ کے اندر بھی بہت سی تحریریں ایسی مل جاتی ہیں جو ادب عالیہ میں شمار کی جا سکتی ہیں۔ تاہم جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ حکایت ڈائجسٹ کے اندر ادب عالیہ چھپتا تو ہے لیکن اس کی مقدار کم ہے اس میں معیار بھلے بلند ہو تاہم اس کی مقدار کم ہے۔ اردو ڈائجسٹ میں معیار اور مقدار زیادہ ہے۔ اس کے بعد سیارہ ڈائجسٹ کا نمبر آتا ہے اور پھر حکایت ڈائجسٹ تاہم تینوں ڈائجسٹ اپنے اپنے طور پر ادب عالیہ مقبول عام ادب کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

- اردو ڈائجسٹ سیارہ ڈائجسٹ اور حکایت ڈائجسٹ میں چھپنے والی تحریروں کا فنی و فکری جائزہ لینے سے قبل یہ بات بیان کرنا ضروری ہے کہ ان تینوں ڈائجسٹوں میں پلپ فکشن یا پلپ لٹریچر کہیں بھی موجود نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ ان ڈائجسٹوں کا معیار بہت بیسیوں رسائل اور ڈائجسٹوں سے بلند ہے تینوں ڈائجسٹوں میں چونکہ پلپ فکشن یا پلپ لٹریچر موجود نہیں ہے۔ اس لیے ادب کے اس گوشے کا فنی و فکری جائزہ نہیں لیا جا سکتا۔ ان تینوں ڈائجسٹوں میں مقبول عام ادب موجود ہے ظاہر ہے کہ ان تینوں ڈائجسٹوں کہ قارئین کی زیادہ تعداد عام عوام ہیں جو ہر کشید کرنے اور مطالعہ کا چسکا پورا کرنے کے لیے ان ڈائجسٹوں کو پڑھتے ہیں۔ ان کے قارئین میں ادیبوں اور شاعروں کی تعداد کم ہے۔ اس لیے ان تینوں رسائل میں مقبول عام ادب ادب عالیہ کی بنسبت زیادہ موجود ہے۔ شکاریات تاریخ مذہب معاشرتی حوالے سائنسی کہانیاں وغیرہ اور ان سے متعلق گوشے اکثر و بیشتر شائع کیے جاتے ہیں اور یہ تمام ادب بنیادی طور پر مقبول عام ادب میں شامل ہوتا ہے۔ تاہم ان تینوں ڈائجسٹوں میں ایک بات مشترک ہے یہاں شائع ہونے والی فکشن کا معیار بیشتر تحریروں میں بہت بلند ہے۔ ان افسانوں اور

ناولوں کو ادب عالیہ میں آسانی سے شمار کیا جا سکتا ہے۔ تاہم اردو ڈائجسٹ میں شامل ہونے والے افسانوں اور ناولوں کا ادبی معیار بیشتر اس قدر بلند ہے کہ انہیں ادب عالیہ میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ بڑے بڑے تخلیق کاروں کی تحریریں یہاں ملتی ہیں۔ اردو ڈائجسٹ میں چھپنے والے افسانوں اور ناولوں کی بڑی تعداد کو ادب عالیہ میں بآسانی شمار کیا جا سکتا ہے۔ اردو ڈائجسٹ میں چھپنے والی تحریروں بالخصوص افسانہ اور ناول کی کہانیوں کا موضوع، کہانی پن، پلاٹ، کردار نگاری، تجسس، محاکات نگاری، منظر نگاری اور اسلوب ایک ایک چیز کا جائزہ لینے سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اردو ادب میں فنی و فکری لحاظ سے بہترین کہانیاں شائع ہوتی رہی ہیں جبکہ سیارہ ڈائجسٹ اور حکایت ڈائجسٹ میں تھوڑی تعداد میں فکشن شائع کی گئی ہے۔ اگر ان دونوں ڈائجسٹوں میں شائع ہونے والی تحریروں کا جائزہ لیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ سیارہ ڈائجسٹ میں حکایت ڈائجسٹ کی بنسبت زیادہ ناول اور زیادہ کہانیاں شائع ہوئی ہیں۔ تاہم یہ بات اپنی جگہ برحق ہے کہ دونوں ڈائجسٹ اپنے طور پر ادب عالیہ شائع کرنے کی کاوش کرتے رہے ہیں۔ سیارہ ڈائجسٹ میں اردو ڈائجسٹ سے کم اور حکایت ڈائجسٹ سے زیادہ افسانے اور ناول شائع کیے گئے ہیں۔ یہاں حکایت ڈائجسٹ نے تھوڑے افسانے اور ناول شائع کیے ہیں۔ تاہم ان دونوں ڈائجسٹوں میں بڑے بڑے ادیب لکھتے رہے ہیں۔ ان کا فنی و فکری معیار بھی بلند ہے اگر فن کی فکر بات کی جائے تو اردو ڈائجسٹ سیارہ ڈائجسٹ اور حکایت ڈائجسٹ تقریباً ہم پلہ نظر آتے ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ اردو ڈائجسٹ نے سیارہ ڈائجسٹ اور سیارہ ڈائجسٹ نے حکایت ڈائجسٹ کی نسبت زیادہ اپنی کہانیوں میں فکر و فن کا ثبوت دیا ہے لیکن ان میں چھپنے والی تحریریں فن و فکر کے حوالے سے بہر حال معیاری ہیں اور فن کے لحاظ سے ان کا مقام و مرتبہ بلند ہے۔

ج: سفارشات

اس سے پہلے رسائل پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح کے تحقیقی کام کیے گئے ہیں مگر مختلف رسائل کی تحریروں کے تقابل کے حوالے سے تحقیقی کام کم ہی سامنے آیا ہے۔ ادبی رسائل پر کام کے حوالے سے چند سفارشات پیش کی جا رہی ہیں:

- یونیورسٹی کی لائبریریوں میں ان ڈائجسٹوں کی رسائی یقینی بنائی جائے تاکہ طلباء ان ڈائجسٹوں میں موجود مواد سے آشنا ہو سکیں اور اس سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی اہمیت ان پر واضح ہو سکے۔
- ڈائجسٹوں میں چھپنے والے قسط وار ناولوں کو مکمل ناول کی صورت میں بھی شائع کیا جانا چاہیے تاکہ اردو ادب کے خزانے میں اضافہ ہو اور نئے لکھنے والے ادیب بھی متعارف ہو سکیں۔
- ان ڈائجسٹوں کے اشاعتی اداروں کو ان کے فروغ کے لیے اشتہارات اور دیگر ذرائع استعمال کرنے چاہیے۔ آج کل الیکٹرانک میڈیا کا دور ہے تو اس میں بھی ہر ماہ کے ڈائجسٹ کے بارے میں اس کے اشتہارات اور سرورق دینا چاہیے تاکہ قارئین کی توجہ کا مرکز بن سکیں۔
- ان ڈائجسٹوں میں بیسویں اور اکیسویں صدی کے اہم ناولوں کو بھی قسط وار شائع کرنا چاہیے تاکہ قارئین ان تحریروں کو پڑھ سکیں اور مصنفین کو پذیرائی مل سکے۔
- ان ڈائجسٹوں میں شامل دوسری اصناف خاکہ نگاری، انشایہ نگاری، مزاح نگاری اور سفر نامہ جیسی اصناف پر بھی تحقیق ہونی چاہیئے تاکہ آنے والے طالبعلموں کے لئے رائیں ہموار ہوں۔

کتابیات

بنیادی مآخذ

ماہنامہ ''اُردو ڈائجسٹ''

اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۷، شمارہ ۲)، لاہور، ۳۲۵-جی تھری، جوہر ٹاؤن، فروری ۲۰۱۷ء

اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۷، شمارہ ۶)، لاہور، جون ۲۰۱۷ء

اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۷، شمارہ ۷)، لاہور، جولائی ۲۰۱۷ء

اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۷، شمارہ ۸)، لاہور، اگست ۲۰۱۷ء

اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۷، شمارہ ۹)، لاہور، ستمبر ۲۰۱۷ء

اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۷، شمارہ ۹)، لاہور، نومبر ۲۰۱۷ء

اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۸، شمارہ ۱)، لاہور، جنوری ۲۰۱۸ء

اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۸، شمارہ ۲)، لاہور، فروری ۲۰۱۸ء

اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۸، شمارہ ۳)، لاہور، مارچ ۲۰۱۸ء

اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۸، شمارہ ۷)، لاہور، اپریل ۲۰۱۸ء

اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۸، شمارہ ۶)، لاہور، جون ۲۰۱۸ء

اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۸، شمارہ ۲)، لاہور، جولائی ۲۰۱۸ء

اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۸، شمارہ ۸)، لاہور، اگست ۲۰۱۸ء

اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۸، شمارہ ۱)، لاہور، جنوری ۲۰۱۹ء

اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۹، شمارہ ۴)، لاہور، اپریل ۲۰۱۹ء

اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۹، شمارہ ۵)، لاہور، مئی ۲۰۱۹ء

اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۸، شمارہ ۸)، لاہور، جولائی ۲۰۱۹ء

اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۸، شمارہ ۹)، لاہور، اگست ۲۰۱۹ء

اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۸، شمارہ ۱۱)، لاہور، نومبر ۲۰۱۹ء

اردو ڈائجسٹ (جلد ۵۸، شمارہ ۱۲)، لاہور، دسمبر ۲۰۱۹ء

ماہنامہ ”حکایت ڈائجسٹ“

حکایت (جلد ۴۷، شمارہ ۱۱)، لاہور، ۲۶-پٹیالہ گراؤنڈ، لنک میکلوڈ روڈ، جولائی ۲۰۱۷ء

حکایت (جلد ۴۷، شمارہ ۱۲)، لاہور، اگست ۲۰۱۷ء

حکایت (جلد ۴۸، شمارہ ۱۰)، لاہور، دسمبر ۲۰۱۷ء

حکایت (جلد ۴۸، شمارہ ۶-۷)، لاہور، فروری، مارچ، ۲۰۱۸ء

حکایت (جلد ۴۸، شمارہ ۸)، لاہور، مئی ۲۰۱۸ء

حکایت (جلد ۴۸، شمارہ ۱۰)، لاہور، جون، ۲۰۱۸ء

حکایت (جلد ۴۹، شمارہ ۱۱)، لاہور، جولائی ۲۰۱۸ء

حکایت (جلد ۴۸، شمارہ ۱۲)، لاہور، اگست ۲۰۱۸ء

حکایت (جلد ۴۹، شمارہ ۱)، لاہور، ستمبر ۲۰۱۸ء

حکایت (جلد ۴۹، شمارہ ۳)، لاہور، دسمبر ۲۰۱۸ء

حکایت (جلد ۴۹، شمارہ ۵)، لاہور، ۲۶-پٹیالہ گراؤنڈ، لنک میکلوڈ روڈ،، جنوری ۲۰۱۹ء

حکایت (جلد ۴، شمارہ ۲)، لاہور، فروری ۲۰۱۹ء

حکایت (جلد ۴۹، شمارہ ۷)، لاہور، مارچ ۲۰۱۹ء

حکایت (جلد ۴۹، شمارہ ۸)، لاہور، اپریل ۲۰۱۹ء

حکایت، (جلد ۴۹، شمارہ ۹)، لاہور، مئی ۲۰۱۹ء

حکایت (جلد ۴۹، شمارہ ۱۰)، لاہور، جون ۲۰۱۹ء

حکایت (جلد ۴۸، شمارہ ۱۱)، لاہور، جولائی ۲۰۱۹ء

حکایت، (جلد ۴۹، شمارہ ۱۱)، لاہور، اگست ۲۰۱۹ء

حکایت، (جلد ۴۹، شمارہ ۱۲)، لاہور، ستمبر ۲۰۱۹ء

حکایت، (جلد ۴۹، شمارہ ۱)، لاہور، اکتوبر ۲۰۱۹ء

حکایت، (جلد ۴۹، شمارہ ۳)، لاہور، نومبر ۲۰۱۹ء

حکایت (جلد ۵۰، شمارہ ۴)، لاہور، دسمبر ۲۰۱۹ء

ماہنامہ ''سیارہ ڈائجسٹ''

سیارہ ڈائجسٹ (جلد ۴، شمارہ ۱)، لاہور، اللہ والا پرنٹرز، ریواز گارڈن جنوری ۲۰۱۷ء

سیارہ ڈائجسٹ (جلد ۴، شمارہ ۲)، لاہور، فروری ۲۰۱۷ء

سیارہ ڈائجسٹ (جلد ۴، شمارہ ۴)، لاہور، اپریل ۲۰۱۷ء

سیارہ ڈائجسٹ (جلد ۴، شمارہ ۵)، لاہور، مئی ۲۰۱۷ء

سیارہ ڈائجسٹ (جلد ۵۷، شمارہ ۶)، لاہور، جون ۲۰۱۷ء

سیارہ ڈائجسٹ (جلد ۴، شمارہ ۷)، لاہور، جولائی ۲۰۱۷ء

سیارہ ڈائجسٹ (جلد ۴، شمارہ ۱۱)، لاہور، نومبر ۲۰۱۷ء

سیارہ ڈائجسٹ (جلد ۵۵، شمارہ ۳)، لاہور، مارچ ۲۰۱۸ء

سیارہ ڈائجسٹ (جلد ۵۵، شمارہ ۶)، لاہور، جون ۲۰۱۸ء

سیارہ ڈائجسٹ (جلد ۵۵، شمارہ ۷)، لاہور، جولائی ۲۰۱۸ء

سیارہ ڈائجسٹ (جلد ۵۵، شمارہ ۸)، لاہور، اگست ۲۰۱۸ء

سیارہ ڈائجسٹ (جلد ۵۶، شمارہ ۴)، لاہور، اپریل ۲۰۱۹ء

سیارہ ڈائجسٹ (جلد ۵۶، شمارہ ۶)، لاہور، جون ۲۰۱۹ء

سیارہ ڈائجسٹ (جلد ۵۶، شمارہ ۷)، لاہور، جولائی ۲۰۱۹ء

سیارہ ڈائجسٹ (جلد ۵۶، شمارہ ۹)، لاہور، ستمبر ۲۰۱۹ء

ثانوی ماخذ

ابو اللیث صدیقی، ڈاکٹر، آج کا اُردو ادب، قمر کتاب گھر، کراچی ۱۹۸۲ء

ارتضیٰ کریم، اظہار عثمانی، اردو میں پاپولر لٹریچر کی روایت اور اہمیت، اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۰۷ء، ۲۰۱۵ء

اسلوب احمد انصاری، پروفیسر، ادب اور تنقید، نیشنل آرٹ پرنٹر، الہ آباد، بار اوّل ۱۹۶۸ء

انور سدید، ڈاکٹر، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ (ابتدا تا ۱۹۸۸ء)، اکادمی ادبیات پاکستان، جنوری ۱۹۸۸ء

تنویر الرحمٰن (مرتب)، ناصر کاظمی کا شہر (غزل)، اسلامک بک سنٹر، لاہور، اگست ۲۰۱۰ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر تنقید اور تجربہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۹ء
جمیل جالبی، ڈاکٹر، پروفیسر، ایلیٹ کے مضامین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، انڈیا، ۱۹۷۸ء
حسن وقار، ڈاکٹر، اُردو سوانح نگاری آزادی کے بعد، شعبہ اُردو کراچی یونیورسٹی، کراچی ۱۹۹۷ء
حمیرا اشفاق، ڈاکٹر، اُردو اور فرانسیسی ادب کے باہمی روابط، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء
راجندر سنگھ بیدی، دانہ و دام (افسانے)، نیا ادارہ، لاہور، ۱۵/ جون ۱۹۴۳ء
رضی عابدی، مغربی ڈرامہ اور جدید ادبی تحریکیں، ادارہ تالیف و ترجمہ، جامعہ پنجاب، لاہور، جون ۱۹۸۷ء
رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، مکاتیب ڈاکٹر محمد حمید اللہ بنام محمد طفیل (پیرس)، قرطاس پبلی کیشنز، کراچی ۲۰۲۰ء
رفیع الزمان زبیری، ابنِ صفی شخصیت اور فن، مشمولہ ایکسپریس نیوز، جمعہ، ۲۹/ جون ۲۰۱۸ء
روشن آراء راؤ، ڈاکٹر، مجلاتی صحافت کے ادارتی مسائل، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۸۹ء
سعادت سعید، ڈاکٹر، راشد اور ثقافتی مغائرت، جی سی یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۰ء
سلام سندیلوی، ڈاکٹر، ادب کا تنقیدی مطالعہ، میری لائبریری، لاہور، ۱۹۶۴ء
سلطانہ بخش، ڈاکٹر، مرتبہ، اُردو میں اصولِ تحقیق، منتخب مقالات، اُردو اکیڈمی، لوئر مال، لاہور، ۲۰۱۲ء
سوزن بینٹ، ترجمہ وحید احمد، تقابلی ادب، ایک تنقیدی جائزہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء
سید عبد اللہ، ڈاکٹر، اشارات تنقید، چمن بک ڈپو، اُردو بازار، دہلی، س ن
شارب ردولوی، ڈاکٹر، جدید اُردو تنقید، اصول و نظریات، اُتر پردیش اُردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۷ء
عبد اللہ حسین، بحوالہ، انور سدید، ڈاکٹر، ادب کہانی، یونس پرنس، لاہور، ۱۹۹۶ء
غفور قاسم شاہ، پاکستانی ادب، معراج دین پرنٹرز، لاہور، ۱۹۹۵ء
فریدہ نذیر، پروفیسر، قدرت اللہ شہاب، زندگی اور ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۲ء
فسانہ عجائب، مرتبہ رشید حسن خاں، اُردو گھر، نئی دہلی، طبع دوم، ۱۹۹۶ء
قدرت اللہ شہاب، آپ بیتی کے توانا لہجے، ستلج پبلی کیشنز، بہاول پور، ۲۰۰۴ء
قرۃ العین حیدر، شیشے کے گھر، مکتبہ جدید لاہور، اکتوبر ۱۹۶۹ء
محمد حسن، اَدبی سماجیات، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، انڈیا، باراوّل ۱۹۸۳ء
محمد حسین، ڈاکٹر، ناول کا فن اور نظریہ، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۲۰۰۲ء
محسن نقوی، ردائے خواب، ماورا پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۵ء

معین الرحمٰن، ڈاکٹر، انگریزی ناول کے زیر اثر اردو ناول کا آغاز، مشمولہ، دریافت، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، شمارہ جون ۲۰۰۲ء

منظر اعظمی، ڈاکٹر، اُردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصّہ، اترپردیش اُردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۹۶ء

نثار احمد قریشی، ڈاکٹر، ادب عالیہ، شعبہ اُردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۱ء

نجمہ رحمانی، اُردو افسانے کا سفر، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی ۲۰۱۵ء

نذر خلیق، ڈاکٹر، کچھ ہماری باتیں بھی، مشمولہ ماہ نامہ ابتہاج، راولپنڈی، فروری ۲۰۱۹ء

نگہت ریحانہ، ڈاکٹر، اُردو افسانہ، تکنیکی مطالعہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۸۴ء

وہاب اشرفی، پروفیسر، تاریخ ادبیاتِ عالم، پورب اکادمی، اسلام آباد، جون ۲۰۰۶ء

غیر مطبوعہ مقالہ جات

بشریٰ پروین، پاکستانی ناولوں کا موضوعاتی مطالعہ (۱۹۴۷ء تا ۲۰۰۰ء)، مقالہ برائے ایم۔فل اُردو (غیر مطبوعہ)، مملوکہ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء

عابد حسین، اُردو غزل پر بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رُجحانات کے اثرات، مقالہ برائے پی۔ایچ ڈی، (غیر مطبوعہ)، مملوکہ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء

انگریزی کتب

Ali Kamran Asdar, Pulp fictaion, Reading Pakistani Domesticity, Published DUke Univesity Press 2004

لغات

اُردو لغت، جلد اوّل، ترقی اردو بورڈ، کراچی ۱۹۸۷ء

احمد دہلوی، سید، مولوی، فرہنگ آصفیہ، جلد سوم، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۲ء

اشرف ندیم، جدید اُردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء

الحاج فیروز الدین، مولوی، فیروز اللغات اُردو جامع، فیروز سنز، لمیٹیڈ، لاہور ۱۹۸۷ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی اُردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء
رفیق خاور، اُردو تھیسارس، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، دسمبر ۱۹۹۳ء، ص ۴۰۶-۴۰۷
رؤف پاریکھ، ڈاکٹر، اوکسفرڈ اُردو انگریزی لغت، اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۲۰۱۳ء
شان الحق حقی، فرہنگ تلفظ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء
محمد اسحاق جلالپوری / تاج محمد، مرتبہ، درسی اُردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء
محمد عبداللہ خویشگی، فرہنگ عامرہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء
وارث سرہندی، علمی اُردو لغت، علمی کتاب خانہ، لاہور، ۱۹۹۶ء

رسائل و جرائد / اخبارات

ابرار مجیب، ادب نامہ، روزنامہ دنیا، (ادبی ایڈیشن)، اسلام آباد، منگل ۲۹ / جون ۲۰۲۱ء
اخبار اردو، ماہنامہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، س ن
خورشید ندیم، ہمارے الطاف صاحب (کالم)، روزنامہ دنیا، لاہور، ۳۔ جنوری ۲۰۱۹ء
قومی زبان، انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی، جلد ۹۳، شمارہ ۶، جون ۲۰۲۱ء
کتاب نما، ماہنامہ، جامعہ دہلی، جون ۱۹۹۷ء
مجیب الرحمن شامی، الطاف صحافت (کالم)، روزنامہ دنیا، لاہور ۳۰۔ دسمبر ۲۰۱۸ء

ویب گاہیں

https://sohnidigest.com/romantic-urdu-novels/barda/
https://www.definitions.net/definition/pulp+fiction
https://www.google.com.pk/search?q=
https://www.google.com/url?sa=t&source=web
https://www.meaningguru.com/en-ur/pulp
http://urdudigest.pk/
https://www.vintagelibrary.com/pulpfiction/introduction/What-Is-Pulp-Fiction.php
https://english.stackexchange.com/questions/23

a-phrase-to-describe-the-idea-of-high-literature/8179
https://www.google.com/amp/s/dictionary.cambridge.org/amp/english/pulp-fiction

ضمیمہ جات

ماہنامہ ''اُردو ڈائجسٹ کے شماروں کا عکس

ماہنامہ ”حکایت“ کے شماروں کا عکس

ماہنامہ ”سیارہ ڈائجسٹ“ کے شماروں کا عکس